

حاصل گھاٹ

ہجرت کرنے والوں کے نام

بائنوقدسیہ

ہمارا نو ساختہ گھر پہلی منزل پر ہے۔ گیراج سے نکلنے ہی لاش لاش چمکتی پکی سڑک ہے۔ یہ سڑک سرکاری نہیں۔ اس ایریا کی ہاؤسنگ نے اسے تعمیر کیا ہے، لیکن اپنی پختگی، صفائی، ستھرائی میں یہ کسی بھی ہائی سے کمات کرتی ہے۔ امریکہ کا عمومی معجزہ چیز سڑکیں اور سپر مارکیٹ ہیں۔ یہاں یو پر جیسے میوزیم، گر جا گھر اور ثقافتی عجائب گھر اپنی جغرافیائی شکل میں نہیں ہے۔ امریکہ نیا نیا، سادہ اور نو جوان ہے، امریکن نو دریافت براعظم سے اٹھ اٹھ کر جب یورپ کی پر شکوہ تہزیبوں سے بسی ہوئی پرانی بستیوں کو اپنی پھسلتی ٹوپی سنبھالتے ہوئے گردن اٹھا کر دیکھتے تھے تو بے مہر اطالوی فرانسیسی، جرمن باسندے انہیں لکڑیوں کی طرح ہچ اور نو دو لے سمجھ کر درخوار اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ پرانی تہذیبوں کے ٹھیکے دار لمبے تڑنگے، ڈھیلے ڈھالے ان فصیلی بیٹروں کو ابرو اٹھا کر دیکھنے کے عادی تھے پتہ نہیں کس وقت خدا نے ان کا بدلہ لینے کی ٹھانی نام دھرم نے والوں کو علم نہیں ہوتا کہ وقت کسی کو معاف نہیں کرتا پھر انہی اونچے شملے والوں کو اسی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا پڑتا ہے جہاں گردن اکڑائے فوف فوف کرتے وہ گزرتے جایا کرتے تھے، اب امریکن یونیوسٹیوں، بازاروں، دفاتر، غرضیکہ سارے شعبہ ہائے دارورسن میں تارکین وطن کا ایک ریٹانہ رہا ہے۔ چینی، ہندوستانی، جاپانی، پاکستانی، عربی، حتیٰ کہ یورپی جو مدتوں اپنی شناخت پر نازاں رہے، اپنے آبائی لباس چھوڑ کر جینز بنیان میں ملبوس امریکنوں کے نقال بننے میں فخر محسوس کر رہے تھے۔

میرے گھر والے بھہ، مور پنکھ لگا کر ہنس کی چال چلنے میں برتری محسوس کر رہے تھے اور گویا پتسمہ لے کر نو امریکن ہو گئے تھے۔ میں اپنی بیٹی کے گھر اس لئے اجنبی سا لگا پھرتا تھا کہ یہاں پاکستانی ہونا ہی سب سے بڑا قصور ہے اور جو نالائقی امریکن میں ہے

وہ "Its but human" کے ذیل آتی ہے۔

میری بیٹی سنگل فیملی گھر میں رہتی ہے۔ اس کے سامنے سڑک پار کرتے ہی ایک تین منزلہ محلی جلد والی بلڈنگ ہے، جس میں تین منزلہ اپارٹمنٹس ہیں۔ سارے مکان ایک وضع کے بنے ہوئے ہیں۔ جب میں گیراج کے اوپر بنی بیلکونی میں بیٹھ کر سڑک پار دیکھتا ہوں تو عموماً میری نظر سامنے والے اپارٹمنٹوں پر پڑتی ہے دوسری منزل جس مکان میں بیلکونی کے ساتھ تھوڑی سی کھلی جگہ میں جرنیم کے گیلے پڑے ہیں، وہاں ایک گریک گھرانہ رہتا ہے۔ یونانی فلسفہ اور تھیٹر کی روایت سے بچھڑے ہوئے یہ لوگ علامہ بیلکونی پر آ کر سگریٹ پیتے ہیں۔ بیٹا ٹرک چلاتا ہے۔ اتنا بڑا ٹرک جس میں پورا اپارٹمنٹ سما جائے اس کی امریکن بیوی شہر سے دور کسی فیکٹری میں کام کرتی ہے کیونکہ صبح چار بجے اس کی ٹھنڈی فوکس کو بار بار کلچ دبا کر گرم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں بیلکونی میں بیٹھا بوڑھے گریک کو دیکھتا ہوں۔ وہ بھی کبھی کبھی ہاتھ ہلا کر مجھے وش کر دیتا ہے مجھے کس زبان میں سلام کرتا ہے، میں نہیں جانتا اسی لئے انٹرنیشنل ازارہ ہی سلامتی برادر بنتا ہے۔ ویسے بھی اب انٹرنیشنل طریقہ سلام میں لفظ اہم نہیں رہے..... ہاتھ اٹھا کر صبح بخیر کا اشارہ ہی بہت ہے۔ امریکہ میں سلام کرنے کا رواج عام ہے۔ جنگلوں میں، راستوں پر، بازاروں میں لوگ ایک دوسرے کو ہائے کہہ کر صبح بخیر، شام بخیر کہنے کے عادی ہیں..... ہلکی سی مسکراہٹ اور..... انسان کی انسان شناسی اور خدا حافظ..... بوڑھا یونانی سانولی رنگت کا مالک ہے۔ اس کا سر قریباً گنجا ہے اور کان سے کان تک گردن سفید بالوں کی جھال رہے۔ وہ دنیا کو قانونی عطا کرنے والوں سے نکل کر یونان کو چھوڑ کر امریکی قانون پرست ہو چکا ہے۔ ہاؤسنگ والوں کا حکم ہے کہ کوئی مکین گھر کے اندر سگریٹ نہیں پی سکتا کیونکہ لکڑی کے گھروں میں آغ کی واردات عموماً چپکے سے ہو جاتی ہے۔ اسی لئے یہ بہو، بیٹا باپ سب جرنیم والی بیلکونی پر کل کر سگریٹ پیتے ہیں۔ چونکہ گرمیوں کا موسم ہے، اس لئے یونانی بر موڈ انیکر پہنے رکھتا ہے۔ اس کے گھٹنوں کو اسی لیے میں دیکھ سکتا۔ ایسی نیکر کا بر موڈ انیکر

نام نہ جانے کیوں رکھا گیا۔ کیا اس کا تعلق برموڈا تکون سے ہے؟

اس سائنسی دور میں بھی انسان اسرار سے محبت کرتا ہے۔ ان دیکھی ان چاہی ان سمجھی منزلیں اسے کھنچتی ہیں۔ ایک مدت سے برموڈا تکون بھی ایک الجھن ایل پھیلی بنی ہوئی ہے۔ اٹلانٹک میں برموڈا، میامی، فلوریڈا، سان جوآن، یورٹوریکو کے درمیان ہے، اس علاقے میں ان گنت ہوئی اور بحری جہاز راستہ بھولے، غرقاب ہوئے ان کی پر اسرار گمشدگی سے متاثر ہو کر بے شمار لوگوں نے اس پر ریسرچ کی۔ قریباً 2000 کشتیاں یہاں راستی بھولیں اور زیر آب ڈوب گئیں۔ سنتے ہیں سن 1991ء میں ہالووین رات تھی، جو ورڈی پائیلٹ Talla Hasse کی جانب جہاز لے جا رہا تھا کہ برموڈا تکون میں پھنس گیا یکدم اس کی آواز بگڑ گئی۔ وہ خوفزدہ ہو کر رطب و یابس بکنے لگا۔۔۔۔۔ ”نومبر کی دوسری تاریخ..... چاروہسکی جولیٹ میں..... ہٹاؤ دو پانچ تین..... زیرو زیرو..... اور پر چڑھنے کی درخواست دو مرتبہ نو صفر..... اور..... اور.....“ آواز ختم..... جہاز غائب..... کنٹرول روم دم بخود..... اسرار آج تک لائنجل..... ہالووین کی پر اسرار رات..... سن 1991ء کا سال۔

واقعات کے تواتر کے باعث سائنس دان اسرار معلوم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس تکون میں دارصل شمالی اور مقناطیسی شمال میں بنیادی فرق ہے۔ اسی بیس ڈگری کے فرق کے باعث حادثات ہوتے ہیں۔ دنیا کا مقناطیسی شمال نارتھ پول سے 1500 میل دور ہے۔ اس بات کا دھیان جب نہیں کیا جاتا تو بحری اور ہوائی جہاز شمالی پہنچنے کی بجائے پرنس آف ویلز کے جزیرے پر پہنچ سکتے ہیں اور اسی غلطی کے باعث برموڈا تکون حادثاتی کہانیوں کی دیو مالا بن گیا ہے۔ ساحلی گارڈوں نے اس اسرار میں کئی قسم کے اضافے کئے ہیں۔ کچھ سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان حادثات کی بنیادی وجہ Static بجلی ہے..... متحس

لوگ خود جا کر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ سر پھرے کہانی گھڑنے کے شوق میں پہنچ جاتے ہیں۔ اخباری دنیا ویسے ہی خبر بنانے کی خاطر اس ابلیسی تکنوں میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔

ایک بات طے ہے کہ انسان تحقیق کے باوجود ابھی تک یہاں کے اسرار کو جان نہیں پایا۔ اس 1,50,00 مربع میل کے علاقے، سے متعلق ان گنت کہانیاں گھومتی پھرتی ہیں۔ کچھ دیو مالائی، کچھ من گھڑت یہ انسانی ذہن کا تضاد و صف ہے کہ وہ ہمیشہ حقیقت سے خیال اور خیال سے حقیقت کی طرف سفر کرتا ہی رہتا ہے۔ اسے تحقیق اور خواب سے برابر کی محبت ہے اور وہ ان دونوں کے درمیاں جھولے کی مانند آتا جاتا ہے۔ جسم ہمیں اندر کی جانب دھکیلتا ہے اور روح کی وسعت سمٹ سمٹا کر ہمیں باہر کی جانب دھکیل دیتی ہے۔ انسان کے اندر بھی ایک بڑا موڈا تکنوں ہے جس میں اس کے جہاز کشتیاں غرق ہو جاتی ہے اور پھر ساری زندگی ان غرقاب جہازوں کے لئے Rescue Parties بھیجتا رہتا ہے کبھی سائنس تحقیقی تاویلین دیتا ہے، کبھی بھید بھاؤ کے اتر دریافت کرنے میں گزرتا ہے کسی مقام، وقت اور حالات میں اس کے اندر باہر ظمانیت کی نرم ہوا نہیں چلتی تا آنکہ اوپر سے فضل نہ ہو جائے۔

”اباجی.....“

”جی بیٹا.....“

”ہم ایک دن Left Overs کھاتے ہیں اور سنڈے کو میں کوکنگ کرتی ہوں اور سارے ہفتے کی dishes تیار کر کے فریژر میں رکھ دیتی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ ماسنڈ نہیں کریں گے۔ دیکھئے ناں مجھے بھی کام پر جانا ہوتا ہے۔ آپ فریژر میں سے کچھ نہ نکالیں اور جو کچھ فریژر میں رکھا ہوا ہے، آپ مائیکرو ویو اوون میں ڈال کر گرم کر لیں۔ ہم ڈسپلن سے Organize ہو کر زندگی گزارتے ہیں

..... افسوس میں آپ کی ویسی خدمت نہیں کر سکتی جیسی پاکستان میں کرتی تھی، لیکن امید ہے آپ یہاں کے طریقے سیکھ جائیں گے۔“ ارجمند کے لہجے میں وضاحت ہے۔ جیسے وہ

کسی سیمینار سے مخاطب ہو۔

”بالکل بالکل میں سمجھ گیا ہوں۔ یہاں کی زندگی اور ہے، وہاں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔“

”اباجی دیکھئے نا وہاں سارا گھریلو نظام ملازموں کے سہارے چلتا ہے۔ پھر عورتیں گھر پر ہوتی ہیں۔ تازہ پھلکا روٹی مل سکتی ہے۔ یہاں تو پیتا بریڈ سے ہی کال چلانا پڑتا ہے.....“

”بالکل بالکل..... میری فکر نہ کرو..... میں بالکل ٹھیک تھا کہ ہوں۔“

”خیر جی Worry تو ہوتی ہی ہے اباجی۔ آپ کے دانت بھی خراب ہیں۔ میں آپ کے لئے کسی قسم کی بریڈ لائی ہوں، لیکن پھلکا پراٹھا نہیں پک سکتا پراٹھے تو شاید پکا کر رکھا جاسکتا ہے، لیکن روٹی خشک ہو جاتی ہے.... آپ لیٹ جائیں تھوڑی دیر کے لیے۔“

”نہیں ٹھیک ہے.....“

”کوئی فلم لگا دوں؟..... ٹی وی پر... وہ سی آر والی“

”نہیں نہیں تم میری فکر نہ کرو ارجمند.... میں وہاں بھی اکیلا تنہا تھا۔ مجھے تنہا رہنے میں وقت پیش نہیں آتی“

”کوئی چیز درکار ہو مارکیٹ سے؟..... میں آگ گروسر کرنے جاؤں گی کام کے بعد.....“

”مجھے کچھ نہیں چاہئے ارجمند“

”جیشید اور قیصر سکول بس سے آتے ہیں۔ وہ بل دیں گے تو دروازہ کھول دیجئے“

مجھے پوچھنا تو نہیں چاہئے تھا، لیکن میرے منہ سے نکلا ”بھائی جب میں نہیں تھا تو پھر بچے کیسے گھر میں داخل ہوتے ہیں....“

”ان دونوں کے پاس اپنی اپنی چابی ہے ابا جی....“ ارجمند ہنستے ہوئے بولی ”دونوں بڑے Independent ہیں۔ اگر کوئی ایمر جنسی ہو جائے تو ساتھ والے گھر میں ڈور تھی رہتی ہے وہ رات کو ڈیوٹی پر جاتی ہے۔ دن کو گھر پر ہی ہوتی ہے۔ بچے اس سے ہلپ لے لیتے ہیں۔ اگر کبھی وہ بھی گھر پر نہ ہو تو Alone Hotline Home کا نمبر دے رکھا ہے کئی Grandmas--Grandpas والنیز بھی تین سے لیکر چھ بجے تک فون پر مل جاتے ہیں۔ بچوں کو کوئی دقت پیش نہیں“

”پھر بھی ارجمند..... بچے تو آخر بچے ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں ابا جی۔ وہ آپ کو بالکل نہیں ستائیں دے وہ Sefi Sufficient ہیں۔ فرنگ سے نکال کر کھالیں دے۔ ویسے قیصر تو دودھ اور چس کچھ نہیں کھاتا..... ابھی مونٹسوری میں ہی تو جاتا ہے“

”ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ میں یہاں دخل اندازی اور مشورے دینے کے لئے نہیں آیا....“

”اچھا ہے ابا جی..... آپ کا چینج ہو جائے گا۔ روٹین سے بریک مل جائے گی۔ ایک ہی جگہ رہ رہ کر آدمی بور جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ہمت کی.... اور میرے پاس آگئے.... میرے مان لی۔“

میں ارجمند کو بتا نہ سکا کہ مجھے نہ تو تبدیلی کی ضرورت تھی نہ ہی میں روٹین کو توڑنے کے لئے اس کے پاس آیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں کیوں ایک خوف تھا، ایک تشویش تھی کہ شاید ارجمند سات سمند پار ایک نئے معاشرے میں لب سینے دبی دبی، گھٹن بھری زندگی بسر کر رہی ہو۔ میں اپنی آنکھوں سے اپنے حساب کے مطابق اس کے ماہ و سال

کا اندازہ لگانا چاہتا تھا.... باپ کی بھی عجب مصیبت تھی۔ وہ بیٹی سے کٹ کر بھی علیحدہ نہیں ہو پاتا اور بیٹے کے ساتھ رہ کر بھی اسے مل نہیں پاتا۔

امریکہ پہنچ کر کسی نو اور دنے پڑتا لگایا کہ کسی ملک میں نو شہری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ سے زیادہ سوال نہ پوچھے جائیں، ورنہ لوگ آپ کو انجان سمجھ کر کمتر جانیں گے۔ لوگوں کو اشیاء کی طرح سمجھیں، استعمال کریں اور پھر آزاد چھوڑ دیں۔ درد دل اے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ اپنے آبائی وطن کو پہلی بیوی کی مانند کہیں اندائنت کر رکھیں، لیکن اس کی خوبیوں خرابیوں کا قطعاً ذکر نہ کریں۔ پتہ نہیں سننے والے پر اس ذکر کا کیا اثر ہو..... ایک ہی شخص کو دو مرتبہ دھوکا نہ دیں۔ آپ کے وطن کی شہرت کا سوال ہے..... پس ماندہ ترقی پذیر ملکوں کے نادار لوگوں کی مدد کرنے والے اداروں کو چندہ نہ دیں۔ نہ جانے ان کے پیچھے سیاسی کٹھ جوڑ کیا ہو.... ہمیشہ ایسی تحریکوں میں شامل ہوں جو گلہریوں، Flamingoes اور Skunks کے لئے پریشان ہیں۔ وائلڈ لائف میں دلچسپی لینے سے انسان زیادہ کلچر ڈبلر اور انسان دوست شمار ہوتا ہے۔

یہ انفرمیشن مجھے ایک مقامی رسالے سے ملی تھی۔ ایسے اخبار رسالے سیروں کے حساب سے مغربی ممالک میں چھپتے ہیں۔ ان میں سیکنڈ ہینڈ قسم کی گوسپ، مشورے اور خبریں ہوتی ہیں۔ پہلے میں یہ تھے اٹھا کر اندر لے آتا تھا اور ہیلکونی میں بیٹھ کر وقت بے وقت پڑھتا رہتا تھا، لیکن اب ارجمند نے مجھے منع کر دیا ہے۔

”ابو یہ اخبار اندر کون لایا.... رومی انفرمیشن!“

میں اب یہ اخبار رسالے گھر کے پچھواڑے چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر پڑھتا ہوں اور تقابلی سوچوں میں ڈولتا رہتا ہوں۔

جب میں گیراج کے اوپر ہیلکونی میں بیٹھ کر دیکھتا ہوں تو سامنے والے اپارٹمنٹسکی بلڈنگ کے ساتھ مجھے ایک ننھا منا سا باغ نظر آتا ہے۔ اس میں چھوٹا سا سلائیڈ

ہے، دو تین جھولے ہیں۔ ایک جنگل جم ہے جو کافی خطرناک کھیل ہے۔ لوہے کی اس بھول بھلیوں میں بچے اٹے لٹک کر اپنی گردن تڑوا سکتے ہیں۔ اس پارک میں امریکن بچے عموماً اکیلے آتے ہیں۔ خود اعتماد بچوں کے ساتھ کوئی نرس، آیا ماں یا دادا نہیں ہوتا، لیکن کالے، امریکن، ہندوستانی، پاکستانی اور دوسرے تارکین اپنے بچوں کے ساتھ کسی نہ کسی بڑے کو ضرور بھیجتے ہیں۔ میری گوری پیٹھ ارجمند اور اس کا دبلا پتلا لمبا ڈاکٹر میاں اپنے آپ کو ایشیائی نہیں سمجھتے۔ جس طرح ترک نژاد اپنے آپ کو یورپ کا حصہ بنانے پر یقین ہیں، ایسے میری بیٹی اور ڈاکٹر داماد مصر ہیں کہ امریکن سیٹرن ہو جانے کے بعد اب ان پر امریکی مہر چکی ہو گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ امریکہ تو بنیادی طور پر تارکین ہی کا وطن ہے، اس لیے وہ بے وطن نہیں ہیں۔ وہ بھی قیصر اور جمشید کو اکیلے ہی باغ میں بھیج دیتے ہیں۔ میں جب سے آیا ہوں، نہ جانے کس خوف کے تحت میں بھی کھسکتا کھساتا ان کے پیچھے پہنچ جاتا ہوں حالانکہ انہیں میری ضرورت نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں یہ احساس کمتری ہے کہ احساس تحفظ!

باغ میں جمشید اور قیصر کو میری قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ Slides اور جھولے بڑی آزادی اور خوش اعتمادی سے استعمال کرتے ہیں۔ اگر کبھی گر جائیں تو ریں ریں روں روں کر کے روتے نہیں دیکھا۔ وہ آپس میں ایک جملہ بول کر معاملی درست کر لیتے ہیں۔ "Be a Man"۔ "Don't be Sissy"۔ "Brave"۔ "Man" میں بیچ پر بیٹھ کر چوری چوری ان کی نگرانی بھی کرتا ہوں اور سوچتا بھی رہتا ہوں کہ ایک بہادر آدمی کو ایک Bully بننے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

1971ء میں جب روس نے اشتراکی نظام حکومت اپنایا اور دنیا میں دو بہادر سپر پاورز کا وجود ابھرنے لگا تو جلد ہی دنیا نے دیکھا کہ ساری دنیا کو ان دو بہادر روں نے

بندربانٹ کے فلسفے کے تحت، اپنے اپنے لیے مارکیٹ تلاش کرنے کے سلسلے میں اپنی حاکمیت جتانے کی خاطر تھرڈ ورلڈ کی اعانت شروع کر دی.... امریکہ اور روس کی دیکھا دیکھی یورپ اور انگلستان بھی اس دوڑ میں کود پڑے۔ اب تھرڈ ورلڈ میں اسلحہ، دوائیں، ناکارہ اور کارآمد ٹیکنالوجی کے بازرگ گئے۔ ابھی ترقی یافتہ ممالک Sick Industries کے تصور سے نا آشنا تھے۔ اسی لیے رفتہ رفتہ اپنے دباؤ اور بہادری کے ذریعے ساری دنیا Zone میں بٹ گئی۔ اب کچھ امریکہ کے پیڑھے تھے اور کچھ روس کے لوٹے۔

لیکن 1991ء میں جب روس کے اقتدار کے پر نچے اڑے اور دنیا میں ایک ہی سپر پاور رہ گئی.... تو ایک اور آدری تحریک فیل ہو گئی... حالات کچھ اور کے اور ہو گئے۔ اب امریکہ اور بھی بہادر، بولڈ اور دہشت پسند ہو گیا۔ وہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر سے دنیا کے ممالک کے دھمکانے، ڈرانے اور پچکارنے میں کامیاب ہونے لگا.... لیکن اندر ہی اندر اسے ایک طاقت کا خوف تھا.... روس کی آدری تحریک دم توڑ گئی، لیکن اسلام کی طاقت اندر ہی اندر امریکہ کو کہیں سہا رہی تھی.... اگر تمام مسلمان حکومتیں کسی طور پر یکجا ہو جائیں، پھر یہ اتنی لمبی چوڑی Belt کو توڑنا یا سنبھالنا اس کے لئے مشکل ہوتا۔ لکڑی کا یہ گھٹا توڑنا اس کے لئے ممکن نہ ہوتا، لیکن امریکہ کے بہادر جیالوں نے ہر مسلمان مملکت کے لئے الگ پلان بنایا۔ ایران اور عراق کی جنگ میں دو مسلم طاقتوں کو آپس میں لڑا کر دونوں طاقتوں کو کمزور کر دیا۔ ان طاقتوں کے دانت کھٹے کرنے کے بعد سعودی عرب کو یقین دلایا کہ اب عراق ان کی سلیت کو دھچکا لگانے والا ہے۔ اس کے لیے کویت کی حکومت کو ایکشن پراکسایا اور خود سعودی عرب میں اپنے جنگی سوائل لے کر ایسے پیڑھے رہا کہ ہلانا مشکل۔ سوڈان کو دہشت گرد بنا کر خانہ جنگی اس پر مسلط کر کے اسے تباہ کر دیا۔ پاکستان کو حکومتوں میں باہمی تنازعوں کو فروغ دے کر بد نظمی اور بد نظامی میں مبتلا کر کے دو لخت کر دیا۔ ترکی کو یورپ کی منڈی کا حصہ

اس لئے بننے نہ دیا کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر امرکہ کے آگے کا سہ گیر رہے اور امریکہ کے لئے جاسوسی کرتا رہا۔ الجزائر میں ڈیموکریسی کا پتا پھینکا اور جب دیکھا فنڈا منفلٹ کامیاب ہو گئے ہیں تو یہاں فوجی راج قائم کر دیا۔ افغانستان کو روس کی آدرشی تحریک ختم کرنے کے لئے استعمال کیا اور بعد ازاں احسان فراموشی کا ثبوت دیا۔ بوسنیا کو سر بیا اور کروٹیز کے آگے پھینکا اور کچھ کرنے جوگا نہ چھوڑا۔

روس کی شکست کے بعد امریکہ نے مسلمان ملکوں میں اپنے اسلحہ کے مارکیٹ قائم کیے۔ وہ ترقی پذیر ملکوں کو ایسا بیچتا جو زیادہ Sophisticated نہ تھا۔ بہادر امریکہ کو علم تھا کہ جب کسی ملک میں اسلحہ ہوتا ہے تو وہ استعمال میں ضرور آتا ہے۔ پھر ہر مظلوم اسی اسلحہ کے ہاتھوں کبھی کبھی ظالم بھی بن جاتا ہے، دین دار گروہ تک اپنی حفاظت کے لئے اسی اسلحہ کا سہارا لیتے ہیں۔ سیاسی

جماعتیں اپنی مضبوطی اسی اسلحے سے قائم کرتی ہیں.... کمزور کو ان ہی ہتھیاروں سے طاقت ملتی ہے۔ پھر اسی اسلحے کی برکت سے شہروں میں وارداتیں ہونے لگتی ہیں۔ گروہی اجتماعی جھڑے فروغ پاتے ہیں۔ ڈاکو اٹھائی گیرے، دہشت گرد اسی اسلحے کی بنا پر زیادہ جی داری کے مظاہرے کرتے ہی۔ ٹرینوں میں بم پھلتے ہیں۔ کاریں چرائی جاتی ہیں، ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ ان تمام وارداتوں کی تفصیل سپر پاور کے کارندے فتح مندی کے ساتھ اپنے مالکان تک پہنچاتے ہیں.... ایسے ملکوں میں میر جعفر جیسے شخص تلاش کرنا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ شک و خوف سے لرزاں شہریوں کو دو نظریوں، دو پارٹیوں میں تقسیم کرنا بھی مشکل نہیں..... مسلمان ملکوں کو کسی وقت بھی کوئی میر جعفر اپنی حرص کے باعث اسلحے کی فراہمی کے ہاتھوں خانہ جنگی میں ڈبو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کسی وقت میرا ساتھ نہیں چھوڑتی اور میں اس سلسلے میں کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ تب ہی ساندہ کلاں میں رہتے تھے۔

کرشن نگر سے آگے متوسط لوگوں کی بستی تھی۔ یہاں کے گھر کچے، صحن گھر کے اندر

اور گھروں میں بسنے والے نچلے درمیانی انکم کے لوگ تھے۔ ان لوگوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ حیا دار تھے۔ اپنے آپ کو قسم کی حد تک شریف سمجھتے اور دوسروں کی نظروں میں شریف رہنے کے لئے بڑے جتن کرتے، بڑی بڑی قربانیاں دے کر بھی اپنا Image برقرار رکھتے۔ قرضے لینے اور دینے سے گھبراتے۔ بچوں کو گلیوں میں کھیلنے سے منع کرتے اور عورتوں کو چادر یا برقعے میں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے، ہر وقت ناک کی سیدھ چلنے میں لگے رہتے۔ ابا نے بھی قیام پاکستان کے بعد ایسے ہی ایک گھر کو پنیتیس روپے ماہوار کرائے پر لے رکھا تھا۔ ابا سیکرٹریٹ میں ملازم تھا اور کلرک ہونے کے ناطے اس کی ذہنیت میں مے ن میخ نکالنے کی عادت تھی۔ جس طرح کلرک کو روبنز کا علم ہوتا ہے، ایسے کسی افسر کو اپنی طقت اور نا طاقت کی حدود کا علم نہیں ہوتا۔ کلرک ہی افسر کو صاحب بہادر بناتا ہے، وہی اسے من مانا سکھاتا ہے اور وہی اس کا انفنری فورس بھی ہوا کرتا ہے۔ افسر کی ساری جان اسی کلرک کی مٹھی میں ہوتی ہے۔ پی اے اور کلرک کے سامنے افسر کی نجی اور سرکاری زندگی کے کئی ایسے صفحے موجود ہوتے ہیں جنہیں Confidential کہا جاتا ہے۔

ابا گھر میں گھتے ہی کلرک نہ رہتا۔ وہ سیکریٹری ایجوکیشن بن جاتا جس کے سامنے کھڑے ہو کر آبا خود Dictation لیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ ہم پانچوں بھائی بہن ابا کو دیکھ کر پرندوں کی طرح اڑ چھو ہو جاتے۔ بڑے بھائی شاہد البتہ ابا جی نہ دبتے تھے۔ رفعت آپا اور شاہد بھائی کی اپنی Category تھی۔ وہ دونوں ڈارکل اور نینٹل نہیں تھے، لیکن غائب وہ بھی ہو جاتے لیکن بڑے رعب سے۔

تب شاہد بھائی فارتھ ایئر میں پڑھتے تھے۔ ابا کے لئے سیکریٹریٹ دور نہ تھا تو شاہد بھائی کا ایم اے او کالج بھی قریب ہی تھا، لیکن شاہد بھائی اپنی نواینت آزادی میں سرشار تھے۔ وہ اپنے بھانویں شاعر بن رہے تھے کالج کی سرگرمیاں تو انہیں گھر سے

دور لے جاتی ہی تھیں۔ اوپر سے رات کو کافی ہاؤس کی نشستیں بھی انہیں گھر سے غائب رکھتی تھیں۔ ابا کو جلد سونے کی عادت تھی اسی لیے ان کا ٹا کر شاید بھائی سے نہ ہوتا۔ امام چولہے کے پاس بیٹھ کر شاید بھائی کا انتظار کرتی رہتیں۔ ان کے نزدیک محبت میں تکلیفیں سہنا، ایثار کرنا اور دوسرے کے آرام راحت کی خاطر اپنی عذات کو تلف کرنا دلیل محبت تھی، شاید بھائی کے لیے وہ اس طرح کنڈی کھولتیں کہ ذرا سا شور بھی نہ ہوتا، چپاتی یوں پکائی جاتی کہ رتی بھر کھڑا ک نہ گونجتا۔ پھر اماں ستر پوش اتنی زیادہ تھیں کہ اب تک یہ رپورٹ کبھی نہ پہنچی کہ رات شاید دیر سے آیا.... اس محبت نے شاید بھائی کو بے باک کر دیا۔ انہیں وقت بے وقت کج راہ ہونے پر آمادہ کیا۔ اس بات کا اماں کو نہ احساس تھا نہ ادراک، وہ تو بس اپنی توڑ نبھانے کی فکر میں تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی سے کوئی توقع نہ رکھی..... نہ اپنے بچوں، نہ اپنے شوہر نہ اپنے کسی عزیز رشتہ دار سے..... وہ صرف اپنا لیکھ صاف رکھتی تھیں۔ ماں نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا، نہ اپنے آپ سے نہ کسی اور سے۔

جب انسان محدود خواہشوں اور ضرورتوں کا پابند ہوتا اسے زیادہ جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، لیکن جب کبھی اسے گھر کے خرچ سے کچھ پیسے نکال کر شاید بھائی کو دینے پڑتے تو وہ اس کا ذکر نہ اپنے آپ سے کرتیں، نہ ابا جی سے..... اور جھوٹ کے اس واحد کنوئیں میں گر جاتیں۔ اس گھٹتی لڑائی سے پسپا ہو کر کبھی کبھی وہ اونچے اونچے استغفار پڑھنے لگتیں اور اپنے آپ کو مادی مجرم اور کناہی سمجھنے پر مجبور ہوتیں، اماں کی اسی بے جان، ناتواں محبت نے شاید بھائی کو گرد ایسا حصار باندھ رکھا تھا جس سے نکل کر وہ کبھی دور نہ جاسکے۔ جس طرح مہارانی سیتا کی کنیا کے باہر مہاراجہ رام چند نے ایک لکیر کھینچ دی تھی جس سے باہر نکلنے کا آڈرنہ تھا۔ ایسے ہی اماں کی سب انتظار یوں نے شاید بھائی کی شرع مزاجی کو پابند کر لیا تھا۔ وہ لمبی اڑانوں پر

جانے کی آرزو تو رکھتے تھے لیکن وہ کولمبس نہ بن سکے اور کسی نئی دنیا کا انکشاف ان کا مقدر نہ ہوسکا۔

افریقہ کی کھوسہ زبان میں جانوروں کے سینگوں کے لیے گیارہ مختلف لفظ ہیں۔ آگے جھکے ہوئے، پیچھے کی جانب باہر کو مڑے ہوئے، چھدرے، سخت، مڑکنے وغیرہ۔ جنگل کے باسی ان الفاظ کے بغیر جانوروں کو بیان نہیں کر سکتے۔ جس طرح ایک آرٹسٹ رنگوں کے ہر شیدول کے نئے لفظ سے واضح کرتا ہے۔ آج ترقی کے عہد میں بہت سے نئے الفاظ ایجاد کی تازگی کے ہمراہ درآئے ہیں۔ کمپیوٹر، فون، کریڈٹ کارڈ، سی ڈی، ٹیلی ویژن، امی میل، فیکس، میکرو اوون لیکن ان اشیاء کے درپردہ جو ابھنیں، بناوٹیں، نظریے، جواز پیدا ہو رہے ہیں اور زندگی میں نئی ایجادات، حالات کے باعث جو دھارا بہہ رہا ہے۔ اس کی اصلاحات ابھی مکمل اور عام نہیں۔ افقی سوچ منہنی رویے، فوکس۔ ڈیزائن، ورلڈ آرڈر، ہیومن رائٹس، سسٹم، گڈ گورنس، ڈیموکریسی ڈیزائنر کپڑے ایسی بے شمار اصلاحات نئی ہیں۔ لیکن افسوس وہ اصطلاحات سوسائٹی سے غائب ہو رہی ہیں جو اماں کی انتظار یوں کو ظاہر کرتی تھیں.... زندگی کی رفتار تیز ہو جانے کے بعد اپنی من مانی کو شعار زندگی بنا کر محبت، گھائل بہادری، انتظار، ایثار، ممتا، سیاگ، حیا، وفا ایسے ہی الفاظ استعمال میں نہ ہونے کے باعث خوبیدہ الفاظ کی ذیل میں آنے لگے ہیں۔ طریق زندگی بدلنے کی وجہ سے یہ وہ معنی ظاہر نہیں کرتے جو کبھی استعمال میں تھے اور بامعنی بھی تھے۔

ہمارا گھرانہ گاؤں سے آیا تھا۔ اپنے ساتھ ہم گاؤں والوں کی خوش اعتمادی بھی لائے تھے۔ درختوں، کھیتوں، جنگلوں میں رہنے کے باعث پرندوں جانوروں کی ہم جنسیت کی وجہ سے گرائیں کا ذہن تروتازہ ہوتا ہے۔ وہ تجربے سے سیکھتا اور فوک

وزڈم پر پھروسہ کرتا ہے۔ اس میں وہی معصومیت، اکھڑپن، سادگی اور بے ساختگی بھی ہوتی ہے جو گاؤں والوں کے رسم و رواج اور لوک ریت میں نظر آتی ہے۔ کھیتوں میں گھومتے پھرتے دیہاتی تازہ سبزی، گنے، بیر، پیلو، کروندے غرضیکہ ہر تازہ چیز کو بہ آسانی منہ مار سکتا ہے۔ چونکہ کسان کی خوارک دودھ، وہی، مکھن، لسی، تازہ مغلے اور گڑشکر کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا توانا جسم جاندارا ذہنیت کو جنم دیتا ہے۔ وہ چلتے چلتے اکھان بناتا اور اندہ رکھتا ہے۔ پینڈو کی زندگی اس کے تجربے اور مشاہدے کیا ہوتا ہے جس کا وہ ذکر کرتا رہتا ہے۔ شہری انسان کا علم کتاب میڈیا اور سنی سنائی کا مرہون من ہوا کرتا ہے۔ کئی بار شہری کو اپنے شہر کا جغرافیائی نقشہ بھی معلوم نہیں ہوتا اور ان اشیاء کی واقفیت بھی نہیں رکھتا جن کا خرچ اس کی جیب پر بار ہوتا ہے لیکن وہ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے نہیں ٹلتا اور اپنے اکتسابی علم کی شنی بگھارنے سے باز نہیں آتا۔

پینڈو روزی کی خاطر شہر کا رخ کرے تو وہ اپنی ذہانت ساتھ لاتا ہے، لیکن شہر میں آتے ہی اسے احساس کمتری ہونے لگتا ہے۔ سب سے پہلے تو اسے وہ زبان سشدر کرتی ہے جس کا ماخذ کتابیں، ابلاغ کے جملہ وسائل اور مارکیٹ جنم دیتے ہیں..... لباس تو وہ جد ترک کر دیتا ہے لیکن زبان سیکھنے کے لیے اسے کچھ مدت درکار ہوتی ہے، لیکن جسے پینڈو سمجھ کر شہری لوگ برخاست کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے تروتازہ دماغ کے باعث تجربے سے سیکھی ہوئی فہم و فراست کے باعث بہت جلد شہری کے سامنے میٹریاں چڑھنے لگتا ہے۔ اسے آداب محفل سیکھنے میں در لگتی ہے کیونکہ یہ وہ پانی نہیں جن میں اس نے تیرنا سیکھا لیکن مجلسوں میں زندہ دلی پینڈو وہی کے دم قدم سے ہوتی ہے۔ شہری انہیں ان پڑھ سمجھتے ہیں، لیکن پھر اسی کی گھڑت کے ٹوٹم اور Taboos شہری معاشرے میں لہو کی طوح ڈوڑنے پھرنے لگتے ہیں۔ دیہاتی کی ترقی شہر میں اور بھی تیز ہوتی ہے جب یہ تعلیم کی سان ہر چڑھے الفاظ کا جنتر منتر سمجھ

پائے اگر گفتگو کے اتار چڑھاؤ میں دیہاتی تجربے سمونے لگے تو شہری اس کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔

چاچا صمد ہمارے ساتھ والے گاؤں سے آیا تھا اور پکا پیٹھو تھا۔
چانے مے ایک جیتی جاگتی، ہنس مکھ پر امید روایت زندہ تھی۔ وہ مبالغے کی حد تک سوشل تھا اور کسی سی سی لیڈر کی مانند اسے گفتگو کا فن ازبر تھا۔ گھر کا دروازہ کھلتے ہی وہ برسات کی ٹھنڈی ہوا کی طرح خوشی کے جھونکے ساتھ لاتھا۔ چاچا صمد کا سوا گت سبھی کرتے۔ سب سے پہلے وہ اماں کو تلاش کرتا۔ ماں کے پاس پیروں بھار بیٹھ کر وہ ہر بات سرگوشی اور پریم سے کرتا۔

”کیا ہو رہا ہے بھابھی؟.....“

”کچھ نہیں ویر۔ گھٹنے میں درد ہو رہا ہے۔ فوراسینک دے رہی تھی“
چولہے کی لکڑی نکال کر چاچا صمد اپنا سگریٹ جلاتا اور ایک آنکھ میچ کر دھواں چوڑتا۔

”بھابھی وہ میں ساہنے کا تیل چھوڑ گیا تھا۔ اس کی مالش کر کے دیکھی“
”وہ دن لگایا تھا۔ آرام بھی آگیا تھا تھوڑا بہت.... پر پھر نا جانے کدھر رکھ دیا تیل.....“

”اور لا دوں گا.... اور لا دوں گا تو فکر نہ کر..... ساہنے ہی ساہنے تیل ہی تیل۔“

”جیتا رہ خوش رہ“

اماں ساری کی ساری پسینے جاتیں۔ ویسے بھی اماں کی محبت ہی ایسی تھی، جس کسی پر مہربان ہوتیں، اس کے خلاف کچھ نہ سن سکتیں۔ پھر جو عیب بھی لگتا کسی دوسرے کی غلطی

سے نکلتا۔ اپنی آنکھ سے دیکھ کر بھی انہیں یقین نہ آتا کہ جس بت کی پرستش وہ کرتی ہیں وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ گونگا، بہرہ ہے اور کسی کام نہیں آ سکتا۔ دیور کے معاملے میں وہ سکھ سرداریوں کی طرح زدہ تھیں۔

وہ دیور سے اس طرح کا برتاؤ کرتی تھیں جیسے چھوٹے بیٹے سے معاملہ ہوتا ہے۔ الجھتیں جھڑکتیں، ماتھا چومتیں، بازو پکڑ کر جھنجھوڑتیں، دوپٹے سے پسینہ پونچھتیں، گرم گرم پھلکے کو دیسی گھی سے چوپڑ کر پیش کرتیں، غریبی کے باوجود انڈے تل کر دیتیں، دیور بھی خوش دلی کا بادشاہ تھا۔ فلمی ڈائلاگ بول بول کر اماں کو لارے گائے رکھتا۔ جو چیز اس کے کام کی نہ ہوتی۔ اسے بڑے تپاک اور حساب سے اماں کو پیش کرتا۔ اماں سے چاچا صد کو رشتہ استوار کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ رشتہ بنا بنایا آیا تھا۔ جس روز اماں بیاہ کر آئی تھیں اس روز اپنے سے دس سال چھوٹے دیور کو گودی میں بٹھا کر سرے گھر والوں نے صد چاچا کو اماں کا منجھی بن دیا۔ اس دن کے بعد چاچا اور اماں کا رشتہ عاشق سے کم کم اور دوست سے زیادہ رہا۔ ابا اچھے منہ، بند آنکھوں، سرد ہاتھوں والا ایک ملاقاتی تھا۔ اس نے چاچا صد کی گرم جوٹی نے اماں کے دل چولہے کو گرم رکھا۔

چاچا گھر میں یوں بکھرتا جیسے کبھی سوڈے کی بند بوتل کھلتے ہی جھاگ سمیت ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر ابلتی چائے، گرم روٹی اور تازہ لسی پی پا کر چاچا اوپر کی منزل میں چڑھ جاتا ہے۔ شاہد بھائی چونکہ شاعر طبع تھے اس لیے کوٹھے کے اکلوتے کمرے میں ان کا بسیرا تھا۔ وہ پڑھائی کے بہانے کبھی پتنگ اڑاتے، کبھی شعر گنگناتے۔ سردیوں میں سر میں تیل لگا کر دھوپ سینکتے۔ کوئی منع کرنے والا نہ تھا۔

”اوائے شاہد کیا بن رہا ہے کنجرا۔۔۔۔۔“

شاہد بھائی کی باچھیں کل جاتیں۔

”آؤ آؤ چا چا جی۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔“

”یہ ریڈیو لگا ہوا تھا۔ آواز آرہی تھی سیڑھیوں پر۔ بند کیوں کر دیا۔۔۔ کس شاعر کا

کلام تھا؟۔۔۔۔۔“ تجاہل عارفانہ سے چا چا کہتا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ چا چا جی میں خود پڑھ رہا تھا شعر۔۔۔۔۔“

”سنا مجھے کس کا شعر تھا۔۔۔۔۔؟“

”میرا اپنا شعر تھا چا چا جی“

”واہ بھئی واہ سبحان اللہ مال کر دیا یا شعر لکھنے لگ پڑا۔۔۔۔۔“

اب شاہد بھائی اپنے بے وز نے شعر، نثر، نظمیں اور انشائیے سنانے میں مشغول ہو جاتے۔ چا چا صمد بغیر سنے کھل کھل کر داد دیتے۔۔۔۔۔ بچہ پارٹی چلی منزل سے سرکتی اوپر کوٹھے پر جا پہنچی۔ چا چا صمد گھر کا پائینڈ پائپر تھا۔ سبھی اس کی آواز پر سرکتے کھسکتے چمے آتے۔ بچوں کے ساتھ چا چا صمد کا معاملہ اور بھی کھلم کھلاتا تھا۔ کسی کے پیٹ میں انگلی ٹھونکی۔ اپنے کانوں کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر پھٹھنٹھنٹے اور ہاتھی بن کر ہنسا دیا۔ بچوں کو پیچھے لگا

لیا۔ ایسے موقعوں پر چا چا صمد Ventriloquist بھی بن جایا کرتے، کبھی پلی کی طرح میماتے، کبھی بند بن کر خونیا تے۔۔۔۔۔ شیر بن کر دھاڑتے تو چھوٹے بچوں کی آنکھوں کا قمر نیا پھیل جاتا۔ چا چا کے آنے پر شاہد بھائی سے چھوٹے ہم تین تو موجود ہوتے ہی تھے، محلے کے دوسرے بچے بھی خود بخود آتے چلے جاتے۔

سارا گھرانہ چا چے کی آمد پر خوش ہوتا صرف ابا کے ماتھے پر بل سیدھے نہ ہوتے۔ پاکستان آتے ہی اسے بیوی بچوں کی کثالت میں مشکل پیش رہی تھی۔ ابا اتنا سنجیدہ مزاج آدمی تھا کہ اس کے سامنے ہنس بول نہیں سکتا تھا۔ خوشی کا یہ قاتل نہ خود خوش رہتا، نہ کسی اور کو خوش رہنے کی اجازت دیتا۔ وہ عام طور پر چا چا صمد کے آتے ہی گھر چھوڑ کر باہر نکل جاتا اور کم از کم ہم سب کو اتنی آزادی بخش دیتا کہ ہم چا چا کی

صحبت سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اب کے باہر جاتے ہی گھر میلے کی شکل اختیار کر لیا۔۔۔۔۔ شاہد بھائی سے چھوٹی رفعت آپا کی سہیلیاں نہ جانے کہاں آجائیں حالانکہ ساندہ کلاں میں ہمارے پاس فون نہ تھا۔ یہ لڑکیاں کھی کھی کر

ہنسنے، گولے کناری کو پسند کرنے والی اور فلمی گانوں پر جان چھڑکنے والیاں تھیں۔ چاچا صمدان میں گدگدی کی کیفیت پیدا کرتا اور خود ہنسے بغیر کئی لطیفے بیان کرتا۔

لڑکیوں کے ساتھ چاچا صمد بالکل فطری تعلق بناتا۔ اس میں مرد و عورت کی ازلی بے تکلفی اور اعتماد ہوتا۔ جھڑکنے، گستاخ ہونے، جھوٹ بولنے، حیلہ بازی کے باوجود رشتہ کبھی نہ ٹوٹتا اور لڑکیاں ہمیشہ گزشتہ رابطے کو بڑی آسانی سے جوڑ لیتیں۔ چاچا صمد یہ جانتا تھا کہ لڑکیاں کسی بات کو دیر تک سنجیدگی سے نہیں لیتیں پھر اسے یہ علم تھا کہ بعض اوقات لڑکیاں چھوٹی سی چھوٹی بات کو بجد و سنجیدگی سے محسوس کرتی ہیں اور ساری زندگی نہیں بھولتیں۔ دونوں طرح کی لڑکیوں میں چاچا صمد کا وہ یہ غیر زمہ دارانہ رہتا لیکن کسی لڑکی نے چاچے کی بات پر دیر تک منہ نہیں تھتھایا، نہ ہی اس کی کسی سے شکایت کی۔ چاچا چمک چوٹدی پر ایمان نہیں تکھتا تھا۔ وہ ذہنی طور پر لڑکیوں کے اس قدر گدگدی کر لیتا کہ لڑکی ساری کی ساری زعفران زار بن جاتی، کیونکہ رابطوں کے لیے یہاں بیٹنگی کی شرط نہیں تھی، اس لئے گلہ گزاریاں کم ہوتیں۔

ہمارے گھر میں چاچا صمد کا آنا مثل عید کے تھا۔۔۔۔۔ اور یہ بات ہے کہ وہ اپنی پتنگوں کی دوکان چھوڑ کر روز روز نہ آسکتے۔ چاچا اوپر سے ہنسوڑ اور بچہ جمورا اور اندر سے حلال روزی مانے والا سنجیدہ دوکاندار تھا۔ اس کا یہ تضاد ہر گز تکلیف دہ نہ تھا۔

چاچا صمد کو جب بھی یاد کرتا ہوں، ایک بھولی بسری کہانی یاد آ جاتی ہے۔

بھدک کر کچھ فاصلے پر گیا اور شہزادے کو ایک پتھر پر مور پٹکے پھینکنے کو کہا۔ پتھر پر مور پٹکے کا
 گرنا تھا کہ شناخ سے آواز آئی۔ پتھر دو لخت ہو گیا۔ نیچے کی جانب اترتا سنگ مرمر کا
 زینہ نظر آیا۔ اب آگے آگے مینڈک اور پیچھے پیچھے شہزادہ روانہ ہوا۔ نیچے اتر کر کیا دیکھتا
 ہے کہ ایک آراستہ پیرا ستہ کشادہ ہال ہے جس میں بھانت بھانت کے مینڈک کورس
 میں مل کر گارہے ہیں۔۔۔۔۔ رہبر مینڈک نے کہا۔۔۔۔۔ ”سنو حاضرین! ہمارے
 مہمان کو ایک ایسا قالین درکار ہے جس کا کوئی ثانی نہ ہو“۔ سارے مینڈک تھوڑی دیر
 کے لئے غائب ہو گئے۔ پھر ایسا منقش صندوق اٹھا کہ باید و شاید۔۔۔۔۔ شہزادے
 نے کانپتے ہاتھوں سے ڈھکنا کھولا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک نادر زمانہ قالین ایسا کہ عقل
 دنگ رہ جائے۔ نقش و نگار دیدہ زیب، خوبصورتی میں لاٹانی، اون ریشم سے بھی نرم اور
 پچیلی رنگوں کی نسبت بے مثل۔۔۔۔۔ شہزادے نے قالین کو کندھے پر دھرا، مینڈک کا
 شکریہ ادا کیا اور بادشاہ سلامت کی خدمت میں کورنش بجالایا۔ بڑے بھائی زیر لب
 مسکرائے۔ یقین پختہ تھا کہ اتنی کم علمی اور سادگی اسے کسی طور پر پسندیدہ قالین نہ
 لانے دے گی۔

پہلے بڑے شہزادوں نے اپنی دریافتیں دکھائیں۔ پھر چھوٹے شہزادے کو وزن
 ملا۔ جونہی قالین فرزند ہوا۔۔۔۔۔ سب دنگ رہ گئے۔ شاہ عالم پناہ بستر مرگ سے اٹھا
 اور نحیف آواز میں گویا ہوا۔۔۔۔۔ ”میرا فیصلہ مشیت نے کر دیا۔ آج کے بعد یہی میرا
 وارث ہے۔“

بڑے شہزادے نے کہا۔۔۔۔۔ ”اے آقا یہ اتفاق محض ہے، ورنہ یہ شہزادہ ایسی
 اہلیت نہیں رکھتا کہ امور سلطنت سنبھال سکے ناخواندہ مجبور محض ہے۔ زمانہ شناسی سے
 آشنا نہیں۔ گھڑسواری کا علم نہیں رکھتا۔ سپاہ گری میں کورا ہے۔۔۔۔۔ تو کیوں اپنی
 سلطنت کے امور ایک ایسے فاتر العقل کے سپرد کر رہا ہے جو باتری کا باعث ہوں؟“

چندے شاہ ذی جاہ نے توقف کیا۔ پھر گویا ہوا۔۔۔ ”یہ شرط انصاف نہیں کہ جو شرط میں نے پیش کی اس میں سبقت لے جانے والے کو حوالے سلطنت نہ کروں۔ یاد رکھو بادشاہت کے لئے انصاف اول و آخر شرط ہے اور یہ حقیقت کیسے جھٹلائی جائے کہ کبھی کبھی وہی چیز جو ہمیں بری لگتی ہے، ہماری بھلائی کے لیے اہم ہو اور وہ چیز جس پر ہم فریفتہ ہوں، ہمیں تباہی کی جانب کھینچے۔ کون جانے اسی سادہ لوح میں رعایا کی فلاح ہو اور تمہارے علوم کی دسترس منہ دیکھتی رہ جائے۔

سنا ہے سب سے چھوٹا شہزادہ برسوں حکمران رہا۔ بڑے شہزادوں کا سارا وقت بغاوت، سازش اور رزم گاہوں میں گزرا۔ بادشاہ چونکہ انصاف کے علاوہ کسی اور وصف سے آراستہ نہ تھا اس لئے اس کے عہد میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پیتے رہے اور رعایا فلاح اور امن سے وابستہ خوشی اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتی رہی۔

میں آج تک یہ روز نہ جان سکا کہ جنس کو بعض پر سبقت کیوں حاصل ہو جاتی ہے؟ کسی ایک وصف سے بیڑا پار کیسے ہو جاتا ہے؟ چاچا محمد صد میں وہ کونسی خوبی تھی جس کی بنا پر وہ ہر لحاظ پر بڑھرا اور میرا باپ جس کی ساری زندگی ذمہ داریاں اٹھاتے، وعدے نبھاتے، ناک کی سیدھ چلتے چلتے گزری، نہ پنے لیے خوشی حاصل کر سکا نہ کسی اور کو مسرت کے حوالے کر سکا؟ بعض کو بعض پر ترجیح کیا کسی خوبی، محنت، منطقی چناؤ کے باعث ہے کہ یہ اوپر والے کی مرضی کی مرہون منت ہو اور جس کی لاجک تک ابھی انسان پہنچ نہیں پایا۔“

جرمن ٹاؤن کے اس محلے میں صفائی ستھرائی کا یہ عالم ہے کہ کبھی کسی کھڑکی دیوار کی کچی گلدنڈی پا کاغذ، مٹی، گھاس، کاتکا بھی نظر نہ آیا۔ میں ہیلکونی میں بیٹھ کر سڑک کا نظارہ کرتا رہتا۔ ہر پیر اور ہفتے کے روز گندی گاڑی آتی اس میں بڑے مضبوط جسموں والے نیلی رو دیاں پہنے نیگرو، امریکن اور دوسرے تارکین وطن باہر نکلتے اور گھروں

سے باہر رکھے ہوئے پلاسٹک کے کالے ڈرموں میں سے کوڑا کرکٹ اٹھا کر لے جاتے۔ نہ سگریٹ پینے کے بہانے بیٹھتے، نہ ہی کسی دوسرے پر کام چھوڑ کر خود چھپت ہو جاتے۔ ہمارے دیس میں عام طور پر نماز پ

ڑھنے کے بہانے کارندے جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر آفس میں واپس ہی نہیں آتے۔ جمعے کے روز تو معمول ہوتا کہ گودفر پانچ بجے تک کھلیں لیکن واپسی کی انفری ضرور کم ہو جاتی۔ شاید اسی دکھ کے کارن بھٹو کے عہد حکومت نے جمعے کو سرکاری تعطیل ہی میں بدل دیا گیا لیکن بات پھر بھی نہ بنی کہ اس طرح ہفتے میں تین چھٹیاں رہنے لگیں۔ جمعے کو سرکاری چھٹی ہفتے کو فرینچ لیو اور اتوار کو سرکاری انگلشیہ کی رسم کے مطابق چھٹی ہی سمجھی جانے لگی۔

منگل کے روز گھاس کاٹنے والے آے کرتے ہیں گھاس کاٹنے کے لیے عموماً ایسے طالب علم ہوتے تھے جو اپنے سکول یا کالج کی فیس اکٹھی کرنے کے لیے یہ کام کرتے۔ ایک گھاس کاٹنے والی چھوٹی سی گاڑی آتی جسے طالب علم کار کی طرح طاتا اور موٹی موٹی گھاس کاٹتا جاتا ہے اس کے بعد ایک نوجوان بسی بندوق نما مشین لایا جس کے سامنے چونٹی میں گھاس کاٹنے کی پھر کی لگی ہوتی اور پھر کونے کھدروں میں سے ناممکن جہگوں سے بھی گھاس کاٹ جاتی۔۔۔۔۔

نہ تو کوڑا اٹھانے والے نہ گھاس کاٹنے والے نہ ہی شیشے صاف کرنے والوں کو کام کرنے میں کوئی دقت تھی۔ اپنے اپنے وقت پر آتے اور کام کرنے کے بعد پھر سے اڑ جاتے۔۔۔۔۔ پرندوں کی طرح یہاں نہ ڈراو نہ صفائی تھا نہ کوئی ایس میٹ جو کام کروائے مکھی کے چھتے کی طرح سارے کارکن پابندی کا رتھے۔ ان ربوٹوں کو دیکھ کر مجھے خیال آتا کہ یہ کیسی دنیا ہے، کیسا نظام ہے۔۔۔۔۔ جہاں کام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کوئی شخص روڑا بنتا ہے نہ کسی کو روکاوٹ بننے پر آمادہ کرتا ہے۔

دراصل امریکہ میں ساری اخلاقیات کام کی اخلاقیات کے بعد آتی ہیں اس معاشرے میں اسی انسان کی عزت ہوتی ہے جو کام میں پورا اترتا ہے۔ سب کا رشتہ کام سے گہرا ہے اور فرد کا فرد سے رشتہ ماطہ اغراض کے باعث نہیں بلکہ ذاتی خوچی پر منحصر ہے۔ یہاں سب کلام کی اہمیت کے لئے جڑ نے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔۔۔

یہ اور بات ہے کہ ابھی ایسی گوند ایجا نہیں ہوئی جو انسان کو انسان سے مستقلاً جوڑے۔۔۔۔۔ انسان ہمیشہ اپنی فردیت قائم رکھنا چاہتا ہے کسی اور میں نہ صنم ہوتا ہے اور کسی اور کو اپنے میں ضم ہونے کی اجازت دیتا ہے امریکہ میں پچھڑنے کا سلسلہ اور بھی تیز ہے۔ یہ لوگ دل شکستہ کو کربھی Move On کرنا جاتے ہیں۔

”اباجی آپ سارا دن بورتو نہیں ہوتے۔۔۔۔۔“ بلال بہت موڈ ب ہو کر پوچھتا ہے۔

”اوہ نہیں بابا۔۔۔ میں نے کہا یور ہوتا ہے اس عمر میں“

”میں آپ کو اس ویک اینڈ پر نیویارک لے جاؤ یا آپ واشنگٹن ڈی سی جائیں

گے میرے ساتھ۔“

”تم میری فکر نہ کرو بلال میں ایک مدت سے آزاد محسوس کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“

بلال میرا داماد ہے، وہ ہر روز تازہ شیو کے بعد نیلگوں چہرہ لئے بریک فاسٹ ٹیبل پر آتا ہے۔ الیکٹرک کیتلی میں چائے کے لئے پانی چڑھانے کے بعد وہ کئی چھوٹے موٹے کام کرتا یہ سب سے پہلے وہ ڈش واش میں سے برتن نکال کر باورچی خانے کی Cabinets میں رکھتا ہے ان Cabinets کو ہمارے ملک میں الماریاں کہا جاتا تھا، ان میں ٹھکا ٹھک کٹاکٹ برتن دھرنے کے بعد وہ اپنے اور میرے لئے ٹی بیگز لے کر چائے بناتا ہے اس چائے کا لطف کبھی کڑک چائے جیسا

نہیں ہوستا، لیکن ڈاکٹر بلال کچھلے ڈالتے بھلا چکا ہے۔ وہ سری پائے، ٹکائک،
 ،نہاری، قیے والے نان یا نہیں کرتا۔ ایک مدت سے اس کی زندگی مشینی ہے۔ وہ عقل
 کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ ہم دونوں سب سے پہلے ناشتہ کرتے ہیں میری بیٹی اور
 اس کے دونوں بیٹے گھر سے ڈرائیٹ جاتے ہیں بلال کے ساتھ میری بے تکلفی نہیں
 ہو سکی۔ کچھ حد تک میں آگے بڑھتا ہوں لیکن پھر خارپشت کی طرح میرے کانٹے
 کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں کسی کو اپنے جھانکنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ
 زندگی کی کسی سٹیج پر مجھے علم ہو چکا ہے کہ رازداں ہمیشہ سب کی کمزوریوں کو واشگاف کر
 کے انہیں استعمال کرنے کا فن بھی بخوبی جانتا ہے۔

بلال کچن اور ڈرائیغ ٹیبل تک کئی مرتبہ آتا جاتا ہے رہتا ہے۔ کبھی ٹوسٹر سے
 ٹوسٹ برآمد کرنے، کبھی چیز اور جیم نکالنے۔۔۔۔۔ اس لئے میں ناشتہ میں اندہ نہیں
 کھاتا کہ پھر اسے یہ سروں بھی کرنا پڑے گی۔ سارا دن ہسپتال میں سرکھپانے کے بعد
 جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے کئی دوسرے کام کرنا ہوتے ہیں گروسریز بھی وہی لاتا
 ہے، کیونکہ میری بیٹی کام پر دیر سے جاتی ہے اردیر سے ہی لوٹتی ہے۔ بلال عموماً دماغی
 طور پر غیر حاضر رہتا ہے۔ مغربی لوگوں کا خدا کام ہے۔۔۔۔۔ ہر تیسرا آدمی
 Workaholic ہے۔ اس کی اخلاقیات میں سرفہرست محنت کی اخلاق قدر
 ہے۔۔۔ وہ کام میں چوری نہیں کرتا۔ اپنے Employees کا وقت ضائع نہیں کرتا
 Work ethics نے اسے مشینی بننے میں مدد دی ہے اسی لئے بالآخر اسے کام
 سے بیک درکار ہوتی ہے اور وہ پورے پانچ دن مشین بناؤیک اینڈ کا انتظار کرتا رہتا
 ہے جن اس کے جسم کو تفریح اور آرام کی گریس دی جاسکے۔

”کبھی تم نے سوچا بلال؟“

”کیا اباجی۔۔۔۔؟“

”واپس جانے کے متعلق۔۔۔۔۔ وطن میں لوٹنے کی سُرزو کبھی بیدار ہوئی تم میں۔۔۔“

وہ زہر خند کے ساتھ مسکرا کر جواب دیتا ہے۔۔۔۔۔ ”شروع شروع نوخلجیا ہوتا تھا ابا جی لیکن اب فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب پیچھے دیکھوں گا تو پتھر کا بن جاؤں گا۔“

”وہاں تمہارے سٹیٹس کا آدمی عیش کرتا ہے دو دو ڈرائیور۔۔۔۔۔ محل جیسا گھر آٹھ سات ملازم۔۔۔۔۔ بچوں کے لئے فلکیو میڈ، دو ساز کمپنیوں کی طرف سے یورپ امریکہ کے مفت سفر۔۔۔۔۔ جس قدر تم مانتے ہو بادشاہوں کی طرح رہ سکتے ہو وہاں۔۔۔۔۔“

”پاکستان امیروں کی جنت ہے ابا جی۔۔۔۔۔ امریکہ غریبوں کا بہشت ہے۔ یہاں غریب آدمی عزت نفس سے محروم نہیں ہوتا۔ وہ نہ اپنے آپ کو کسی سے کمتر سمجھتا ہے نہ ہی کمتر ہوتا ہے آپ کے ویس میں۔۔۔۔۔“

”کیا وہ تمہارا ملک نہیں ہے بلال؟۔۔۔۔۔ میں سوال کرتا ہوں وہ جواب نہیں دے پاتا۔

بلال گھڑی دیکھتا ہے اسے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کر کے ہسپتال پہنچنا ہے اور بقول اس کے وہ کبھی لیٹ نہیں ہوا۔

”ابو جی۔۔۔۔۔ جب میں وہاں لاہور میں تھا تو پورے تین سال ملازمت کے لئے کوشش کرنے کے باوجود بیکار تھا۔ یہاں آکر میں بڑے دھکے کھائے۔ ارجمند اور میں نے بڑی مشقتیں جھیلیں، آپ کبھی اس سے پوچھنے گا۔ کیا کیا پڑ نہیں نیلے ہم نے۔۔۔۔۔ لیکن آج جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، اسی امریکہ نے ہمیں دیا ہے۔۔۔۔۔“

”لیکن میرے نزدیک تو ابھی بھی تم دونوں کی مشقت کم نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ جس

قدر کام تم اور ارجمند یہاں کرتے ہو اس کا تو تصور بھی پاکستان کے نوجوان نہیں کر سکتے۔۔۔۔ پہلے دفتروں میں پستے ہو، پھر گھر آ کر گھریلو ملازم بن جاتے ہو، یہ بھی کوئی زندگی ہے۔۔۔۔ کوئی فراغت نہیں آرام نہیں۔۔۔۔ گھڑی بن ہو گھڑی“

”ٹھیک ہم کام کے عادی ہو گئے ہیں اباجی۔ آپ فکر نہ کریں۔ کام ہماری زندگی، خوشی، سکون ہے۔۔۔۔ یہاں کام مشقت نہیں لگن ہے لگن۔۔۔۔“

وہ اپنا بریف کیس لے کر گھر سے باہر نکلتا ہے۔ اسے اپنے ہسپتال تک پہنچنے کے لئے آدھا گھنٹہ درکار ہے۔ چار پانچ جملے بولنے میں اس کا وقت ضائع ہو جاتا ہے اس کی پاداش میں اسے گاڑی تیز چلانی پڑتی ہے۔۔۔۔ Stress میں جانا پڑتا ہے۔

امریکہ میں لوگ ڈالر نہیں بچاتے وقت بچتے ہیں۔ پھر جب وقت کا صحیح مصرف ہونے لگتا ہے تو ڈالر خود ہی پائداز ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح ایک خاص قسم کی Frustration جنم لیتی ہے۔ مایا داس پر دولت کا بوجھ خود بخود بڑھتا ہے۔ دولت اپنی مشغولیات خود بڑھاتی ہے۔ محل نما گھران گھروں کے انتظاما، بیرونی ممالک کے سفر، Designer کپڑوں اور جوتوں کی تلاش، دولت کی بنا پر شہرت کی ہوس۔۔۔۔ پارٹیاں، پی آر، پرنسپلٹی پر بلرز نفسیاتی بیماریوں کا لائنل سلسلہ جاری ہو جاتا ہے جب ڈالر بچنے لگتے ہیں تو پھر ایک اور قسم کا Stress شروع ہا جاتا ہے ڈراصل یہاں وہاں انسان پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ ذہنی دباؤ سے نکلے۔ اظہانیت قلب، سکون اور شانتی ملے۔۔۔۔ لیکن شاید معیشت اور معاشیات کو یہ کچھ درکار نہیں۔ زندگی کا اصل راز اسی Stress میں ہے۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ علاج کے راستے پر چلنے والے دباؤ کی گھڑی سر سے اتار کر ملکوتی مسکراہٹ کے ساتھ گرد و پیش میں تھنڈی چاندنی کی طرح پھرتے ہیں۔ نہ جہاں سوزی کا باعث بنتے ہیں نہ خود سوزی کا۔۔۔۔ لیکن اس سکون کے لئے Patent وہ ایسی جگہ کراتے ہیں، جہاں سے

نبیوں کا نسخہ سکون میسر آتا ہے اور اسے کسی اور زبان میں لکھا جاتا ہے۔

جب ہم ساندہ میں رہا کرتے تھے تو پچھلی منزل میں ہمارا قیال تھا اور اوپر والی منزل کے اکلوتے کمرے میں شاہد بھائی رہا کرتے تھے۔ نیچے صرف تین کمرے تھے۔ ایک تو بیٹھک تھی جس میں بید کی کرسیوں کو لٹھے کی چولیاں پہنا کر پردہ پوش شکل دی گئی تھی۔ ایک کمرہ ابو امی کا تھا جس میں زیادہ وقت ابوا کیے رہا کرتے۔ دوسرے کمرے آپا چودھرائن تھیں اور ہم تینوں چھوٹے بہن بھائی کو ساٹا مار کر سٹ ڈاؤن سٹینڈ اپ کرایا کرتی تھیں۔ وہ میرے ہوش سے پہلے کی استانی تھیں۔ ان کو یہ زعم تھا کہ وہ ساری کائنات سے بہتر جانتی ہیں۔

انسان کو غالباً سب سے زیادہ تحکم کا شوق ہے۔ وہ دوسروں پر کبھی رعب کبھی خوشامد، کبھی سزا دے کر اپنی حکومت کا ثبوت اپنی انا کو پہنچاتا رہتا ہے۔ تحکم زیادہ ہوتا چلا جائے تو خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے دوسروں کی مرضی پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے مواقع کم ہوں تو احساس کمتری بڑھنے لگتا ہے۔ مذہب، قانون، ماں باپ، استاد، رسم و رواج کسی قسم کی بھی احاطت ہو تو انسان تابع کی حیثیت میں فیصلے کرتا ہے اسے فیصلوں کے لیے اپنے اندر کے بجائے باہر کی موازین پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ ماننے والے پر سے فیصلے کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔ اس بوجھ کے اٹھنے ہی وہ صاحب اختیار بھی نہیں رہتا اور اسی لیے اپنے پر بھروسہ کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے ترقی کے لئے اپنے فیصلے پر اعتماد کرنا انتہائی اہم ہے۔ اسی خود اعتمادی کے سہارے مغربی معاشرے میں ترقی کا پیہ جام نہیں ہوتا۔ ہمارے گھر میں بھی غلطی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ چونکہ ہم غلطیاں کرنے کے عادی نہ تھے اس لیے معافی مانگنے کا رواج بھی عام نہ تھا۔ معافی مانگتے وقت ہم عجیب قسم کے گونگے، ضدی اور

شرمسار سے کونے کھدروں میں چھپتے پھرتے۔ ہم تینوں چھوٹے مدح و زوم کے لئے آپ رفعت کی طرف دیکھتے رہتے۔ وہاں سے صاڈل جاتی تو ہمارے چہرے کل اٹھتے۔ کھور کر دیکھ لیتیں تو مرنے کا مقدم ہوتا۔

”سنائیں کہ کہہ رہی ہوں میں۔“

”جی آپا۔۔۔۔۔“

”چلو سیدھی طرح اور نہاؤ۔۔۔“

ٹھٹھرتی سردی میں جب گلی میں دھند کے باعث کچھ نظر نہ آتا، نہانے کا حکم ملا کرتا۔ ہم قریب قریب بریلے پانی سے نہا کر باہر نکلتے تو آپا کانوں کے پیچھے گردن کے سامنے ناخنوں کو الٹا پلٹا کر حکم دیتیں ”چلو اب ناشتہ کرو۔۔۔ دیر نہ لگے۔ سکول کا وقت ہو گیا ہے۔“

اسی طرح ٹھٹھرتے، کانپتے فریدہ اور ظفر سکول پہنچتے تو ماسٹر غلام نبی ٹکر جاتے۔ وہ سخت کلامی کے ساتھ ساتھ ہاتھ چلا کی بھی کرتے۔ جب انہیں غصہ جاتا تو جہاں کہیں دل چاہتا، مکا چٹکی تھپڑ رسید کرتے اور مجھ بھر کو بھی احساس جرم انہیں نہ ستاتا۔ انہوں نے خود اتنی سخت قسم کی زندگی بسر کی تھی کہ کسی سے نرمی برتنا انہیں اسراف لگتا، ان کا بس چلتا تو تفریح کی گھنٹی بھی بند کر دیتے۔ ہنستے، مسکراتے، چبکتے، بولتے شرارتیں کرتے چہرے پر وہ عذاب بن کرنازل ہونے کو ڈسپلن کا نام دیتے تھے۔

واپسی پر پھر رفعت آپا کا تحکم سہنا پڑتا۔ ہوم ورک، کھانا، دوسرے دن کا یونیفارم تیار کرنا، بستر بچھانا، استری کرنا، یہ سارے مشاغل ان کی مرضی کے مطابق ہوتے۔ وہ جب ہمیں جلد سنانے دینے میں کامیاب ہو جاتیں تو دونوں پورٹیوں کو چھین پڑ جاتا۔ ہم ”پیا سے چھوٹ جاتے، بڑی ہونے کے ناطے انہیں کچھ ایسے حقوق حاصل تھے جن کا ہم تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ مجھ پرفسٹ ایر کا سال بھاری تھا، کبھی کبھی مجھے نیند نہ

اُن دیکھے کا کوف

اُن جانے کا خوف

اُن چکھے کا خوف

اُن چاہے کا خوف ----

وہم وگمان کا چیتا نئی شکلیں بنا کر ہمارے تعقب میں رہتا اور ہم اس سے ایسے بھاگتے جیسے پولیس سے چور بھاگتا ہے۔ نہ ہم کہیں ٹھرتے نہ کسی مقام سے آشنائی حاصل کر سکتے۔ یوں پاکستان میں ہمارا سفر چیتا جھپٹی سے شروع ہوا۔

تین خوش فہمیاں، جن میں عموماً لوگ زندہ رہتے ہیں۔

میں خوش ہوں کہ میں ایسی گلی میں بڑھا پلا، جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

میں خوش ہوں کہ ایسے آزاد ملک میں پرورش پائی، جہاں کسی کو کسی سے سروکار نہیں۔ تیسری خوش فہمی یہ ہے کہ میرے وطن کے لوگ سب سے اچھے ہیں اور یہاں کوئی برائی نہیں۔

ارجمند سلور سپرنگ جاتی ہے۔ ہر صبح بچوں کو منگمری کالج سے ملحق سکول میں ڈراپ کرنے کے بعد وہ پورے چائیس منٹ میں ہسپتال پہنچ جاتی ہے، جہاں اس کا شمار پیرا میڈیکل سٹاف میں شمار ہوتا ہے۔ وہ ایک امریکن ڈاکٹر کی receptionist ہے۔ اس کی چلت پھرت میں بڑا اعتماد ہے۔ اس کا لباس تو ویسا شوخ و شنگ نہیں جیسا وہ لاہور میں پہنتی تھی۔ لیکن اس کے انداز بہت شوخ ہو چکے ہیں۔ امریکنوں کی طرح وہ جینز ٹی شرٹ پہنتی ہے۔ کبھی کبھی جب ہسپتال میں کافی فارٹی یا گٹ ٹوگیدر ہوتا ہے وہ سکرٹ اور ہاؤز بھی پہن لیتی ہے۔ ایسے میں اس کی

ٹانگیں سکرٹ کی بیک سلٹ کی وجہ سے پنڈلیوں تک نظر آتی ہیں اور بلاؤز بھی وہ کچھ ایسے اہتمام سے پہنتی کہ اوپر سینے سے دو تین بٹن کھلے ہی ہوتے ہیں۔ ارجمند کو امریکی لباس پسند ہے۔ وہ کہتی ہے یہ امریکی لباس بہت پریکٹیکل ہے۔۔۔۔ اس میں کارناڈا دھوا نہیں۔

ابھی مجھے جرمن ٹاؤن میں آئے بہت دن نہیں ہوئے تھے۔ ایک دن میں نے ارجمند سے پوچھا۔۔۔۔ ”یہ تم نے اپنی شلوار قمیض کیوں چھوڑ دی ارجمند؟۔۔۔۔۔“ ارجمند کچھ دیر منہ میں زبان گھماتی رہی۔ شاید وہ مجھے اپنی بات سے زخمی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”بات یہ ہے ابو۔۔۔ انسان کو پانی کی رو کے ساتھ بہنا پڑتا ہے۔ میں شلوار قمیض میں بہت Odd محسوس کرتی ہوں۔۔۔۔ mainstream سے کت جاتا ہے آدمی۔“

”لیکن اپنی شناخت تو رہتی ہے نا ارجمند۔۔۔۔۔“

”ہاں رہتی تو ہے ابو۔۔۔۔ لیکن اگر لوگ اس شناخت کے باعث آپ سے نفرت کرتے ہوں آپ کو کمتر جانتے ہوں تو پھر اپنا لباس چھوڑنا پڑتا ہے۔ نیا چولا پہننا پڑتا ہے۔“

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

”ابو شلوار قمیض گھریلو لباس ہے۔ اوپر سے ڈھائی تین گز کا دوپٹہ بڑا Cumbersome ہوتا ہے۔ کبھی میز میں پھنتا ہے کبھی کرسی میں۔۔۔۔ کام پر تو یہی جینز کام آتی ہے بہت پریکٹیکل،،،“

میں ارجمند سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بیٹی بیٹی سے کوئی کیسے کہے کہ شلوار قمیض ستر پوش لباس ہے۔ اگر دوپٹے کو ستر

ڈھانکنے کے لئے استعمال کرو تو بھی یہ لبادے کا کام دیتا ہے۔۔۔ مجھے یاد آیا کہ جب ہم ساندہ میں رہا کرتے تھے اور شاہد بھائی ایم اے او کالج جاتے تھے۔ ان دنوں پتہ نہیں کیوں اور کیسے اماں نے اپنا بوسکی کا سفید شل کا ک برقعہ اتار دیا اور چادر اوڑھنے لگی۔ کچھ دیر آپا نے دو حصوں والا nuns جیسا سیاہ برقعہ پہنا، لیکن جب تک ہم ساندہ چھوڑ کر ٹمپل روڈ تک پہنچے۔ آپا کا برقعہ بھی چوٹ چکا تھا اور وہ چور بر جی سکول میں چادر اوڑھ کر ہی جایا کرتی تھیں۔ لباس انسان کی اندرونی تہذیبوں کا ایک مظہر ہی تو ہے۔

گیراج کے اوپر بنی ہیلکونی ٹین بیٹھ کر میں سارا دن تھاپلی سوچوں میں گزارتا۔ یہ سوشلسم بھی تفکرات میں بدل جاتیں، کبھی تضادات میں۔۔۔ کبھی اپنی زندگی کو سمجھنے میں سہولت ملتی اور کبھی یہی سوچ مجھے الجھا کر رکھ دیتی۔ ماضی کے لوگ واقعات، نظریات یوں آتے، گویا میں رسی مٹانے کے عمل میں ہوں، میں رسی سے اچھل کر انہیں گزر جانے دیتا۔۔۔۔ لیکن رسی پھر لوٹ آتی۔

سوچ بار بار آتی اور میں۔۔۔ مٹاتا رہتا

اچھلتا چلا جاتا۔ بڑھاپے میں انسان کے پاس ان سوچوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی گدڑی پھر ولتا رہتا ہے، جوئیں تلاش کرنے میں وقت گزارتا ہے اور کسی طور بھی مطمئن نہیں ہوتا۔

ہیلکونی سے کبھی کبھی مجھے ایک نوجوان نظر آتا۔ وہ گھروں کی پرائیویٹ سٹک پر چلتا بس سٹاپ کی طرف جاتا دکھائی پڑتا۔ میں نے پتہ کیوں اس کا نام کاشف رکھ لیا۔ ہو سکتا ہے وہ مہندر پرکاش ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ہسپانوی نڈاوا احمد نامی نوجوان انسداد سے فراف ہونے والے مسلمان پرکھوں کی اولاد ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھا میں نے اس کو کاشف کا پتہ سمجھ دے کر اپنا لیا تھا سنا ہے آج سے ہزار سال پہلے جب ہسپانیہ

سے مسلمان فرار ہوئے تو انہوں نے امریکہ آب بسیرا کیا۔ وہی پہلے تارکین وطن تھے جنہوں نے کولمبس سے پہلے یہ جزیرہ دریافت کیا، کیوبا، میکسیکو، ٹیکساس اور نیواڈا میں مسجد میناروں اور قرآن آیات کے کھندرات ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا میں ایسے لاتعداد شہر ہیں جن کے نام یہاں کے پہلے تارکین مسلمانوں نے رکھے واشنگٹن، نیویارک، اور ٹیکساس میں مدینہ مکرمہ نام کے شہر اس بات کے گواہ ہیں کہ یہاں کے ہسپانوی تارکین نے یہ نام اپنی عقیدت کے اظہار میں رکھے تھے،

جب تک میں کمروں میں چلتا پھرتا ہوں، بڑی ٹھس سی نارمل زندگی گزارتا ہوں، فریج سے لفٹ اور زنگال کرکھا لیے۔ واشنگٹن مشین میں کپڑے ڈال کر دھویے۔ ٹیلیویشن پر کیبل کی مدد سے سٹیشن بدل بدل کر مختلف ٹوٹے دیکھ لیے۔ ایسے اخبار جو سیروں کے حساب سے دروازے کے ساتھ ہی پڑے رہتے ہیں، اٹھائے اور پڑھ لیے۔ لیکن جونہی میں بیلکونی میں جا بیٹھتا ہوں۔ میرے دماغ کا اینجینا ایسی باتیں سوچنے لگتا ہے جو خود میرے لیے بڑی نئی ہوتی ہیں۔ عام طور پر بڑھاپے کے پاس مستقبل کے سنے کوئی پلان نہیں ہوتے۔ بوڑھے ولوے اور امید سے عاری اپنا منہ ماضی کی طرف کینے رکھتا ہوں۔ دیکھی بھالی گلیاں، جانے پہچانے چہرے۔ گزرے ہوئے موسموں پر تارچ پڑتی ہے تو وہ اپنے اند اندھیلوں سے چونک پڑتا ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے واقعات، حادثات، معمولات ماضی کا نہیں حال ہی کا حصہ ہوں۔ بوڑھا مستقبل سے صرف موت کی جھلکیاں دیکھتا ہے اور یہ حقیقت کچھ ایسی پر امید نہیں ہوتی۔

دوسری منزل پر ایک بیلکونی سی ہے۔ میرا بیدروم ہے اور اس کا ایک دروازہ بیلکونی میں کھلتا ہے۔ اس کی لمبائی کوئی دس بارہ فٹ اور چوڑائی قریباً چار سے چھ فٹ

ہے، یہ چھوٹی ہیلکونی لکڑیوں کی کھجیوں سے بنی ہے اور جھکنے پر اس کی درزوں سے گیراج سے نکلتی گاڑیاں نظر آتی ہیں سامنے لکڑی کا جنگلا ہے۔ اگر پاکستان ہوتا تو اس جنگلے پر تو لیے، شلواریں، کھیس، بچوں کے جانگھیس، فرائس غرضیکہ ہر سائز اور نمونے کا کپڑا سا کھنے کے لئے پڑا رہتا۔۔۔ اندرون شہر اور پرانی انارکلی میں کپڑے سکھانے کا یہ منظر عام طور پر نظر آتا ہے۔ چھوٹی بچیاں ہیلکونی میں بیٹھ رڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ جو ان لڑکیاں کپڑوں کی آڑ کے پیچھے کھڑی ہو کر بازار میں جھانکتی ہیں۔ جو ان بازار والیاں ایسے ہی چھجوں پر ٹیک لگا کر نظر بازی اور رازاروں سے کام لے کر کمروں کا دھنا چلاتی ہیں۔ یہ چھجے اندرون شہر کے کلچر، زندگی اور دھوپ کا منبع ہیں، لیکن اس پوش علاقے کہلاتے ہیں، ان کے رہن دار بھی خوشحال لوگ ہوتے ہیں۔

امریکہ میں مکان عموماً بنکوں کے پاس رہن ہوتے ہیں۔ ایک مدت سو داور اصل زکوٰۃ قسطوں پر ادا کرتے رہنے سے بنک میں گروی رکھا ہوا گھر ذاتی ملکیت بنتا ہے۔

سفید آدمی اپنی زندگی زیادہ تر قرض پر کاٹتا ہے۔ امریکہ میں ہیرے تک قسطوں پر مل جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی انسٹلمنٹ کا رواج اتنا عام نہیں اور ڈاؤن پے منٹ بھی آسانی سے ادا نہیں کی جاسکتی۔ یہ گھر جو میری بیٹی اور داماد کا ہے امریکہ کے اعتبار سے کافی کشادہ ہے اور اس کی ڈاؤن پے منٹ کے بعد وہ ہر ماہ قریب دو ہزار ڈالر کی قسط ادا کرتے ہیں اس کے علاوہ کچھ فرنیچر، ڈی وی ڈی، کیبل، کار نہ جانے کتنا کچھ قسطوں پر ہے۔ قرض کی مئے پینے کے بعد ان دونوں کو فاقہ مستی پر کوئی گلہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بڑے خوش و جزبے کے ساتھ امریکہ کے گن اور پاکستان کے اوگن بیان کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ قرض پر معیار زندگی وقت سے پہلے حاصل کر کے وہ پھولے نہیں سماتے۔ بلکہ سمجھتے ہیں انہوں نے بد قسمتی کو جمل دے دیا ہے۔

یہاں ہیلکونی میں پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ کر میں سامنے والی بلڈنگ اور خوبصورت

دھلی دھلائی سڑک، آنے جانے والے لوگ اور اپر ٹمنٹس میں بسنے والوں کی آمد و رفت کو دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ منظر میرے سلور سکرین کا کام دیتا ہے۔

میرے دماغ کی سکرین پر امریکہ اور پاکستان دونوں باری باری اور کبھی ساتھ ساتھ بھی چلتے ہیں۔ میرے ارد گرد کپلنگ کا مقولہ گھومتا رہتا ہے کہ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق، یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

سوچتا ہوں مل بھی کیسے سکتے ہیں؟ مشرق میں جب سورج چڑھتا ہے، مغرب میں اسی وقت آغاز شب کا منظر ہوتا ہے۔ سورج انسان کے دن اور رات کو متعین کرنے والا ہے۔ پھر جب ایک رات ہو اور دوری جگہ سورج کی کرنیں پھیلی ہوں تو بھلے ہی سارے فرق مٹیں ایک مخلوق سوتی ہے دوسری جگہ بیداری ہوتی ہے۔ فاصلے کم ہونے میں نہیں آتے۔

مشرق کے لوگوں کی رنگت اور مغربی لوگوں کی جلد دوسرا فاصلہ ہے جسے عام انسان پاٹ نہیں سکتا۔

لیکن سب سے بڑی مشکل آج کے عہد میں ترقی کی ہے۔۔۔۔ ایک وقت تھا جب مشرق میں سورج بھی اگتا تھا۔ جاگرتی بھی تھی اور مشرق روحانی طور پر مغرب سے زیادہ ترقی یافتہ بھی تھا لیکن اب ترقی کا تصور بالکل بدل چکا ہے۔۔۔ اب ترقی دنیاوی مادی

اور مال کی ہے۔ مشرق اس ترقی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایک زمانہ تھا جب مشرق نے ساری دنیا کو فلاح کی ترقی عنایت کی تھی اور واضح بات ہے کہ مذہب صبر، توکل، بھائی چارہ، محبت، اخوت جیسے اصول اپنانے پر ابھارتا ہے۔ خواہشات کو دبانے، اسراف سے بچنا، مسابقت میں نہ پڑنا، فساد نہ پھیلانا، نمائش سے گریز ان کی

سرکوبی فلاح کے لیے اہم ہیں۔ آج کے زمانے میں معاشی ترقی کے لیے اصول ان کے برعکس ہیں۔ اسراف اس ترقی کا سنگ بنیاد ہے۔ خواہشات کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رہیں تو ترقی ہوتی ہے۔ روپیہ گھر سے بازار تک آتا جاتا رہے مسابقت وہ تیل ہے جو ترقی کی مشینی گرا ریوں میں پڑتا رہے تو مشین چلتی ہے۔ یہاں صب تو کل نام کا دیا نہیں جلتا۔ جو کچھ ہونا ہے ابھی اسی وقت اسی لمحے کی گھنٹی بجاتا ہے، اس بے کلی سے رفتار پیدا ہوتی ہے، سڑکوں پر ٹریفک جیم تیار ہوتا ہے، میٹر تھیو مٹروک ہوتی ہیں لٹھیں اوپر نیچے آتی ہیں گھڑی بار بار دیکھنا اور کار میں دروازے کھلنے والے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر سفر کرنے کا رواج بدھتا ہے۔ انسان بے قرار نہ ہو تو ترقی نہیں کر سکتا۔ دوسروں کو مار مارنے کا جو ڈوکرا لے نہ آئے تو آگے بڑھ نہیں سکتا۔ روپے سے محبت پیدا نہ ہو سکے تو ترقی کا تصور حاصل نہیں کر سکتا۔ اسراف، مسابقت، خواہشات، کا بڑا تیزی سے چلے تو زمانے کی بھڑی پر ترقی فیل سپیڈ چلتی ہے۔

مشرق کی روحانی ترقی اور چیز تھی

اور مغرب کی معاشی ترقی اور علم ہے۔۔۔۔۔ مغرب کی شاہراہ مادی دنیاوی تروی
ہے اور مشرق کی پیگڈنڈیاں فلاح کی جانب نکلتی ہیں۔ جہاں تک میرا بیلکونی کا علم ہے
میں سمجھ پایا ہوں کہ ہماری روح جسم میں پنچرے کے طوطے کی طرح قید ہے روح
مجبوراً طوعاً

وکر ہا اس پنجرے میں رہتی ہے۔ طوطے کو قطعاً پروا نہیں کہ پنجرے پر کیا گزرتی ہے۔ یہ چاہے سونے کا ہو، اسے صرف اسی وقت آزادی میسر آسکتی ہے جب پنجرہ چھوڑ کر طوطے اپنے راستے جا نکلے۔ نہ پنجرے کو اس بات کی پریشانی ہوتی ہے کہ اس کی سلاخوں کے اندر ایک سر پٹکے تیلیوں سے ٹکرانے والی روح کون ہے، کیا ہے۔ نہ

ہی روح پٹ کر دیکھتی ہے کہ پنجرے پر کیا اور کیوں گزری۔

نئی ترقی کی تمام تر توجہ پنجرے پر ہے۔ اسے طوطے کی پرواہ نہیں۔ پنجرے کا ڈیزائن، رنگ و روغن، اس کے ارد گرد زیبائش، آسائش کا ہر ممکن فارمولا آج کی شوچ پر حاوی ہے۔۔۔۔ انسان اپنے جسم اور اس کی ضرورتوں میں اس درجہ لگن ہو گیا ہے کہ اسے اس جسم کی کوٹھڑی میں محبوب قیدی کی پرواہ نہیں رہی۔ کھانا۔ پہنا، اوڑھنا، بچھونا اب Priority میں مقدم ہیں۔ وہ جسم سے وابستہ ہو کر بازاروں کا رمتا جوگی بن گیا ہے۔ انڈسٹری، میڈیا، انٹرنیٹ، ہانگ ویل انسان کو اس کی ضروریات کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ اب خواہشات کو دہنا، مسابقت سے پرہیز کرنا فساد سے ہاتھ اٹھانا نئی ترقی کے گناہ ہیں تمام رشتے، اقدار، رسم و رواج، تہذیبی ذمہ لے، مذہبی احکامات منہ اٹھائے انسان سے علیحدہ علیحدہ گھومتے پھرتے ہیں جیسے گریب رشتہ دار گاؤں سے آکر شہری رشتہ داروں کے گھر قیام پذیر ہوں اور نہ جانتے ہوں کہ انہیں قیام جاری رکھنا ہے کہ واپس لوٹ جانا ہے۔۔۔۔۔ ان کا رشتہ اصلی ہے کہ جعلی۔ وہ ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں بھی کہ نہیں؟

نئی ترقی کے پاس وی بل ڈوزر ہے جو مذہبی باؤھوں کو اکھاڑتا پچھڑتا ہموار کرتا چلا جاتا ہے۔ صرف محنت کا عزم اور کام کی اخلاقیات کے رولز پکڑا کر اپنا راستہ سیدھا کر لیتا ہے اور نئی سڑکوں پر ہیومن رائٹس کی کوستار بچھا کر انسان کو جس قدر زیادہ مشینی اور وقت کا پابند بن سکے۔ بنا ڈالتا ہے۔ اس بل ڈوزر تلے کیا کچھ پس جاتا ہے اس کی پرواہ نہیں۔ اقدار، رسم و رواج، مذہب کے پھول اکھاڑ کر وہ گھاں گھاں کرتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

تھرڈ ورلڈ کے لوگ عام طور پر مسلمان ممالک خصوصی طور پر اپنی نالائقی پر بہت بسیماں ہیں۔ وہ ایٹم بم بنا کر بھی احساس کمتری سے چھٹکارا حاصل نہیں سکتے۔ جب ترقی کا حالیہ نسخہ ان کے ہاتھوں میں آتا ہے تو احساس ضرر وے وہ سٹ پٹا کر مسجد کی

طرف بھاگتے ہیں۔ جب نئی ترقی کا جن ان کے دروازہ پر دستک دیتا ہے تو وہ اسے وارنٹ سے کم نہیں سمجھتے۔ نیوٹن کے اصول کے تحت ترقی کا عمل رد عمل میں بدلتا ہے۔ پھر اسلامی تحریکیں چلتی ہیں۔ چاند تارے والے علم لہرائے جاتے ہیں۔ جہاد کا نعرہ لگتا ہے۔ مجاہدین کو دہشت گرد کا الزام سہنا پڑتا ہے۔ روحانی ترقی کے خواہشمند بنیاد پرست کہلاتے ہیں۔ خود ان ہی کے بھائی بند جو نئی ترقی کو انسان کی بلندی کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔ ادا بدار ایسے لوگوں کو جاہل، ان پڑھ، روایت پسند، لکیر کے فقیر سمجھ کر ان سے اپنی زندگی کا دھارا الگ کر لیتے ہیں۔ اغیار کی لعن طعن سے تو فلاح پسند لوگ دل برداشتہ نہیں ہوتے لیکن اپنوں کے الزام ان کے دلوں میں میصیبن بن کر گر جاتے ہیں۔

جہاد جو نماز کی طرح بنیادی ارکان میں سے ہے اسی جہاد کے لیے وہ اپنے لیے اور غیروں کے حضور تاویلیں پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور سمجھا نہیں پاتے کہ بنیادی ارکان انسان کی مرضی کے پابند نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ انہیں بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ پنجرے کے طوطے کو اڑنے سے پہلے آزاد نہیں کرا سکتے اور نئی ترقی کا دلدادہ سوائے پنجرے کے بیرونی ماحولیات کے اور کوئی علم نہیں رکھتا۔۔۔ اس کے لئے روزگار، جسمانی صحت، تعلیم، آزادی نسواں، پولیوشن، بنیادی ہیں۔ وہ جسمانی سہولتوں سے آگے ہر سفر کو خدائی سفر سمجھتا ہے۔

میں ہیلکونی کی کرسی کھسکا کر آگے نچگلے تک لے جاتا ہوں اس طرح میری ٹھوڑی جنگلے سے چھانچ کے فاصلے پر ہے۔ میں یونانی بڈھے کی ہیلکونی سے قریب ساٹھ فٹ دور ہوں نیچے گندی گاڑھ کھڑی ہے اور اس کے ورکر بڑی چابکدستی سے پلاسٹک کے تھیلے اٹھا اٹھا کر گند گاڑی میں ڈال رہے ہیں۔ سوچتا ہوں امریکی لوگ اپنے اپنی کام کو اتنی چستی سے کیسے کر لیتے ہیں؟ کیا سفید فارم لوگ قدرتی لوگ قدرتی طور پر رزق

حلال مانے کے شوقین ہیں؟ کیا ان کے مذہب نے انہیں سچائی سکھائی ہے؟

کہا وجہ ہے کہ پاکستان میں خصوصی طور پر اور عام طور پر سارے تھرڈ ورلڈ میں نظام نہیں چلتے؟

کیا ہمارے نظام کے اندر ہی کچھ ایسے بدیہی اور چھپے ہوئے پھندے ہیں جن میں انسان پھنس جاتا ہے؟ یا بنیادی طور پر ہماری فطرت نافرمان ہے؟

کیا رشوت، سفارش، دھاندلی کا تعلق ہماری تربیتوں کا نتیجہ ہے؟

کیا واقعی درست تربیت کے بغیر معاشرہ بنا کر ہم پر اگندہ حال ہوئے۔ امریکی ترقی کی دیوی کے پرستار ہیں تو اس دیوی نے انہیں مالا مال بھی کیا ہے۔ بہت غور سے

سوچنے کے بعد مجھ پر منکشف ہوا کہ امریکہ کو ڈاکوؤں نے بسایا تھا۔ ڈاکو کی کچھ

بنیادی خصوصیات دلیر، بہادر اور زبردستی ہیں وہ جب کسی چیز کو ہتھیانا چاہتا ہے تو اپنے

آپ کو سیدہ زوری پر ابھارنا اس کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ امریکہ کو جب سڑکیں بنانے

، جنگل کاٹنے اور اشیاء کی بھرمار کرنے کی ضرورت تھی اس نے جال ڈال کر نیگرو لوگوں

کو ہتھیا کر جہازوں میں لاوا اور امریکہ کی سرزمین پر سرگرداں پھینک دیا۔ جب

امریکی لوگوں کو اس سرزمین پر قابض ہونے کی خواہش نے ستایا تو ریڈ انڈین کو امریکی

تاریکین نے چن چن کر ختم کیا۔ جب انہیں انگریزی زبان لوٹنے کی ضرورت پیش آئی

تو انگریز علم یو ایچ ایف کہ اس کا لب و لہجہ، حروف کے لہجہ اور slang کا اضافہ کر کے

ایک ایسی زبان ایجاد کی کہ انگریز بھی اس اجنبی انگریزی سے سشدر رہ گئے۔ امریکی

ڈاکو اگر ترس ہو تو رابن ہڈ کہلاتا ہے۔ اگر عام ڈاکو ہو تو اس کو جس نہس کرنے والا

دہشت گرد کہا جاتا ہے۔ اسے آپ جرٹومہ کا کرشمہ کہیں یا پرکھوں کے رسم و رواج کی

پرہی یا امریکی مزاج کی خوبی لیکن یہ بات واضح ہے کہ کسی خطہ کے بسنے والوں کی عام

سائنس ایک ہی ہوتی ہے۔ ہمیشہ اور قیصر دونوں مسلسل گھنٹی بجا رہے ہیں۔ ان کو

خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میں ساری سوچوں کو کرسی پر رکھ کر اندر بھاگتا ہوں۔

ارجمند ایک یہودی امریکن ڈاکٹر کی Reseptionist ہے جو بظاہر نہت لبرل آدمی ہے، لیکن صبح روانگی کے وقت ارجمند کے چہرے پر ایسا ملال ہوتا ہے جس کا کوئی نام نہیں۔۔۔۔۔ جو صرف اسی وقت چہرے پر آتا ہے جن کوئی شخص آپ کو نہ سمجھے اور آپ کو کمتر جانے۔ ارجمند بروقت پہنچنا چاہتی ہے لیکن عموماً بچے اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ گھر

سے نکلتے ہی آوازوں میں بدل جاتی ہے اور ارجمند نہیں رہتی۔ وہ یہودی امریکن ڈاکٹر کے خوف سے ناشتہ نہیں کھاتی، ہاتھ میں سینڈوچ رکھتی ہے اور ڈرائیو کرتے ہوئے کھاتی جاتی ہے۔ راستے میں ہی بال بھی برش کرتی ہے اور کار کے آئینے میں دیکھ کر لپسٹک لگاتی ہے۔

برصغیر تفرقے پر چلتا ہے۔ یہاں صدیوں سے پیشوں کے اعتبار سے ذات پات نے لوگوں کو بانٹ رکھا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد امید کی جاتی تھی کہ لوگ بھائی چارہ اپنائیں گے اور پاکستانی معاشرہ اسلام کے بنیادی اصول مساوات کا مظہر ہو سکے گا۔ لیکن بد قسمتی سے پاکستانی لوگوں کا خمیر ان لوگوں سے اٹھا ہے جو اونچ نیچ کو رو رکھتے ہیں۔ اسی لیے یہاں کئی قسم کے تفرقات نے سر اٹھایا۔ لسانی، جغرافیائی، نسلی، تعلیمی، خواتین کی آزادی، رسم و رواج کے تغیرات، ذات پات کی اونچ نیچ، مذہبی یوٹلمونی، طبقاتی نزاع ان سب نے مساوات کے بنیادی اصول کو اپنا نہیں سکا، اسی لیے یہاں کے معاشرے کی شناخت اختلاف، تفرقہ اور اونچ نیچ میں منج ہوئی اور امریکہ ڈاکو کی ذہنیت کو اپنے جڑومہ میں چھپائے پھرتا ہے۔ امریکی اب بھی ڈاکو کی

جملہ خوبیوں اور خوبیوں سے مرصع ہے۔ جب چاہے دشنام دے۔ جب جی آمادہ ہو خلعت بخش دے اللہ اللہ خیر صلاح۔

ارجمند جب گھر سے نکلتی ہے تو دونوں بچے ساتھ ہوتے ہیں۔ آوازیں آتی ہیں۔

”قیصر I am getting late.....get quick“

”سیندوچ رستہ میں کھانا کم آن۔۔۔۔۔“

”جشید یوفول۔۔۔۔۔ اب کیا ہوا ہے؟۔۔۔۔۔“

”میں نے گاڑی آن کر دی ہے۔۔۔ I can,t wait any more“

”اگر تم لوگ دو منٹ میں نہ آئے تو میں تمہیں چھوڑ جاؤں گی۔۔۔۔۔“

”This is hell.....“

یہ آوازیں بچوں کے لود ہونے تک آتی رہتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے ان کے اند پر وگرام ہو جاتی ہیں۔۔۔ ایک روز میں نے ارجمند سے ڈرتے ڈرتے کہا۔۔۔۔۔

”تم اس قدر پریشان جو ہوتی ہو تو نوکری چھوڑ دو ناں۔۔۔۔۔“

”ہیں آپ کہا کہہ رہے ہیں۔ یہی نوکری تو میری اپنی ہے۔۔۔۔۔ باقی میرے

پاس اپنا کیا ہے؟“ انسان کے پاس اپنا ضرور کچھ ہونا چاہیے، ابا چاہے ہتھوڑی کا دستہ ہی کیوں نہ ہو۔

”کتنے پینے ملتے ہیں تمہیں؟“

”ہزار ڈالر۔۔۔۔۔“

”تو کیا تمہیں ہلال کافی رقم نہیں دیتا۔۔۔۔۔“

”پیسے تو بہت دیتے ہیں، لیکن یہ ایک ہزار میرے پاس میرے اپنے ہیں۔ میری

اپنی مائی ان دس انگلیوں کی، مجھے ان پیسوں سے آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ انہیں

میں جہاں چاہوں خرچوں۔“

”میرے اپنے سے کیا مراد ہے؟“

”ان کا جو کچھ مرضی میں کروں۔ میں ان کے لئے Accountable نہیں

ہوں۔“

”ارجمند۔۔۔۔۔ یہ تمہاری زندگی ہے اس کے سارے فیصلے تمہارے ہونے

چاہئیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم جمشید اور قیصر کے لئے بھی جواب دہ

ہو۔۔۔۔۔ وہاں تمہاری مرضی نہیں چل سکتی۔“

”تو میں ان کی ساری ڈیوٹی دیتی ہوں ابو۔۔۔ سارے کام میرے ذمہ

ہیں۔ بلال تو واپسی پر صرف فٹ بال کا میچ ٹیلی ویژن پر دیکھتا ہے۔۔۔۔۔ کھانا کھاتا

ہے اور سو جاتا ہے روٹیاں sleeping full toss....eating“

”اور ویک ایجنڈ پر تمہیں اور بچوں کو تفریح کے لئے شہر سے دور لے جاتا ہے

۔۔۔۔۔ دودھ کی بھاری بوتلیں، آٹے کی تھیلے ساری گرمیز لاتا ہے۔ پھر جگہ جگہ رکھتا

ہے اور ایپرن لگا کر برتن دھوتا ہے۔ ملازم منڈو کی طرح اور سارے کپڑے استری کرتا

ہے تمہارے اور بچوں کے Vacuum.... کرتا ہے سنڈے کو۔“

”ابو ایک بات بتائیں۔۔۔۔۔“

میں سر میں انگلی پھیر کر پوچھتا ہوں۔۔۔۔۔ ”کیا؟ کیا بات بتاؤں۔“

”آپ میرے ابو ہیں کہ بلال کے؟۔۔۔۔۔ آپ کو مجھ سے محبت ہے کہ بلال

سے۔“

میں اس کی بات کا جواب نہیں دے سکتا، کیونکہ مجھے بلال پر ترس آتا

ہے۔ ارجمند سے مجھے پیار ہے، لیکن ارجمند کے رویے میں کچھ ایسی بد لحاظی یا دیانت

داری ہے کہ اگر میں بلال کی جگہ ہوتا تو شاید برداشت نہ کر سکتا۔ ارجمند ہر معاملے میں

اس قدر برابری کی خواہاں ہے کہ اگر اس کا بس چلتا تو جھشید کی پیدائش کا ضامن بدل ہوتا اور قیصر کو وہ جہنم دے لیتی۔ نہ وہ حیاتیاتی فرق سمجھتی ہے نہ ہی اسے مرد اور عورت کے جداگانہ رولز کی سوجھ بوجھ ہے۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔ آپ کو مجھ سے محبت ہے کہ بلال سے۔“
 ”ابو تو میں آپ کا ہی ہو۔ محبت بھی تم ہی سے ہے۔۔۔ لیکن میرے خیال میں بلال مظلوم ہے۔“

”ہر وہ آدمی جو Male Chauvanism میں یقین رکھتا ہے ایسے ہی سمجھتا ہے ابو کہ مرد مظلوم ہے اور عورت اباپے سے باہر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ یہ عورت سے بے انصافی ہے۔ سراسر بے انصافی۔ عورت سوجو تیاں بھی کھا رہی ہے اور سو پیاز بھی۔“
 ”لیکن اپنی مرضی سے اپنی چوائس سے“ میں عرض کرتا ہوں۔

”آپ کی شوچ تیزھی ہے ابو۔۔۔۔۔ پلیز سیدھا سوچنا شروع کریں۔۔۔۔۔ وقت بدل چکا ہے۔ اب پتہ اور دھات کا زمانہ نہیں۔“

”یقیناً یہ میڈیا، رفتار اور اشیا کا زمانہ ہے۔۔۔۔۔ لیکن اندر ایک روح جدید نہیں ہو سکا۔ بد قسمتی سے وہ گوشت پوست کا بنا ہے۔۔۔۔۔ اس کے اندر ایک روح بھی ہے جو اتنی پرانی ہے۔۔۔۔۔ اتنی پوانی ہے جتنا انسان خود۔۔۔۔۔ اس روح کے سوالات بھی پرانے ہیں اور جواب بھی وہی چلے آتے ہیں۔“

”ابو یہ بحث اب اس زمانے میں لاگو نہیں رہی۔۔۔۔۔ خدا کے لئے اپنی شوچ بدلیں۔ پرانی جہالت چھوڑ دیں چھوڑ دیں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ یہ بناؤ تم خوش ہو اور جھند؟“ میں نے سوال کیا۔

وہ چند لمحے چپ رہی پھر بولی۔۔۔۔۔ ”پتہ نہیں؟“

”کیوں؟۔۔۔۔۔۔۔“

”اگر تم جیسے روشن دماغ یہاں بیٹھے رہے تو وہاں کیسے ترقی ہوگی ارجمند

۔۔۔۔۔ بیک ہوم لوگ کیسے بدلیں گے؟“ میں خواہ مخواہ کہتا ہوں۔“

”مجھے معاف کریں ابو، ہم اس دنیا میں سوشل ورک کے لیے نہیں

آئے۔۔۔ ایک زندگی ہے اسے ہم انجوائے کو سکتے ہیں تو کیوں نہ کریں۔ جب ہم

چیزیں Afford کر سکتے ہیں کیوں نہ خریدیں۔ جب ہم بہتر معیار زندگی اپنا سکتے

ہیں تو کیوں نہ اپنائیں ابو۔۔۔۔۔ زندگی صرف ایک بار ہے۔۔۔۔۔“

”ہاں بیٹی باہر بادشاہ بھی یہی کہتا تھا کہ باہر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ

نہیست۔۔۔۔۔ مسلمان ہو کر اسے مابعد پر یقین نہیں تھا۔۔۔۔۔“ میں یہ بات ارجمند کو

دل میں کہتا ہوں۔ با آواز بلند کچھ بھی کہنے کی جرات نہیں کر سکتا کیونکہ ایک بار جب

اولاد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی ہے تو ماں باپ ان بیساکھیوں کا سہارا نہیں لے

سکتے۔

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ دنیاوی ترقی کی یہ Epicurian فلاسفی مجھے آگے

بولنے نہیں دیتی۔ یہ انداز فکر روز ازل سے چلتا چلا تا یہاں تک پہنچا ہے۔ اماں حوائے

بھی ممنوعہ کا ذائقہ چکھنے کی ترغیب دی تھی تو مقصد صرف فیصلے کی آزادی اور ذاتی خوشی کا

حصول تھا۔

میں ارجمند کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا۔۔۔۔۔ وہ تیز چلتی ہے۔ اس کی بات

میں قطعیت ہوتی ہے۔ وہ اس قدر خود اعتماد ہے کہ ارد گرد کیا کچھ ٹوٹ جاتا ہے اس کی

ارجمند کو پرواہ نہیں۔ جس طرح وہ اپنے یہودی ڈاکٹر سے ڈرتے ہیں، ایسے ہی میں بھی

اس کے اندر کی کڑھکی سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ میں موضوع بدل کر کہتا ہوں۔

”اس بار ویک ایجنڈ پر کیا پروگرام ہے؟“

”اس بار ہم واشنگٹن ڈی سی جائیں گے۔ وہاں ٹریڈ منسٹر ٹار صاحب سے ملیں

گے۔“

”نثار کون سا نثار۔۔۔۔۔“ میرے اندر خسرے کی گھنٹیاں بجتے لگتی ہیں۔

نہ جانے یہ نام میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔

چالیس سال سے یہ ٹینس پلیمیر گریگوری پک جیسا حسین، بڑا اونچا بیور کریٹ میرے ساتھ ساتھ ہے۔ میں نے اسے دیکھا نہیں، لیکن میرے اندر اس کی شبیہ بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہے۔ میں محسوس کے تعویذ کو گلے سے اتار کر پھینک نہیں سکتا۔

”نثار صاحب کی بیوی کا کیا نام ہے؟“

”اقبال نام ہے لیکن انکل کچھ اور بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ اقبال نام عورتوں

پر بجاتا نہیں۔۔۔۔۔ اقبال مردوں کا نام ہے۔“

”کیا بتاتے ہیں انکل نثار۔۔۔۔۔ اقبال کو؟“

’جاناں۔۔۔۔۔‘ ارجمند ہنستی ہے

شاید وہ سمجھتی ہے میری عمر کے آدمی کو یہ لفظ استعمال کرنا تو دور سننا بھی نہیں

چاہیے۔

پتہ نہیں کیوں مجھے غصہ سا آگیا۔ بھلا ٹریڈ منسٹر نثار اقبال کو جاناں کہنے والا کون

ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔

بڑی پرانی یادیں تیز آمدھی بن کر مجھے اڑائے پھرتی ہیں اور میری یادداشت میں

گھپلے پڑنے لگتے ہیں کبھی لگتا ہے ماضی آج زندہ ہے۔ کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کبھی کچھ تھا

ہی نہیں۔ بس ایک خواہش کی خوشبو تھی جس نے ساری یادوں کو مہکا رکھا

ہے۔۔۔۔۔ اتنے سارے غصے کی وجہ سے مجھے پتہ نہیں چلتا ارجمند کیا کہتی رہی اور کس

وقت اٹھ کر چلی گئی۔

بوڑھے آدمی کے پاس ویسے بھی کون بیٹھنا چاہتا ہے؟ اور پھر بوڑھے آدمی کے

پاس سوچوں کے علاوہ ہوتا بھی کیا ہے؟

امریکہ آنے سے پہلے مجھے اپنی یادداشت کے متعلق کچھ ایسے شبہات نہ تھے۔ آئینے میں صورت دیکھنے کے باوجود سارے بال سفید ہو جانے کے باوصف مجھے شبہ نہ تھا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ مجھے کتابی علم تھا کہ ارجنڈ چالیس کی ہو چکی ہے۔ اخبار میں کبھی کبھی کسی پرانے ساتھی سے چھٹم چھٹا ہو جاتا۔ مسجد سے بھی ایسے ناموں کی موت کا اعلان ہوتا رہتا جن سے واقفیت تھی اور جن کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے مووی صاحب بلا رہے تھے۔ چلتے چلتے لوگ پچھڑتے جا رہے تھے۔ اب زیادہ تر ہسپتال، عیادت اور مرگ کی رسومات میں جانے کا اتفاق ہوتا۔ لیکن خود مجھے اپنے مرنے کا احساس تو درکنار بوڑھے ہونے کی بھی اطلاع نہ ہوئی۔ میں ہمیشہ اندر کے موسم بہار کی رت کا اندازہ لگاتا آیا ہوں۔۔۔۔ اور اند کی رت نے مجھے زیادہ تر بہار کا ہی سندیسہ دیا۔

میری جیب میں امریکہ کا ٹکٹ تھا اور ہاتھوں میں وہ اخبار تھا جس میں خبر چھپی تھی کہ ڈاکا انتقال ہو گیا۔ ابھی اسی فیڈرل سیریٹری فنانس سے ریٹائر ہوئے دو چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ اچانک وہ ہارٹ اٹیک سے چل بسا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرے دل نے یہ جاننے میں جلدی کی کہ ہونہ ہو یہ وہی ڈاکا تھا جس سے اقبال کی شادی ہوئی۔ خبر پڑھ کر دل کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ اقبال تو سرکاری افسر کے ساتھ گھونگھٹ نکال چلی گئی۔ میں ہال روڈ کی دوکان پر ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ مرمت کرنے والی دوکان میں رگید گیا۔ میری آمد ڈاکا سے بہت زیادہ تھی، لیکن اس کا سٹینڈس مجھ سے کہیں بہتر تھا۔ اب میری عمر میں سوچ کسی خاص سمت پر رک رک کر تصویر بدلتے رہنے کا عمل بوڑھے کے دماغ پر دوس کو بیان کر سکتا ہے۔ بوڑھا بندر کی طرح کبھی ایک شاخ پر کبھی دوری پر چھانگ لگاتا ہے۔ وہ عموماً اپنی یادداشت کے ہاتھوں گولمگول کے عالم میں رہتا ہے قوت فیصلہ کا یہ عالم رہتا ہے کہ میری طرح اسے کئی بار امریکہ کی

نکلت بدلوانا پڑتی ہے۔ اس روز جب میں لاکروں کے سامنے کھڑا تھا میرا ایک ہی سوچ تھی۔ انتقال کی خبر پڑھ کر میں سوچنے لگا کیا اقبال اسی خبر والے ٹارک بھائی تھی۔ وہ شخص جو ہارٹ اٹیک سے فوت ہوا جس کو میں تو اس اخبار کی سرخی کے ساتھ دفن کر چکا تھا۔ یہ نیا ٹارار جمنڈ والا کون کون تھا؟ کیا وہ ہماری اقبال کا شوہر بھی تھا۔ ارجمند نے ٹریڈ منسٹر کا شوہر چھوڑ کر مجھے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر متذبذب میں ڈال دیا۔

کیا قابل کا شوہر ٹریڈ منسٹر کے روپ میں زندہ ہے؟
 کیا اقبال اس ٹارک بھائی جس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی اور جس اخبار کو لے کر میں امریکہ آنے سے پہلے بنک گیا تھا اور اس کی موت پر خوش تھا۔ آج ان دونوں ٹاروں نے مجھے ہلکان کر دیا۔ اس روز اخبار پڑھ کر میں مطمئن تھا کہ اقبال کا شوہر فوت ہو گیا۔ آج ارجمند نے اچانک ٹریڈ منسٹر کی Efigy پیش کر کے مجھے حیران کر دیا۔

میں نے مرحومہ اصغری کے زیورات کے ساتھ کچھ ڈالر بھی ایک منی ایکسچینجر سے لے کر چھپائے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا کہ کل کتنے ڈالر لاکر میں ہیں۔ سارا زیور کتنی مالیت کا ہے

اس بینک کے لاکر تہہ خانے میں تھے۔ تہہ خانے میں ان ڈور پلانٹر کے باوجود ٹھہری ٹھہری بوسیدہ سی ہوا تھی۔ ایک جانب پرانے ریکارڈوں کو تھیلوں، بوریوں میں بند کر کے ڈھیر لگا رکھا تھا۔ لوہے کی ایک میز پر آٹومینک نیون کی بتی دھری تھی۔ جونہی بجلی جاتی وہ جل اٹھتی۔۔۔ میں میٹریاں اتر کر نیچے پہنچا تو لاکر زاور پر مٹ کرنے والی نوجوان خاتون کمپیوٹر میں مگن تھی۔۔۔ کمپیوٹر میرے علم کی حدود سے باہر ہے۔ یہ وہ انفرمیشن اگلوٹنے والا آلہ ہے۔ جس نے ہماری پود اور نئی صدیوں کا فاصلہ پیدا کر دیا

اور اس کی انفرمیشن نے جگہ جگہ مغائرت اور غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

”سام علیکم“ میں نے لجاجت سے کہا۔۔۔ بوڑھے آدمی میں یہ احساس قابل ترس ہے کہ وہ Welcome نہیں۔ وہ نرمی، وہ اچھے آداب اور باسی مسکراہٹ کے ہتھیاروں کی مدد سے تازگی پروار کرتا ہے۔ مس سر کے اثرے سے جواب دے کر کمپیوٹر کے بٹن دباتی رہتی ہے۔

”مس مجھے اپنا لا کر اوپر بیٹ کرنا تھا“ میں خوشامد سے کہا

مس ہرگز مس نہ تھی۔ وہ بھرے جسم کی عورت تھی۔ جس کے کندھے، گردن اور سینہ صحت اور اعتماد کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اس نے دراز سے ماسٹر چابیوں کا گچھا نکالا۔ رجسٹر میں تاریخ اور وقت کا خانہ پر کر کے سائن کرنے کے لیے رجسٹری میری جانب بڑھا دیا۔۔۔ میں نے جلدی سے دستخط کئے۔ وہ ترنت پھرنٹ لکڑی کی ہیلوں والی جوتی ٹکڑی لاکروں تک جا پہنچی۔

دستخط کرنے کے بعد میں نے دماغ پر زور دیا لیکن مجھے اپنے لا کر کا نمبر بھول چکا تھا، اس سے پہلے بھی بھول چوک کا تھوڑا بہت سلسلہ جاری رہا تھا۔ لیکن یوں میری خجالت کا باعث نہ ہوا تھا۔ مجھے پہلی بار خیال آیا کہ شاید میں بوڑھا ہو چکا ہوں یا ہو رہا ہوں یا ہو سکتا ہوں۔ میں شرمندہ شرمندہ اس کے پیچھے گیا۔

”سینیے مس۔۔۔“

پلی پلائی عورت مس کا لفظ سن کر مسکرا کے پلٹی۔

”جی انکل۔۔۔؟“

انکل کا لفظ چھوٹے بچے میرے لیے استعمال کرتے رہتے تھے۔ لیکن یہ پہلی بار تھی کہ اتنی بڑی عمر کی خاتون نے انکل کہہ کر مجھے بوڑھا ثابت کیا۔

”میں اپنے لا کر کا نمبر بھول گیا ہوں“

”اچھا تو سب اپنی چابی تو ساتھ لائے ہیں ناں“ مس نے پوچھا۔۔۔

”جی جی ... چابی تو میری کاروائی چابی کے چھلے میں ہے ...“ میں نے چھلے کو

جیب سے نکالتے ہوئے کہا

”آپ لا کر پہنچان تو لیں گے ناں ...؟“ وہ مسکرائی۔

”ہاں ... شاید پہنچان لوں گا ...“ مجھے یقین نہ تھا۔

اب میرے اندر ایک خاص قسم کی سٹپناہٹ شروع ہو گئی تھی جیسے ریس سے پہلے

کھلاڑیوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہے ... سامنے لا کر زکی الماریاں بائکل چپ کھڑی

میرے حافطے کے لوٹ آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

”کوئی بات نہیں انکل۔ آپ کی اتج میں کئی لوگ لا کر ز کے نمبر بھول جاتے

ہیں۔ میں نے دماغ پر بہت زور دے کر تین سو پچتر نمبر کے لا کر کو ہاتھ لگایا ... مس

نے اپنی ماسٹر چابی گھمائی۔ پھر میں نے اپنی چابی اس میں فٹ کی۔ گھمایا لیکن لا کرنے

کھلا۔ میرے پاؤں میں ہلکا ہلکا پسینہ آ گیا ... اور یکدم چکر سا محسوس ہوا۔

”شاید 377 نمبر ہو ... مجھے یاد پڑتا ہے ...“

”ضرور ضرور ٹرائی کر لیتے ہیں“

اس بار ہم دونوں کی چابیاں لگنے سے لا کر کھل گیا ...

”دیکھیے انکل آپ اپنی چابی کے ساتھ اور اس لا کر پر کوئی سکر لگائیں۔ نشانی

رہے گی۔ پتہ ہے انکل یہ آپ دیکھیے ناں کتنے لوگوں نے سکر زگار کھے ہیں۔

کچھ لوگ تو وطن سے باہر ہیں۔ ان کے لا کر ز تو برسوں سے Operate ہی

نہیں ہوئے انکل ... پتہ نہیں واپسی پر ان لا کروں کو کیسے پہچانیں گے“

مس مجھے تھوڑی سی ڈانٹ اور ہلکی سی تسلی دے کر چلی گئی ...

یادداشت کی سلیٹ یوں صاف ہو جانے کا یہ پہلا دھچکا لگا۔

میں نے لا کر کھول کر اپنی جمع بھرتہ نکالی۔ انعامی بانڈز گئے، قومی بچت میں لگائی

رقم کا پڑتا لگایا، ڈالروں والا لفافہ نکال کر ڈال کر گئے۔ کانڈرات میں دفن دولت کا شمار کرنے ک بعد میری نظر پلاسٹک کے ایک لمبو ترے نیلے ڈبے پر پڑی۔ اس کے ساتھ ایک چاکلیٹ کا ڈبہ بھی مومی لفافے میں لپٹا پڑا تھا ان دونوں کو میں نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میں نے صرف پلاسٹک کا نیلا ڈبہ نکالا اور اپنی بہو کا زیور چاکلیٹی ڈبہ وہیں رہنے دیا۔ ہم دونوں کالا کر سنا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میری بہو مجھ پر اعتد رکھتی تھی، بلکہ اس لیے کہ اگر مجھے کوئی ہرج مرج ہو جائے تو وہ سانجھا لاکر ہونے کے باعث اس لاکر کو اوپر بیٹ کر سکیں۔ اپنے ارادے کو شفاف بنانے کے لیے اس نے مجھ پر اعتماد کرنے کو مستاسودا سمجھا۔۔۔

میرے دل نے نیلا ڈبہ نکالتے وقت کہا۔۔۔ ”جناب ہمایوں صاحب! اگر آپ امریکہ میں فوت ہو گئے یا واپسی پر آپ کا دماغ جیلی فش بن گیا تو اس نیلے ڈبے کا کیا بنے گا۔؟“

جیتے جی میں اصغری کا زیور کسی دینا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ کندن کے سیٹ، نورتنوں کے لمبے ہا، چوڑیاں کڑے، لمبے لمبے مگر۔۔۔ میں نے ارادہ کیا کہ یہ سب کچھ میں ارجمند کے لیے لے جاؤں گا۔۔۔ میں اسے ڈکلیئر کیے بغیر بیجانے کی کوشش کروں گا۔۔۔ اگر پکڑا گیا تو زیور بھی گیا اور نیک نامی بھی۔۔۔

لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے ارادہ پختہ کر لیا کہ یہ نیلا ڈبہ لا کر ہی میں رہ گیا تو میرے بعد کس کام آئے گا۔۔۔ میں اس کا کیا بنا لوں گا؟۔۔۔ اقبال تک تو پہنچنے سے رہا۔

ہر ملک میں اپنے ہی تو ہمت ہوتے ہیں اور تعلیم یافتہ ہو کر بھی سائنسی ترقی کے باوجود یہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ نیگرو لوگوں کا اعتقاد ہے کہ آنگن میں اگر سفید چوزا گھومتا پھرتا ہو تو بدروحیں وہاں نہیں آتیں۔ برصغیر میں کالی بلی اگر راستہ الاٹک جائے تو کام

اڑچن پڑ جاتی ہے۔ کوامنڈیر پر کائیں کائیں کرتے من چاہا مہمان آتا ہے۔ بھونرا گھر کے اندر داخل ہو تو اچھی خبر ملتی ہے۔ چلتے پھرتے میں چھپکلی چھت سے آپ کے بدن پر گر جائے تو ترقی ملتی ہے۔ ایسی ہی اس روز بھونرا ارجمند کے گھر میں اڑتا پھرا تو مجھے لگا میں اقبال سے دور نہیں ہوں۔ شاید میں اسے ٹریڈ منسٹر کے گھر میں مل سکوں۔

لیکن شہری زندگی بالکل مختلف ہے۔ شہد کے چھتے کی طرح ہر لمحہ منظر بدلتا چلا جاتا ہے۔ شہری ترقی کا ایک گن یہ بھی ہے کہ اس میں عام شہری دیر پا، بہت سوچ بچار کے بعد فیصلے نہیں کرتے۔ عام طور پر امریکی لوگ ترقی کا سہل ہیں۔ 'ویتی Impulse' پر فیصلہ کرتے ہیں۔ جذبات کے چڑھاؤ کے بعد اس کے اتار کے متعلق ان کو کوئی فکر نہیں ہوتا۔ تھوڑی دیر کے لیے بہت Involve ہو سکتے ہیں۔ جی چاہا چندہ دے دیا۔ من میں خواہش اٹھی تو ماں سے ملنے چلے گئے۔ باپ کے لیے تنگہ خرید لیا۔ وہ وفا کا جج سینے پر لگا کر ہمیشہ کا دروہ نہیں پال سکتے۔ ماں باپ کی مستقل دروہ، بک بک، جھک جھک، صبح و شام کے اختلافات ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ بچے کو کئی سال کو لہے پر چڑھا کر پرورش کرنا ان کو پر ملال کرتا ہے۔ اپنی Impulsive نیکی کے ہاتھوں وہ بوڑھے گھر گھر Shelters Day care Centres بنا سکتے ہیں۔ اپنے گھروں میں کسی شخص کی مستقل بک بک جھک جھک برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں لیکن ہمیشہ کیلئے جذبات کے تابع نہیں رہ سکتے۔ ... جہاں عمل تو اتر آیا یکسانیت پیدا ہوئی۔ ... امریکی باشندہ بور ہو کر راستہ بدل جاتا ہے۔ اسے یا تو بریک درکار ہوتی ہے یا علیحدگی!

داوا زمین سے وابستہ کسان تھا۔ اسے دھرتی ماں سے بھی پیاری تھی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر آ تو گیا لیکن اپنی زمین کے بغیر زیادہ عرصے تک جی نہ سکا۔ اندر ہی اندر اسے

گاؤں کے گھر، وٹ بے، کنویں، شہتوت اور لوکاٹ کی جھنگلی، پکی سڑک تلجانے وال کچا رستہ کھلے میدان، ہرے بھرے کھیت، گلی ڈنڈ اکھیلے بچے، یکے پر آتی جاتی سواریاں، لسی کے ڈول مکھن بھرے سور کے کٹورے یاد آتے رہے۔۔۔۔ دادا گلی میں چار پانی ڈال کر نہ جانے کس کس بات کو کن زایوں سے یاد کرتا رہتا۔ اس گلی میں زیادہ تر سفید رو، کشمیری اور مغل پٹھان گھرانے آباد تھے۔ گلی میں آتے جاتے لوگ دادا کی عمر کا لحاظ تو کرتے اور سلام دعا کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔۔۔۔ لیکن ان کا بھی جی چاہتا کہ دادا اندر جا کر نہالیں، خاص کر گرمیوں میں جب دادا پگڑی سے لے کر زری کی جوتی تک پسینے میں نہایا نظر آتا۔ لوگوں کی یہ خواہش شدید تر ہو جاتی۔ اس گلی کے سفید باسی دادا کے رنگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔

دادا سمجھ نہ سکتا کہ وہ ہندوؤں کو تو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ یہ تعصبات کی گٹھڑی کون ساتھ اٹھا کر لے آیا۔ چار ورن تو مسلمانوں میں بھی موجود تھے۔ تو پھر دھرتی کو چھوڑنے کا فائدہ کیا ہوا۔۔۔۔؟ اپنے دل کا میل ہی نہ کٹ تو فائدہ؟

مہاراج ادھیراج شہنشاہ محمد جلال الدین اکبر نے بھی دین الہی بنا کر ایک کوشش کی تھی کہ تعصب چھوڑ کر دوسروں کو جینے کا براہِ حق دیا جائے۔ ایسی ہی کوشش امریکہ بھی کرتا چلا جا رہا ہے۔ اقلیتیں چونکہ انکی معیشت کی ضرورت ہیں اور ان قلیتوں کے بغیر امریکہ کی خوش حالی آگے نہیں بڑھ سکتی، اس لیے وہ ہر ممکن طریق سے اکثریت کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقلیت کو راضی رکھو۔ اس کم اجر قی محنتی طبقے کے بغیر ہم ساری دنیا پر راج نہیں کر سکتے۔ دین الہی کی طرح وہ ہیومن رائٹس کا چارٹر پیش کرتے ہیں لیکن امریکن اس Eyewash سے اپنے ملک کے Racists کو مطمئن نہیں کر سیت۔ وہ سمجھ نہیں پاتے کہ تعصب قلب کی بیماری ہے اور جب تک انسان خود اپنے مسلک کا شیدائی نہ ہو اور دوسروں کو بھی اپنی طرح مختلف راستے کا پکا راہرو نہ سمجھے بات نہیں بنتی، فقط لبرل ہونے سے کام نہیں بن سکتا۔ ہر لبرل آدمی پہلے

اپنا راستہ چھوڑتا ہے اور پھر کسی اور کے راستے کو درست سمجھتا ہے۔ اس کے پاس نہ اپنی
 اقدار باقی رہتی ہیں نہ کسی اور کی اقدار کی وہ عزت کر سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی
 نہیں کہ انسان بے رنگ ہو بلکہ سمجھنا یہ پڑے گا کہ ہر رنگ کی اپنی شان ہے۔ اپنا
 مسلک چھوڑ نہیں اور کسی کا مسلک چھیڑ نہیں، ٹھیک مقولہ ہے۔۔۔ یہاں تک شاید اسی
 وقت پہنچا جاسکتا ہے جب لوگ آخری خطبہ سمجھ پائیں گے۔ کسی کو حیلے بہانے بری
 نیت سے برابر نہیں کرنا۔۔۔ اس کے اور اپنے باہمی فرق کے آگے صرف اس لیے
 سر جھکانا ہے کہ یہ نبی کا فرمان ہے۔ ہماری گوری دادی نے کالے دادا کو کبھی برابر نہ
 سمجھا۔ دادی گوری چٹی انگریزوں سی تھی۔ میرا دادا کالا شاہ کالا تھا۔ جب پاکستان
 پہنچے تو ہماری عمریں تجزیے کی نہ تھیں۔ اہم واقعات پر ہم ہنس دیا کرتے تھے یا ان کا
 مذاق بنا کر ایک دوسرے کو چھیڑا کرتے تھے۔ اس زمانے میں شادیاں طے کرتے
 وقت مردوں کی صرف مائیاں دیکھی جاتی تھیں۔ اس لیے دادا کو کسی نے جسمانی طور
 پر نہیں دیکھا پرکھا نہیں اور گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی بیاہ دی۔ نتیجے
 میں میرے دادا کی اواہوئی برڈ تھی۔ چاچا صد گورے تھے۔ میرا بابا پور دونوں
 پھوپھیاں سانولی مائل کالی تھیں اور ان کی شادیاں کرنے میں دادی کو کافی مشکلات
 پیش آئی تھیں۔ لیکن یہ قیام پاکستان سے پہلے کے رگڑے جھگڑے تھے۔ ہمیں تو دادا
 کیساتھ پاکستان میں رہنے کا تجربہ بھی کچھ خاص نہیں تھا۔ ہم دادا کو دادی کی آنکھ
 سے دیکھتے تھے کیونکہ دادی ہماری آنکھ کا تار تھی۔ بوڑھی کبڑی سفید بالوں والی میم
 سی دادی۔۔۔

وہ عام طور پر دادا سے کہتی۔۔۔ ”ہائے ہائے نہا لیں۔۔۔۔۔“

داد مجھوب سی نظروں سے دادی کو دیکھ کر جواب دیتا۔۔۔ ”بھلی لوک نہا کر ہی تو

رہا ہوں۔۔۔۔“

”منہ تو رگڑ کر دھولیا کریں۔“

”وہ بھی رگڑا تھا۔ دانت بھی مانجھ لیے تھے“

”اچھا ...“ دادی منہ پرے کر کے دادا کو نظر انداز کر دیتی۔

ہم پانچویں بہن بھائیوں میں سے شاہد بھائی اور فریدہ کا رنگ گندمی مائل سانولاتا۔ دادی گوری چٹی بہو لا کر بھی دادے کے تمام کالے جڑوے پوتے پوتیوں میں سے نکال نہ سکی تھی۔

ہم سب میں دادی کا لطیفہ زبان زد تھا۔ جب بھی موقع ملتا، رفعت آپا یہ شاہد بھائی سے کہتی ... ”نہالینا تھا شاہد ...“

”نہا کر تو آرہا ہوں ...“

”منہ تو رگڑ کر دھولیا کریں بادشاہو ...“

ہم سب ہنسنے لگتے۔ ابھی ہمیں علم نہ تھا کہ دل جیسی نازک چیز کتنی معمولی باتوں سے دکھ جاتا ہے۔ ہم بہن بھائیوں کو ایک دوسرے کی محبت پر اتنا اعتماد تھا کہ ہمیں کبھی خیال ہی نہ آیا کہ شاہد بھائی واقعی سانولے ہیں۔

اقبال بھی شاہد بھائی کی طرف اسی لیے آمادہ نہ ہو سکی۔ شاید اس کا بھی جی اندر سے یہ چاہتا تھا کہ شاہد بھائی جلدی سے نہا کر آئی اور اتنے میلے میلے نہ لگیں۔

اس روز اماں مولیٰ کے پراٹھے پکا رہی تھیں۔ ہم چاروں باورچی خانے میں پھلی تپائی کے گردموڑھے لگائے بیٹھے ہوئے ہر پراٹھے کے پک جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب بھی پراٹھا توڑے سے اترتا ایک کہرام مچ جاتا۔ گرا پراٹھے کے ٹوٹے ٹوٹے ہو جاتے۔ اماں خوشی اور غصے کے ملے جلے جذبے کے ساتھ کہتی۔

”صبر کرو صبر کرو ہاتھ جل جائے گا ... اچھا چھری سے کاٹ کر بانٹ لو ...“

لیکن نہ ہم لوگ صبر کر سکتے۔ نہ بانٹ کر اپنے حصے کا پراٹھا کھا سکتے تھے۔ غدر جاری تھا جب اقبال آگئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح ذومعنی مسکراہٹ کو چہرے پر سجائے ہوئے

تھی۔ گویا ہم پر ہنس رہی ہو یا شاید دل ہی دل میں گرویدگی کے ساتھ ہماری قدر شناس ہو۔ اسے دیکھتے ہی میں شاخ بریدہ درخت کی مانند ہر رزو سے خالی ہو گیا۔ صرف وہی آئینہ دل میں منعکس رہ گئی۔

”آئیے آئیے مولیوں کے پراٹھے چل رہے ہیں وہی کے ساتھ ...“

ڈگڈگی نما موڑھے سے میں اٹھ کھڑا ہوا

اقبال کی مسکراہٹ نہ پھیلی نہ سمٹی

”میں تو کھانا کھا کر آئی ہوں آپا جی“

”پھر کیا ہے ادھر میرے ساتھ آ جاؤ“

وہ میری جگہ پیانے کے ساتھ بیٹھ گئی لیکن جگہ تنگ تھی۔ جب وہ میرے پاس سے

گذری تو کچھ ڈگمگاسی گئی۔ میں نے اسے سہارا دے کر سنبھالا۔ یہ سہارا دینے کا عمل

چند لمحوں کا تھا۔ لیکن ابونتنگ ان پیرس میں مہرکا ہوا یہ ہوا کا بل ساری عمر میرے ساتھ

رہا۔

”نظر نہیں آتا جگہ تنگ ہے ابھی چولہے میں رنے لگی تھی۔۔۔۔۔ آپا نے ڈانٹا

”اچھا ہوتا ناں“

کیا اچھا ہوتا؟ چولہے میں گر کر جلا؟ ...“

اقبال نے میری طرف دیکھا پھر نظریں اس پراٹھے پر جمائیں جو میں چھوڑ

کراٹھا تھا۔ اس نے آپا کی بات کا جواب نہ دیا اور آرام سے میرے والے مونڈھے

پر بیٹھ گئی۔

میں نے صاف پلیٹ اسے دیتے ہوئے کہا ... ”یہ صاف پلیٹ لے لیجے“

یہ بھی ٹھیک ہے“

اس بے بڑی رمز سے پراٹھا توڑا اور مزے لے لے کر بولی ... ”واہ جی واہ

بڑا مزہ آیا ... ایسے پراٹھے خانساے تھوڑی پکا سکتے ہیں۔“

”تمہیں اچھے لگتے ہی مولیٰ کے پراٹھے؟“

”کوئی خاص نہیں لیکن یہ اچھے ہیں۔“ اس نے ٹوٹے پھوٹے ٹیبل سے نوالہ توڑ

کر کہا۔ میں آہستہ آہستہ ہاتھ دھوتا رہا۔ آپا اور اقبال میری پشت پر قریباً تین فٹ کے فاصلے پر تھیں۔ ان کی کھلی کھلی کھاواالی بدتمیز ہنسی میری اندر مالمحکم کی طرح اتر رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں باورچی خانہ چھوڑ کر جاؤں۔ میں پچھل پچھل کر اقبال کے موڑھے سے ٹکرا کر گرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب دادا اب آ گئے۔

”اوائے ہوئے ووہٹی پر وٹھوں کی خوشبو تو گلی تک جا رہی ہے واہ واہ ... واہ

واہ ...“

اماں نے گھی پیڑا پڑا چھوڑ کر سر کی بکل درست کی ...

”آئیں بسم اللہ ... پر آپ نہائے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے“

”لے پھر میں نہا کر آیا ... اس پچھیرا پلٹن کو بھگ دینا میرے آنے تک ...“

ظفر اور فریدہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کو کھانے سے فرصت نہ

تھی ورنہ کوئی جملہ کس دیتے۔

اس واقعہ سے قریباً ہفتہ بھر بعد دادا ایک رات سوئے اور صبح نہ اٹھے۔ انہیں شاید

کسی کی محبت پر اس قدر اعتماد ہی نہ تھا کہ وہ مرنے سے پہلے بیمار ہوتے، کسی سے سیوا

خدمت کراتے، عمر بھر کے حساب چکاتے، وعدے وعید کرتے، وصیت نصیحت چلتی۔

بس گلی میں ان کی چار پائی بچھی تھی، رات کے پچھلے پہر ذرا سی خنکی ہو جاتی تھی۔

انہوں نے مرنے سے پہلے اپنا منہ سر سفید کھیس میں چھپا لیا اور خود ہی اپنے کفن اوڑھ کر

سو گئے۔ شاید وہ نہانے چلے گئے تھے اور واپس آنا بھول گئے تھے۔

امریکہ میں بڑے شہروں کی زندگی شہد کے چھتے کی مانند زرتی ہے۔ ہر وقت کی

مصروفیت ... لیکن بڑے شہروں سے دور چھوٹے شہروں میں دیہاتوں میں ابھی ترقی

نے اپنے ناخن اس قدر نہیں گاڑے، وہاں محبت فرض اور شادی مقدس لفظ ہیں۔ امریکی دیہات دیکھ کر لگتا ہے کو گویا یہ سارے آدرشی لوگ ابھی اصحاب کہف کی اچھائی Addiction ہے اور یہ کسی ایسے خواب میں گھوم پھر رہے ہیں، جہاں سے ابھی ابھی حضرت عیسیٰ ہو گزرے ہیں اور خدا کی وحدانیت اور اچھائی اور نیکی کا حکم نافذ ہو چکا ہے۔

میں گز بو میں اکیلا بیٹھا سوچتا ہوں۔ پتہ نہیں ارجمند کون سے دن کون سے ویک اینڈ پر مجھے واشنگٹن لے جائے گی۔ برسوں بعد اقبال کو دیکھ کر کیسے محسوس کروں گا؟ میرے خیال میں بڑھاپے میں مرد کے جسم سے نکل کر عورت اس کے دماغ میں گھس جاتی ہے۔ جوں جوں وہ بوڑھا ہوتا جاتا ہے، وہ عورت کے اس قدر قریب ہو جاتا ہے کہ خود عورت بن جاتا ہے۔ جسمانی تعلقات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اغزل الغزلت اس کی زندگی کا بہترین مشغلہ قرار پاتا ہے۔ جمہد ارنی سے جھگڑنا، سی، پھوپھی تائی سے مشورے کرنا، بیٹیوں کی یاد میں آنسو بہانا، قبروں پر جا کر رقیق ہو جانا، نیلی ویرن پر کسی خاتون کی نعمت یا حمد پڑھتے دیکھ کر آبدیدہ ہونا قدم قدم پر وہ جنس لطیف کا زرخیز بنتا جاتا ہے۔ ہو لے ہو لے عورت اس کی سائیکسی کا بڑا حصہ بن جاتی ہے۔ میں نے بھی اقبال کے بغیر ساری جوانی مزے میں گزاردی، لیکن اصغری کی وفات کے بعد یہ تعلق پھر ہرا ہو گیا اور سردیوں کا موسم گزرنے پر جس طرح جھونجھانا رکا بونا لہلہا اٹھتا ہے، ایسے ہی میرے تعلق کے انار میں بڑے خوبصورت شگونے نکل آئے اور میں ان انار کی کلیوں کو کبھی سونگتا، کبھی ان کے رنگ سے مسحور ہو جاتا۔

ارجمند دور سے رومال ہلاتی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اٹھ کر اس کی طرف چلنے لگا اور ہم دونوں سڑک کنارے جا ملے۔

”ابو جی آپ پلیز گھر آجائیں۔“

”کیوں؟؟؟“

”بات یہ ہے کہ ہم دونوں تین دن کے لیے جاپان جا رہے ہیں۔ بلال کی وہاں کوئی کانفرنس ہے مجھے بریک مل جائے گی۔۔۔۔۔“

اور بچے۔۔۔ جمشید اور قیصر۔۔۔

”وہ آپ کے پاس ہیں۔ رات کو یا آپ ان کے کمرے میں سو جائیں گے یا وہ آپ کے کمرے میں گدے بچھالیں گے۔۔۔۔۔“

میں نے کبھی اپنے بچوں کی Baby sitting نہ کی تھی۔ مجھے یہ حکم نامہ کچھ عجیب سا لگا۔۔۔ مجھے اصغری یاد آگئی اس نے کبھی کسی بچے کو میری گود میں نہ دیا۔

”اچھا۔۔۔۔۔“

”آپ گھبرائیں ناں۔ بچے بہت Behaved ہیں۔ وہ آپ کی ساری باتیں مانیں گے۔“

ہم دونوں گھر کی طرف چلنے لگے۔ میں نے ارجمند سے پوچھنا چاہا کہ ہم تو ویک اینڈ پرواشنشن ڈی سی جانے والے تھے۔ وہاں ہمیں ایبیمسی میں ٹریڈ منسٹرٹار سے ملنا تھا۔۔۔ اور اتنے برسوں بعد اتنے جگ بیت جانے کے بعد اقبال کو دیکھنا تھا لیکن۔۔۔۔۔

بچے ہمارے آگے آگے ٹھوسیاں مارتے چل رہے تھے اور ہم دونوں ان سے پیچھے اپنی اپنی دنیا میں گم تھے۔ سارا علاقہ صاف شفاف دھلا دھلا یا۔ اجلا اجلا صبح کی شیر گرم دھوپ میں گنبنے کی طرح چمک رہا تھا۔ مین سڑک کے پار سوپر مارکیٹ کی عمارتیں نظر آرہی تھیں۔

”ابو جی آپ کو ذرا فون کا خیال رکھنا پڑے گا۔۔۔۔۔“

”وہ تو میں حادثاً رکھ لوں گا“

”بات یہ ہے کہ میں نے آٹنی اقبال کو فون کیا تھا کہ میں جاپان جا رہی ہوں لیکن وہ گھر پر نہیں تھیں میں نے آنسرنگ مشین پر پیغام تو چھوڑا ہے لیکن کئی بار لوگ راتے

کو اتنے تھکے ہوتے ہیں کہ پیغام بھی نہیں سنتے۔ انکل ٹاٹو Call back کے معاملے میں ذرا سست واقع ہوئے ہیں۔ لیکن آنٹی ضرور فون کریں گی۔۔۔۔۔“

ایک امید کی کرن۔۔۔۔۔ قوس قزح کا منظر وہی آواز وہی مٹھاس۔۔۔۔۔ امرت رس کانوں میں گھٹکے گا۔ اقبال کا فون!

”لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ لوگ آنہ جائیں۔ پھر آپ کو مشکل ہوگی“

”نہیں نہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ میں کافی چائے بنانا جانتا ہوں“

”ٹی بیگز ختم ہو گئے ہیں۔ وہ وال مارٹ سے لانا پڑیں گے۔۔۔۔۔“ ارجمند کسی ماڈل کی طرح کمر کو لہے لچکاتی ہوئی cat walk چل رہی تھی۔ اس کی چال دیکھ کر مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئی کیونکہ وطن میں تو گھیردار شلواریوں میں اس کے انداز یہ نہیں تھے۔ وہ اپنا پرس کھولے کچھ دیکھنے لگی۔

”میں آنٹی اقبال کی تصویر تلاش کر رہی تھی۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کہاں ہے۔۔۔۔۔ کہاں ہے۔۔۔۔۔ کہاں ہے“ وہ sing song آواز بدلتی چلی گئی۔

اگر وہ آگئی تو آپ انہیں پہچان سکیں۔ ”تم فکر نہ کرو۔۔۔۔۔ میں اسے پہچان لوں گا۔۔۔۔۔“

”بس ذرا وہ اپنے آپ کو انٹرویو کرانے میں embarrassed ہوں۔۔۔۔۔“

وہ جلدی جلدی پرس کے مختلف خانے دیکھ رہی تھی۔

”میلے۔۔۔۔۔ اب آپ انہیں اچھی طرح سے Receive کر لیجئے گا

۔۔۔۔۔ تصویر تو ملی نہیں۔ جب مین یہاں نئی نئی آئی تھی تو آنٹی اقبال نے میرا بہت خیال رکھا تھا۔ میں لاہور کو یاد کر کے رویا کرتی تھی امی کی طرح مجھے دلا سے دیا کرتی تھیں کہ بیٹی شروع میں سب کا یہی حال ہوتا ہے۔ ہولے ہولے دل لگ جاتا ہے۔۔۔۔۔“

کر سکتا ہے البو۔۔۔۔۔ کچھ رسم و رواج کچھ اقدار ضروری ہر عہد میں بدلتی ہیں۔۔۔۔۔ ہیں ناں؟“

”رسم رواج تک تو ٹھیک ہے ارجمند۔۔۔۔۔ لیکن اصل Values۔۔۔۔۔ کبھی نہیں بدلتیں۔۔۔۔۔ مین اخلاق اقدار کی بات نہیں کر رہا۔ میں ان بنیادی حقائق کا ذکر کر رہا ہوں جو تمام مذاہب میں ایک سی ہیں اور نبی ان کی شہادت دیتے ہیں“

”مثلاً۔۔۔۔۔“

”مڑ لا بھوٹ۔۔۔۔۔ ماں باپ کی عزت۔۔۔۔۔ مثلاً سارے معاملات میں کھرا پن۔۔۔۔۔“

اس نے کچھ ایسے سر ہلایا جیسے مین کوئی فرسودہ بات کر رہا ہوں۔ میری بات انتی پٹی ہوئی کلیشے زدہ تھی کہ اس نے مجھ سے آگے چلنا شروع کر دیا اور گفتگو منقطع کر دی۔

میں نے دل میں سوچا کہ واقعی اگر انسان اقدار سے متھے ہو جائے تو ترقی کا بہت گھر سے باہر پھینکا پڑتا ہے۔

میں نے ارجمند کو بتانا چاہا۔۔۔۔۔ بہر کچھ اپنے متعلق۔۔۔۔۔ اقبال کے بارے میں اس مبہم تعلق کی باتیں جس کا کوئی ثبوت نہ تھا۔۔۔۔۔ پھر سوچا کہ فقیر لوگ کہا کرتے ہیں جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ میں کسی قسم کی محبت کا اعلان کیونکر کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ اسیادھیٹربن میں گھر پہنچا اور سوچتا چلا گیا کہ اقبال سے میرا کیا سمبندھ۔۔۔۔۔؟ بھلا اس تعلق کو انسان کس نام سے پکار سکتا ہے۔۔۔۔۔؟

ارجمند اور بلال کے جاپان رخصت ہو جانے کے بعد میں بچوں کے کمرے میں شفٹ ہو گیا۔ فرمانبردار بچے سارا دن کی بھاگ دوڑ سے تھکے ہوئے تھے، تھک کر جلد سو گئے۔ میں نے نین کو بلانے کے بڑے جتن کئے۔ آئیس کریم کھائی۔ دودھ پیا۔۔۔۔۔ کئی قسم کے لیمن ڈراپ چوسے۔ اونگھ آجاتی تھی لیکن نین کو سوں دور تھی

- بوڑھے لوگ عام طور پر آدھی رات کو جاگ جایا کرتے ہیں۔ پھر ان کی موتیا سے بند ہوتے تو رنیا کو تو کچھ واضح نظر نہیں آتا لیکن اند کی آنکھ کھلی رہتی ہے۔۔۔۔۔

تعلق کیا چیز ہے؟

یہ بھی حیات سے تعلق رکھنے والی غیر مرئی خوبیوں میں سے ایک کیفیت ہے جسے محسوس تو کیا ج سکتا ہے۔ لیکن سمجھانے پر آئیں تو سمجھ نہیں سکتے۔ ماں کی محبت یا تعلق کو ماما کہہ کر واضح نہیں کر سکتے۔ ڈکشنری میں یا لٹریچر سے اس کی وضاحتیں ملتی ہیں، ماما نہیں ملتی۔ جہاد پر جان سے گزر جانے والے بہادر کا حصہ نہ بن جائیں۔ تعلق زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے صبر کی مانند ایک ڈھال ہے۔ جب کبھی جہاں بھی کسی سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، وہاں قلعہ، راحت اور وسعت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کو اند بھی اندر یہ یقین محکم رہتا ہے کہ آپ کی آگ میں سلگنے والی کوئی دوسرا بھی موجود ہے۔۔۔ دو ہر اوزن آدھا رہ جاتا ہے۔

تب میں اتن سوچنے والا نہ تھا۔ ہال روڈ کی چھوٹی سی دوکان پر شاہد بھائی کے ساتھ کام کرنا پرائیویٹ بی اے کی تیاری میں مصروف رہنا اور اپنا کی عمر میں چھوٹی سی پہلی اقبال کا بل وجہ انتظار کرتے چلے جانا میر مشاغل تھے۔ اقبال کی سوچ ہمیشہ میرے ساتھ تارچ کی روشنی بجھ جاتی لیکن اندھی یاد کی بیٹری بھی ساتھ رہتی اس کی دیدہ ہی سے میرے بیٹری چارج ہو جاتی تھی۔ میں خود اس تعلق کو کبھی سمجھ نہ پاتا۔ ایک روز میں آپا کے کمرے میں گیا تو سامنے پلنگ پر اقبال بیٹھی کوئیکس لگا رہی تھی۔ تب ماڈرن لڑکی ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ وہ چوری چھپے کے بجائے علانیہ کیوئیکس لگانے لگی تھی۔

”آپ کیا کہاں ہیں؟۔۔۔۔۔“

”امی جی نے بلایا ہے کچن میں“

میں پٹنگ کے کنارے وسوسوں کا شکار کسی نو بیاہتا کی طرح کبا سا ہو کر بیٹھ گیا۔

”کبھی آپ نے ایسا تعلق محسوس کیا ہے کہ۔۔۔۔۔ کسی شخص کی غیر موجودگی میں

زندگی خالی خولی ماچس کی ڈبیا بن جائے۔۔۔۔۔“ میں نے پوری توجہ کے ساتھ ٹھاہ کے انداز میں سوال کیا۔

اس کشمیرن نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔ ”کیا آپ ایسے تعلق سے آگاہ

ہیں؟“

میں حیران رہ گیا۔ ایف اے کی حالب سے ایسا سوال حیران کن تھا؟۔

شاید اس نے اپنی سٹیکو جی کی کتاب سے کچھ اس نوعیت کا پڑھا ہوا۔ میں تو خیر

شاعری کرنے کے باوجود تعلق کی بولی کم کم سمجھتا تھا اور شاعری میری سوچ کا کچھ نہ

بگاڑ سکتی تھی۔ بس بے وزن حادثاتی شعروں سے کاپیاں بھری رہی تھیں۔

”میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔۔۔۔۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو

تو۔۔۔۔۔“

میرے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ نوٹیل پرائز سے بھی بڑا۔۔۔۔۔

”میں تب گیا رہ بس کی تھی۔۔۔۔۔ ہم اپنی خالہ کے پاس پہاڑوں پر گئے ہوئے

تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ آپ کو معلوم ہے ناں کہ پہاڑوں پر گرمی میں جب پتھ تپ

جاتے ہیں تو عجیب قسم کی گرمی لگتی ہے۔ چھنے والی سوئیاں جیسی۔ آنکھیں چلچلاتی

دھوپ میں چند دھیانے لگتی ہیں۔ میں اپنی کزن واجدہ کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی

تو تیز دھوپ میں میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ آپ سن رہے ہیں ناں“

”جی۔۔۔۔۔ غور سے۔۔۔۔۔ اقبال“ میں اپنے آپ کو بادلوں میں محسوس کر رہا

تھا۔

”آپ کو شاید یاد ہو کہ۔۔۔۔۔ اس زمانے میں جاپان سے ایسے کلیئنڈر آیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ جن پر گوری چٹّی نازک سی جاپانی ٹرکیاں نازک نازک نقش و نگار کی چھتیاں اٹھائے دکھائی جاتی تھیں۔۔۔۔۔“

”میرے پاس ابھی تک ایک ایسا ہی کلیئنڈر ہے۔۔۔۔۔ شاید وہ لڑکی چینی ہے شاید جاپانی ہو۔۔۔۔۔ کلیئنڈر وہی لڑکی“ میں نے ہنگارا بھرا۔

”میرے پلنگ کے پاس والی دیوار پر ایک ایسا ہی کلیئنڈر تھا جس میں چیری کے شکلوں میں ایک جاپانی لڑکی چھتری لگائے مسکرا رہی تھی۔۔۔ مجھے ایسی چھتری کی تلاش لگ گئی۔ بڑی بے قراری کے ساتھ میں نے امی سے چھتری کی فرمائش کی تو وہ مجھے بازار لے گئیں۔ لیکن بارش سے بچنے والی کالی چھتری تو ملیں۔“ بانس کی کھچپوں والا چھتا نہ ملا۔۔۔ وہ نظریں جھکا کر بولتی چلی گئی۔ میں حیران اقبال کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور وہ پوری توجہ کے ساتھ کیونکس لگاتی واقعہ میں گم ہو لے جا رہی تھی۔ ابھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت کرنے کی فرینک نس بھی عام نہ ہوئی تھی۔

”آپ کو تو پتہ ہی ہو گا۔ پیاروں پر ان دنوں ایسے چائنا مین آیا کرتے تھے جن کے پاس چینی دستکاری کا بکا و مال ہوتا تھا۔ ایک روز ہم گھر پہنچے تو خالہ اور امی کے سامنے ایک چائنا مین جیسے جادو کی صندوقچی کھولے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس نازک کڑھائی کے بیڈ کور Dollies Duchess Set، گدیاں، رومال، سکارف نہ جانے کیا کچھ تھا۔ Pastel Shades میں کڑھائی کا کام پوری جادوگری تھا۔ شیڈ وورک، Lazy Daisy ٹانگے میں نازک نازک پھول شاخیں پتیاں۔۔۔ خالہ اور امی تو دیکھنے دکھانے میں مصروف تھیں لیکن میری نظر اس چھتری پر جمی رہ رہ گئی جسے کھولنے پر بانس کے پتوں اور شاخوں کا ایک جال سا سارے چھاتے پر پھیل جاتا۔“

”تو۔۔۔ آپ کو اپنی پسند کی چھتری مل گئی ہالا آخر۔۔۔۔“ میں نے اپنی پسند پر زور دیا۔

”جی بالکل بالکل۔۔۔ اب اس دن کے بعد میں جہاں بھی جاتی یہ چھتری میرے ساتھ ہوتی۔ اس نے مجھے واجدہ سے واجدہ کی سہلیوں سے منفرد کر دیا تھا۔۔۔ ایک روز پتہ ہے کیا ہوا۔۔۔۔“

”ہاں تو کیا ہوا۔۔۔۔؟“ میرا تجسس بڑھا۔

”ہم دونوں یعنی میں اور واجدہ ترانی کی طرف جا رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ اور بہت سی مڑکیاں تھیں، خانہ تھیں۔ ہم سب پکنک منانے جا رہے تھے۔ ہوا میں چیز کے درختوں کی خوشبو تھی۔ پھر اوپر پہاڑ کی جانب سے ایک چائٹائین تیزی سے اتر اور سب کو چھوڑ کر میرے پاس آگیا“

”آپ کے پاس۔۔۔۔ وہ کیوں“ میں کچھ مضطرب ہو گیا۔۔۔ نہ جانے تعلق کی یہ کونسی گنجیل تھی۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا۔ ہاں Johnny تمہیں کیا چاہیے۔۔۔“ وہ مسکرایا اور ہالا۔۔۔۔“ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔۔۔ میرا سارا سامان بک گیا ہے اور میں کل شنگھائی واپس جا رہا ہوں۔۔۔ آپ کی والدہ کیسی ہیں؟“

اس چائٹائین نے انگریزی میں سوال کیا۔ یکدم مجھے خیال آیا کہ وہ تو وہی چینی تھا جس نے امی کو بہت سی چیزیں بیچی تھیں۔ میرے لئے چھاتا بھی لیا تھا۔

”لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچانا۔۔۔۔“

”اس چھتری سے۔۔۔ اور کیسے؟۔۔۔“

”اچھا اچھا۔ لو مجھے خیال ہی نہ آیا“ حالانکہ مجھے بہت پہلے اس بات کا خیال آچکا تھا کہ یقیناً اس جوانی نے چھتری ہی کی وجہ سے اقبال کو پہچانا ہوگا۔

”پتہ ہے پھر کیا ہوا؟“

”جی بتائیے؟۔۔۔۔۔“

اس چائٹائین نے جیب سے رو مال نکالا۔ ہلکے ہادامی رنگ کا نازک سا رو مال۔ اس پر Draw String کی کشیدہ کاری تھی۔ پھر دعا مانگنے کے انداز میں ہاتھ اٹھائے اور بولا۔۔۔۔۔ یہ میں آپ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ یہ اعتراف ہے کہ آپ نے جس طرح میری ماں کی بنائی ہوئی چھتری کو پسند کیا۔ اس کے لئے میں بھی ہمیشہ شکر گزار ہوں۔ یہ تعریف ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں۔ وہ رو مال ابھی بھی میرے پاس ہے۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں بے نام تعلق کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

میں سمجھا نہیں اقبال۔۔۔۔۔“

”تعلق چھتری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ زندگی کی کڑی“

بانس کے دھوپ میں اس کے پیچھے جائے۔ اداسی ہو تو اسے کھول کر سجالینے۔ ہر طرف بانس کے درختوں کا احساس ہوگا۔ پیاروں کے کمرے میں ٹرانے والا بندر آجائے تو اس چھتری سے بھگا دیجیے کبھی آپ نے غیر ضروری بندر کو کمرے سے بھگایا ہے۔۔۔۔۔ پیاروں پر تو ہم عام طور پر اسی چھتری سے بندروں کو بھگایا کرتے تھے۔۔۔۔۔ کسی ایک سے تعلق پیدا ہو جائے تو وافر شرارتی بندروں کو بھگانا بھی تو پڑتا ہے نا۔۔۔۔۔“ یہ بات بھی مجھ کو دن شاعر کے لیے نئی تھی۔

اقبال بڑی شاعرانہ سی گفتگو کر رہی تھی اور میری جانب ہولے ہولے بڑھتی آرہی تھی لیکن اس وقت آپ آگئیں۔۔۔۔۔“ لو بھی تمہارے لیے ومنتو بھیجی ہے اماں نے۔۔۔۔۔ میں کچھ میں گئی تو کہنے لگیں ذرا یہ شامی کباب تو بنا دو میں تھک گئی ہوں۔۔۔۔۔ سارے میں پھیلی ایوننگ ان پیرس کی خوشبو ماند پڑ گئی اور وٹو کی مہک سے کمرہ بھر گیا۔

چائٹائین کی مہربانی سے ہم دونوں تعلق کے ادا میں تو داخل ہو گئے تھے لیکن اس

کے مرکز تک پہنچ نہ پائے۔ اقبال اور آپس عورتوں کا خاص صفحہ بن گئیں اور میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

وزیر و بلب کی روشنی میں جمشید اور قیصر کو نیند کی آغوش میں بے سدھ سوتا چھوڑ کر میں تعلق کے سفید گھوڑے کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ خیال کے Lasso سے تعلق کا برآق پکڑنا مشکل تھا لیکن میں پھر بھی بھاگتا چلا گیا۔

جس طرح اللہ کی بنیادی ننانوے صفات کو جان کر بھی اللہ کا ادراک ناممکن ہے کلی طور پر اس ذات باری تعالیٰ کی ہمیں سمجھ آ جائے یہ خیال ناممکن ہے۔ ایسے ہی اقبال سے تعلق کو میں سمجھ نہ پایا تھا۔ وہاں سب کچھ تھا اور کچھ بھی Tangible نہ تھا

اقبال مکمل طور پر میری جنت بھی نہیں تھی۔ یہاں بھی میرا تعلق ادھورا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کچھ share نہیں کیا۔ میری کسی مصیبت میں وہ میرے ساتھ نہ تھی۔ خیال کی حد تک کبھی کبھی میں اس کے ارد گرد کہانیاں بن لیتا۔۔۔۔۔ لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔۔۔۔۔ اور پھر بھی۔۔۔۔۔ اور اسی طرح۔۔۔۔۔ اور کیا کہیں کی حالت میں وہ میرے ساتھ رہی۔ محبت شفقت ہمدردی، عشق تروتازہ ہوں تو غم غم نہیں رہتا۔ لیکن کبھی کبھی اگر سارے رشتے ٹوٹ بھی جائیں ار آنینہ دل میں کوئی شبیہ باقی نہ رہے تو بھی ایسا اوقات غم کا پہاڑ اسی تعلق کے بل ڈوزر سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ ایسی کیفیت کو انسان نے آزادی کا نام دے رکھا ہے اور اس لیے کئی بار محبت کے بجائے آزادی کے پنکھ لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ لیکن بندے کی دوئی کو کیا کیجیے اس کی خوبی ہی اس کی خرابی اور اس کی خرابی ہی اس کی خوبی ہے۔ اس کے قلب میں سدا بہار حق و باطل کی جنگ جاری رہتی ہے۔ وہ من و تو کے جھڑوں سے نکل نہیں سکتا۔ بتوں کو توڑتا توڑتا مذہب حال ہو جاتا ہے لیکن بتوں کی Logistics ختم نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ ایسے ہی آزادی اور محبت کے درمیان پنڈولم کی طرح پھرنا بھی اس کی

اپنی دونی کا ہی فریب ہے۔۔۔۔۔

میں کبھی آزادی کی خود فریبی اور محبت کی پائیداری کا مزہ تو نہ چکھتا تھا۔ مجھے یہ دونوں تلواریں ہی نہ ملی تھیں جن سے میں زندگی سے معرکہ آرا ہوتا۔۔۔۔۔ لیکن میں تعلق کی چھتری کو شاید کچھ کچھ جانتا تھا۔ کبھی میں اس پر بنے ہوئے بیل بوٹوں میں کھو جاتا اور کبھی اس کوتاہی کر مینہ کنی سے بچنے کی کوشش کرتا۔ تعلق کی عملی شکل اصغری تھی

تعلق کا عملی پہلو ذمہ داری ہے۔ جہاں بھی کوئی رشتہ نامہ ہو وہاں ذمہ داری کا احساس از خود پیدا ہونے لگتا ہے۔ سالوں پر محیط رابطے عام خیر سگالی اور دکھ سکھ میں شریک ہونے کے عملی ثبوت ہوتے ہیں دامے درمے سنجھے مشکل کی گھڑی میں کام آنے کی روایت تعلق کا عملی پہلو بن کر۔۔۔۔۔ اصغری میرے ساتھ رہی۔۔۔۔۔ ہم دونوں اصلی معنوں میں شریک حیات رہے۔ شادی بیاہ کی رسومات جم مرن کے حادثات، گھریلو واقعات میں ہماری سانجھ رہی۔۔۔۔۔ ورق و قمر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ذمہ داری کی عینک سے پڑھا۔

لیکن میں اصغری کو اقبال والا صفحہ کبھی نہ دکھاسکا۔ اس کو رے کا غر پر کوئی تحریر نہ تھی۔ نہ سنانے کو کچھ تھا نہ کسی قسم کے سوگ میں اسگری کو ڈوبنے کی ضرورت تھی۔

اصغری اور اقبال کے تعلق کی دونی کے متعلق سوچتا، محبت اور آزادی کے تضاد کو شکار تھا اور ترقی اور فلاح کی دونی میں ڈوب گیا۔ مجھے یہ دونوں بھی زوج صورت نظر آئے میں نے جانا کہ ترقی کرنے والوں کے لیے دوسروں سے تعلق اتنا ضروری نہیں ہوتا جس قدر Self Love اہم ہے۔ جب تک ترقی کا آرزو مند اپنی ذات کو اپنی خواہش کو Priority نہ دے وہ آگے بڑھ نہیں سکتا۔۔۔۔۔ وہ کیسا لگتا ہے، کیا کھاتا ہے، کہاں رہتا ہے، اس کی ذات کی پرستش میں پورے کے پورے، رکیٹ سروس پر

لگے ہیں۔ بیوٹی پارلورز شوں کے ٹھکانے، جو گنگ، پلاسٹک سرجری کی ہلاشیری پر مامور ہیں کپڑوں کی ساری ٹیشنل اور ملٹی ٹیشنل انڈسٹری، جنوں کا کاروبار، بازار در بازار اس کی ذات کو چکانے پر آمادہ رہتے ہیں۔ جب ذات مور پنکھ لگا کر نکلتی ہے تو معیار زندگی اونچا کرنے کا بھوت بھی Self Love پر سوار ہو جاتا ہے، بہتر گھر، بڑی کار گھر میں سجانفر نیچر ذات کی جیب میں استکبار کا گولڈن کارڈ ایسی گفتگو جو اپنی کوشش، محنت اور دوست کو کامیابی کے بینک بیلنس کے طور پیش کرے۔ ایسے وقت میں جب ترقی کا بھوت نہ جینے دے نہ مرنے دے۔ ترقی اور فلاح میں جنگ بن کر دو تلواریں آپس میں ٹکراتی ہیں، انسان ایک بار پنڈولم کی صورت کبھی ادھر کبھی ادھر بھٹکنے لگتا ہے۔

فلاح میں انسان تعلق تلاش کرتا ہے۔

ترقی میں ذات پر بھروسہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلق راستے کا روڈ بن سکتا ہے۔

فلاح میں انا راستے کا بند پھانک پے۔

ترقی میں انا کی پھمن اٹھائے بغیر کسی کو ڈسا نہیں جاسکتا۔

فلاح میں اشیا کی تلاش تعلق کی موت ہے۔

ترقی میں اشیا لاؤشکر کی طرح کوئی دائیں سے حملہ آور ہوتی ہے کوئی بائیں سے

اشیا کو میسر اور میسنا کی طرح سجا کر انسان ترقی کے کارزار میں محفوظ محسوس کرتا ہے۔

فلاح خواہش کی پیری کو مجاہدے، ریاضت صبر سے نکالتی ہے اور تعلق درخت کو

تن آور کرتی ہے۔

ترقی خواہشات کے بغیر ایک قدم نہیں چلتی۔ ان ہی خواہشوں کے پٹرول سے

ترقی کی گاڑی چلتی ہے۔۔۔۔۔

جمشید اور قیصر بے سدھ ایک دوسرے میں جکڑے سو رہے تھے اور مجھ پر سوچوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔

میں نے سوچا ڈراصل آج کا عہد نہ سپیس انچ ہے نہ میڈیا Oriented ہے۔۔۔۔۔ یہ وہ عہد ہے جب آزادی اور تعلق کے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں فلاح کا عہد رخصت ہو رہا ہے ترقی کا دور آگے بڑھ رہا ہے۔ ترقی جس کا علم آزادی ہے اور فلاح جو تعلق کا پھر میرا لے کر چلتی ہے۔ میں اس ترقی کے جھنڈے کو غور سے دیکھتا ہوں۔ اس پر صرف ایک تیر بنا ہو جو آگے جاتا ہے۔ چیرتا چلا جاتا ہے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔

امریکہ نے اور ان کے دیکھا دیکھی تمام ترقی پذیر ممالک نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے۔۔۔۔۔ کرنے مرنے کی آزادی۔۔۔۔۔ ہر قسم کے تعلق سے نکل جانے کا عہد اپنی ذات کو سر بلند ثابت کرنے کا عزم۔

امریکہ چونکہ ذات پر انحصار اور اس سے پیدا کردہ ترقی کا داعی ہے۔ اس لیے وہاں آزادی اولین peiority ہے۔ آزادی کے کیک پر تعلق کی آئیننگ بھی لگی ہو تو بہت خوب ورنہ پلین کیک ہی چلے گا۔ عام طور پر آزادی کی قینچی سے تصنع کی وہ تمام رسیاں کٹ جاتی ہیں جن سے

انسان بندھا ہوتا ہے تعلق چلتے ہیں، لیکن تاویر ان کو نبھانا اور کسی پر تکیہ کر کے زندگی بسر کرنا ناممکن نہیں۔ جب اقتصادی، جذباتی، نفسیاتی، Dependency ختم ہو جاتی ہے تو تنہائی کا پتہ گھر کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگتا ہے، تعلق وقتہ ہو کر تضیع اوقات میں بدل جاتے ہیں اور مصرف انسان کو اندر کی زندگی سیراب کرنے کے لیے منت نئے چشمے نکالنے پڑتے ہیں۔ پھر امر دپرستی کا جنون چلتا ہے۔ ہم جنسوں کی شادیاں بھی قانونی ٹھہرتی ہیں

لوگ Punk بنتے ہیں۔ گروہی ناچ گانا، انفرمیشن میلی ویژن، انٹرنیٹ دوسرے ممالک کے سفر مختلف ریاستوں میں مختلف قسم کی روزگار کی تلاش، اضطرب در اضطرب کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں اور گہرے تعلق کا تعمیل بدل تلاش کرنے میں وقت بھٹکتا رہتا ہے۔ ایسے میں نلاح کی دیوی تعلق کا سفید جھنڈا لپیٹ کر رخصت ہو جاتی ہے۔

جمہوریت پسند امریکی، اینٹی کرائسٹ اور اینٹی محبت کا داعی اپنی مکمل آزادی کا خواہاں ماں باپ کو اولڈ ہومز کی نذر کرتا ہے کیونکہ بوڑھے ترقی کے راستے کی روکاؤٹ ہیں۔ بچوں کو ڈے کثیر سنٹر کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی روہیں نہ وقت کی اہمیت جانتی ہیں اور نہ آزادی کے مفہوم سمجھتی ہیں۔ عمر بھر کا ساتھی جس سے بیماری، تنگ دہی، موت اور زندگی کے سفر میں ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔ اس جیون ساتھی کو طلاق کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ ترقی کے راستے میں تعلق کے روڑے نہ آئیں۔ تعلق کی سب توقعات سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

امریکی شہری اپنی توقع کے ہار کو جلد گلے سے اتار بھینکتا ہے۔ بچہ جلد ہی سمجھ جاتا ہے کہ ماں اٹا رو قربانی دے کر اپنی شخصی آزادی تاج کر اس کی پرورش نہیں کر سکتی، وہ رونا شھوڑ کر ماں سے توقعات کو بھی بھولتا چلا جاتا ہے۔ بوڑھے ماں باپ بھی توقع نہیں رکھتے کہ اولاد اپنی اپنی اندگیاں بگاڑ کر بوڑھے والدین کو راجہ پورن بھگت کی طرح تنہائی میں اٹھائے پھریں گے۔ آزادی کے تصور سے ہمتا رہو کر سفید فارم لوگ سب سے پہلے توقعات کی سیڑھی پر اترنا چڑھنا بند کرتا ہیں، جب تعلق کا گرم کنبل جسم سے اترتا ہے تو ٹھنڈے آدمی کو خود ہی جوگرز پہن کر جوگنگ کر کے اپنے وجود کی حرارت کو برقرار رکھنے کا فن آجاتا ہے۔ پھر آزاد بندہ خود ہی ناظر اور خود ہی منظر بن جاتا ہے۔ غم بھی اس کی خود ساختہ قرینہ سے ٹکلتے ہیں اور آنسو بھی اسے پنے ہی گیلے

رومال میں جذب کرنا ہوتے ہیں۔ بالآخر وہ اپنے وجود میں اس قدر تنہا وہ جاتا ہے کہ اس کے ہر عمل کی ذمہ داری اس کے

اپنے کندھوں پر آپڑتی ہے وہ نہ کسی کو الزام دے سکتا ہے نہ کسی سے کسی قسم کی توقع رکھ سکتا ہے۔ اپنی تقدیر کا خالق اور اپنی Free Will کا آلہء کار عام طور پر ترقی کی سنہری پوشتیں حاصل کرنے میں عمر بتا دیتا ہے اور ایسے Absurd حالات میں جہاں مسائل لائیکل ہوں ایسے اچانکی فیصلہ کرتا ہے جس کا جواز بھی وہ خود اور زندگی کی انہونی کے ساتھ واحد رابطہ بھی اسی کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ آزادی کے رسیا زندگی کے چوراہے پر اپنی Free Will کے ہاتھوں Reflex Action کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سزا و جزا کی ذمہ داری قبول کر لینے کے بعد آزادی منش کو آنسو پی جانے کے علاوہ غم سے نپٹنے کا اور کوئی طریقہ بھی سوچ نہیں سکتا۔ تعلق کی بیساکھی پھینک دینے کے بعد مجبوری پھر بھی رہتی ہے، لیکن کسی کا ہاتھ پکڑنے بجائے self کی لائیکی کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔ مشرق میں بھی کبھی کبھی مکمل آزادی کا راستہ چننے وایت مل جاتے ہیں، لیکن وہ ترقی کی خاطر ذات کی لائیکی نہیں چنتے۔ بلکہ مکمل آزادی حاصل کر کے فلاح کے راستے پر نکل جاتے ہیں۔ یہ ایک اور طرفہ تماشا ہے۔ مشرق میں جب کوئی صوفی، جوگی تعلقات کی دھجیاں جوڑ کر رلی بناتا ہے تو اس گدی پر بٹھانے کے لیے اسے آواز دیتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ مکمل فراق کی زنجیر سے بندھ کر ہر تعلق ہر توقع توڑکت جوگی کی آزادی پابجولاں ہو جاتی ہے۔ یہاں ایک اوت تضاد کا بکھیرا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ جوق در جوق اس سے تعلق پیدا کرنے کے لیے حاضری دیتے رہتے ہیں لیکن وہ تعلق کے پھندے میں بھی پھنستے نہیں اور اپنی Free Will صرف اللہ کے امر کے سامنے بھیٹ شرمناک دیتے ہیں۔ صوفی ہر لمحہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ تعلق کے سدر میں اپنی کشتی چھوڑ دے لیکن قطرہ بھر بھی کشتی کے اند نہ آنے پائے۔ اپنے غموں سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار

رہتا ہے۔ اب اسے غم بھی قید نہیں کر سکتا۔ وہ تعلق اور توقع سے فارغ ہو کر ایسی آزادی سے آشنا ہوتا ہے جو مکمل طور پر اپنی ذات کو راپن کرنے کا فن ہے، نہ آزادی کا شوق باقی رہتا ہے نہ تعلق کا۔

مہاتما بدھ مغربی آزادی اور مشرقی فلاح کی ایک بڑی مثال ہے۔ جب یشودھرا اور بچے کو چھوڑ کر سدھارا تو اس نے وہ تمام غم راجہ شد و دھن کے محل میں ہی چھوڑ دیئے۔ جن سے عام آدمی رنج کی بھیٹی میں سلگتا ہے۔ یہاں سے مہاتما بدھ نے اپنے غموں کو خود ایچا دیا۔ ان غموں کو نروان کے راستے ختم کرنے کا ارادہ بھی اس کا اپنا تھا۔ اس نے اپنی آزادی کو اس حد تک قبول لیا تھا کہ اس نے نہ کسی انسان کو پکارا نہ کسی خدا کو۔ وہ پہلا وجودی تھا۔ اپنی **Free Will** پر وہ اس حد تک قابض ہو چکا تھا کہ اس نے تربیت کو بھی تعلیم میں ڈوب جانے کے بجائے تہمانی کا سبق دیا۔ سدھار تھ کا فیصلہ تھا کہ اگر آپ مکمل طور پر آزاد ہیں تو پھر اپنے نروان کے لیے کوشش بھی نہ کیجیے۔ دنیاوی ترقی مکمل فلاح کو ختم کر دے گی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد اگر آپ خواہشات کے غلام دھر لیے گئے اور دائرے کا سفر شروع ہو گیا تو یہ تعلق خواہشات بھی سب سے بڑی غلامی ہوگی۔۔۔۔۔ غلامی چاہے ترقی کی ہو یا فلاح کی غلام ہی رکھتی ہے۔ مہاتما بدھ کا خیال تھا جب تک انسان ان دونوں سے آزاد نہیں ہوتا، نروان ممکن نہیں۔ دونوں صورتوں میں دینی یا دنیاوی خواہشات کا پٹہ اتارنا پڑے گا۔

آزاد ہونے کے باوجود خواہشات آپ کو بازار مصر میں گھسنی پھریں گی۔۔۔۔۔ اور بہت جلد آپ کو علم ہو جائے گا کہ ترقی کی بانسری کے پیچھے بھاگتے بھاگتے آپ کسی تپتے صحرا میں پہنچ گئے ہیں۔ عین عین ایسے ہی تعلق کی اصل بھی کبھی پورے طور پر سمجھ نہیں آ سکتی۔ دنیا بھر کا ادب اس کنجھل کو مکمل طور پر سیدھی لکیر میں تبدیل نہیں کر پایا۔ لگتا ہے تعلق ہے۔ پر نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے تو وقتی معجزہ۔۔۔۔۔ واروہا

اور پھر غائب۔ سیما بپا، مراب صفت، پارے کی طرح اس کے ان گنت رنگ ہیں۔ خوبیاں اور خرابیاں ہر رابطے، رشتے تعلق میں یوں گھدھی ہوئی ہیں کہ ان کا چھن پھٹک کرنا مشکل ہے۔ گہرے تعلق جیسے لیلیٰ مجنون، شیریں فرہاد، کسی بنوں، مرزا صاحبان سوہنی ماہیوال صرف اس تعلق کی کہانیاں ہیں، جوان عاشقوں کے مابین پیدا ہوا۔۔۔ وہ تعلق جوان افراد کے گھر والوں، دوستوں، شوہر بیوی کے درمیان تھا۔ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ ہم ان کے تعلق کو بھی وقتی شدت کے اعتبار سے آتکتے ہیں۔ وقت کے لمبے دورانے پر اسے پھیلا کر دیکھنے سے قاصر ہیں اس لئے تعلق کی داستان بھی ادھوری ہے۔

ایک بات جوان عاشق زادوں کی مجھے سمجھ آئی کہ ان میں ایک دوسرے پر جذباتی Dependency کا یہ عالم تھا کہ محبوب کے بغیر زندگی صرف چھلکا تھی۔ خالی کھوکھا، بلکہ بن آکسیجن کے مستعار سانس۔ صحرا میں تلاش ہو یا تنہا نہر کھودنے کی صعوبت، کچے گھڑے کا سفر ہو یا اپنے ہی جس کے کباب بنا کر کھلانے کا عمل۔ یہ سارے تعلق اپنی جان سے گذر جانے والے تھے۔۔۔۔۔ ایسے تعلق سے غالباً نلاح کی دیوی بھی خائف رہتی ہے۔

میں نے کبھی اقبال کے لیے اتنا بڑا جز بہ نہیں پالا۔۔۔۔۔ یہ تو چو لمبے کی بجھی آگی کی طرح۔۔۔۔۔ ایسی ہوا کی منتظر رہتی جو رکھ اڑائے اور اند کے دکتے انگارے پھر سلگ اٹھیں۔

اقبال ٹھیک کہتی ہے تعلق تع چھتری ہے۔ ہر جسمانی، ذہنی، جذباتی غم کے آگے شیشیہ بن کر ڈھال کا کام دیتی ہے۔۔۔۔۔ بے روزگاری، بیماری، غریبی تنہائی سارے غموں پر تعشق کا ہی پھار ہا کھا جاتا ہے۔۔۔۔۔ دوستی رشتہ داری، بہن بھائی نانا دادا۔۔۔۔۔ غرضیکہ ہر دکھ کی گھڑی میں کندھے پر رکھا ہوا ہمدرد ہاتھ، آنکھ میں جھلملاتی

شفقت، ایک بیٹھا بول، مسکراتا چہرہ بلڈ ٹرانسفیوژن، اسپر کی گولی بن سکتے ہیں۔ اسی لیے محبت اندوہ با کہلاتی ہے۔۔۔۔۔ انسان اسی لیے کبھی خدا نہیں بن سکتا۔ کہ اس کی ضرورت دوئی ہے حتیٰ کہ اگر اسے دورانہ ملے تو وہ خدا کو اپنی دوئی کا حصہ بنا لیتا ہے۔۔۔۔۔ انسان کی تنہائی قیامت خیز ہے۔۔۔۔۔ جو نہی اس خلاء کو بھرنے والا کوئی آجاتا ہے انسان اپنی جنت میں پہنچ جاتا ہے اور اپنے آپ کو مکمل سمجھنے لگتا ہے۔ ساتھ نہ ہو تو زندگی آزاد و زرخ ہے۔

میں زادی اور تعلق کے درمیان ترقی اور فلاح کے مابین رسہ کشی میں مصروف اونگھ سا گیا۔ پھر کسی نے ہلکے سے میری گال کرتھپتھپایا۔

”نانا۔۔۔۔۔ مجھے شوشو آیا ہے۔۔۔۔۔“

میں گڑ بڑا کراٹھا۔

”ہاں ہاں تو کرلو۔۔۔۔۔“

”میں نے سوتے وقت دانت بھی برش نہیں کئے تھے۔“

”ہاں تو کر لو شہاباش۔۔۔۔۔“

”آپ مجھے پیسٹ لگا دیں گے پلیز۔ ماما ہمیں خود پیسٹ لگا کر دیتی ہیں

۔۔۔۔۔“

میں جمشید کے ساتھ غسل خانے میں چلا گیا۔ اس کا چہرہ مجھے رویا رویا سا لگتا

تھا۔ یہ ماما لوگ بھی کیا چیز ہوتی ہیں؟۔ ان کے بغیر بابا لوگ کا جی کیوں نہیں

لگتا۔۔۔۔۔ یہ کیسا تعلق ہے؟ گھاس کی طرح مام۔۔۔۔۔ اور مائٹ ایورسٹ کی

طرح اونچا۔۔۔۔۔ اسے ماں کی طرف سے مامتا کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن بچے کی

جانب سے اسے کس نام سے پکاریں گے؟ اس مکمل انحصار کو کس نام سے پکاریں۔

غالباً فلاح کی دیوی نے کسی کو آج تک اس تعلق کا نام ایجاد نہیں کرنے

دیا۔۔۔۔۔ کیونکہ اسے خود ایسے ہی تعلق کی تلاش رہتی ہے۔ جب وہ خدا کی بندے

Bear کے ساتھ سونا نہیں چہتا۔ میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا سو جاؤں گا۔۔۔۔۔“

جمشید ہنسنے لگا۔۔۔۔۔“ہاؤ فنی!۔۔۔۔۔“

".....It not funny"

".....Its funny shit"

قیصر نے ایک مکا بمشید کو مارا جس کے نتیجے میں شاید لڑائی بڑھ جاتی اور میں اسے کنٹرول نہ کر سکتا، لیکن اس وقت ایک چندہ سولہ برس کی تین سو ساٹھ پونڈ کے قریب وزن والی امریکن لڑکی ان دونوں کے درمیان سے گزری اور مسکرا کر قیصر کی گال تھکی دی۔ اس موٹی باربی ڈول نے قیصر کا ہتھ نہ سر دکر دیا۔

رات کو قیصر اپنی باربی ڈول اور جمشید اپنی واٹرگن کو اپنے ساتھ تکیوں پر دھرے کہنیوں کے بل لیٹے تھے۔

”نانا لاہور کیسا ہے۔۔۔۔۔“

”لاہور؟“

”ہاں نانا لاہور۔۔۔۔۔ آپ کالاہور۔۔۔۔۔ کیا ہے؟“

”تم لاہور آ کر دیکھو تو پتہ چلے گا۔۔۔۔۔ لاہور کے تین حصے ہیں۔ ایک شہر نیا ہے جو نہر کے بائیں طرف آباد ہے گلبرگ، ڈیفنس، ماڈل ٹاؤن۔ یہاں پر امیر لوگوں کی بستیاں ہیں۔ پھر دائیں طرف وہ شہر آباد ہیں جہاں سکول کالج بازار اور سرکاری افسروں کی وزیروں کی اور متوسط لوگوں کی ملی جلی آبادیاں ہیں۔ مال روڈ ہے باغ جناح ہے اور پھر کچھری اور گورنمنٹ کالج سے آگے پرانا شہر ہے۔۔۔۔۔ مغلیہ دور کی نشانیاں سکھوں کے عہد کی داستانیں یہاں ملتی ہیں تیسرے لاہور میں۔“

وہ دونوں حیران میری صورت دیکھنے لگے۔

”نانا ہم بالکل نہیں سمجھے۔۔۔۔۔“ قیصر باربی کے سلکی پلائنم بالوں پر انگلیاں پھیر

رہا تھا۔

”اچھا میں تمہاری ماما سے کہوں گا اس بار بریک لے کر تمہیں پاکستان دکھا

لائے۔ میں تمہیں جہانگیر کا مقبرہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد دکھاؤں“

”ماما تو کہتی ہیں وہاں بہت گرمی پڑتی ہے۔۔۔۔۔“

”پڑتی ہے جیسی Texas میں Arkansas میں پڑتی ہے۔۔۔۔۔۔۔“

”اور مٹی بھی بہت ہوتی ہے۔ ڈنست ہوا میں اڑتی رہتی ہے ہر وقت You

“cant breathe

جمشید نے چھت کی طرف پانی کی پچکاری چا کر کہا ”شٹ اپ“

”ہاں مٹی بھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ کوڑا کرکٹ بھی ہوتا ہے جگہ جگہ لکھیاں بھی جھنھنائی

ہیں۔۔۔۔۔ لیکن وہاں ایک اور چیز بھی ہوتی ہے بچوں۔۔۔۔۔ بالکل نیچرل

“Organic

”وہ کیانا۔۔۔۔۔ Tell us“

”وہاں بھی اب وہ چیز کم ہوتی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ وہاں بھی لوگوں کے لیے کسی کو

وقت دینا مشکل ہے۔۔۔۔۔ وہاں بھی۔۔۔۔۔ لیکن وہاں ابھی ایک دھمڑے کے

لیے وقت ہوتا ہے۔ وقت جو سب سے بڑی Gift ہے۔“

میں چپ ہو گیا۔ بھلا ان کو ایسی باتوں کی کیا سمجھ تھی۔ انہیں تعلق کی کیسے سمجھ آ سکتی

تھی۔ انہیں میں کیسے بتا سکتا تھا کہ ساندہ سے ٹمپل روڈ۔۔۔ اور ٹمپل روڈ سے ڈیفنس

کی روٹ Pillars والی کوٹھی تک میں کتنے کچھ گنوا دیا۔ میں بھی ان کو اپنے پانچوں بہن

بھائیوں کی صرف پرانی کہانیاں ہی سنا سکتا تھا آنول تو کبھی کی کٹ چکی تھی کتنے رشتے

وقت نہ ملنے کے باعث فل سٹاپ میں بدل گئے۔ اماں ابا تو خیر قبروں میں جا سوائے

۔ ہم پانچوں بھی اپنی اپنی راہوں پر اپنے اپنے بچوں میں گم اپنے اپنے ساتھی کی انگلی

پکڑے زندگی کی بڑی بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ زندگی میں دولت مانے اور صرف کرنے کے علاوہ ہمارا کوئی مصرف نہ رہا تھا۔ پہلے اس کے لیے تگ و دو کرنا اس کو خرچ کرنے یا جوڑے جانے میں مگن رہنا۔ ہاں ایک عہد سے تعشق باقی تھا۔ پھورا جیسا کی طرح تعاقب کرنے والا لیکن اس اقبال جرم کا مین ساری عمر کوئی نام نہ رکھ سکا۔ جسے بچے ماں سے محبت کو کسی کا ص نام سے نہیں پکارتے۔ مین نے کارڈلس فون پاس رکھ لیا، ”بھئی سو جاؤ ماما نے کہا تھا۔ دیر تک نہیں جاگنا۔

اقبال کے فون کا انتظار رہا۔ لیکن مجھے انتظار کے سوائے کچھ نہ ملا۔ بچے دیر بعد سو گئے ان کے پاس اپنا اپنا سہرا ٹیڈی بیئر اور باربی ڈول کی صورت میں موجود تھا۔ میں فقط ایسے چوگے کے سہارے سونے کی کوشش کر رہا تھا جس سے سوکھے نکلے کی سائیں سائیں کے علاوہ کوئی آواز نہ آتی تھی۔

اصغری کے مرنے کے بعد میرا گھر اسی ٹیلی فون کی طرح بھائیں بھائیں سائیں سائیں کیا کرتا میرے دونوں بچے امریکہ جا چکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان اس دنیا میں صرف دولت مانے کے لیے آیا ہے، امریکہ کی بھیڑ میں گم ہوتے انہیں دیر نہ لگی کیونکہ وہ فلاح کے گاہک نہ تھے دولت کے بغیر زندہ رہنے کو ننگ زندگی سمجھتے تھے۔ انہوں نے ترقی کی دیوی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔

اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ ارجمند اور جہانگیر جب امریکہ سدھارے تو اصغری ذہنی طور پر غائب حاضر ہلول اور خوفزدہ رہنے لگی تھی۔ میں اس کے لیے نا کافی تھا۔ پہلے مجھے اپنی کم مائیگی کا کچھ ایسا گہرا احساس نہیں تھا لیکن ارجمند اور جہانگیر کے بردگھر بالکل سونا ہو گیا اور میں کافی نہ رہا۔۔۔ جب تک جہانگیر امریکہ نہ گیا ہم دونوں اسے ملنے جانتے رہے۔ شادی کے بعد جہانگیر کے ساتھ احتیاط کا رشتہ تھا۔ چھلک جانے کا

ٹوٹ جانے کا رشتہ تھا۔ شاہدہ کے والدین نمائشی زیبائشی آرائشی قسم کے امیر لوگ تھے میں بھی ساندہ کلاں سے کھسکتا کھسکا یا ڈیفنس تک آپہنچا تھا لیکن مجھ میں ابھی کو خوبو کے اعتبار سے گفتگو کے لحاظ سے معیار زندگی کے حساب سے اصغری کی وجہ سے ایک آنچ کی کس رہ گئی تھی۔ میری سوچ غریبانہ انداز زیست فقیرانہ اور جملہ حالات عاجزانہ تھے۔ اصغری چونکہ میری دادی کی پسند تھی۔ اس لیے وہ بھی فقط رنگ و روغن تک ہی پرکھ پائی۔ رنگ محل کی خوبصورت اصغری میں بیگماتی انداز کی کمی تھی اس کے ساتھ رہنا آسان لیکن محفل میں اسے پیش کرنا مشکل تھا۔ جہانگیر اور شاہدہ کچھ دیر ہمارے ساتھ رہے لیکن پہلے بچے کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد شاہدہ اپنے باپ کے گھر شفٹ ہو گئی۔ کچھ عرصی تو جہانگیر رویت نبھاتا رہا کبھی دن کبھی رات ہم بڑھوں کے ساتھ گزارنے کے لیے آجاتا لیکن اس غیر حاضری کے سنے اسے شاہدہ کے حضور کئی بہانے بنانے پڑتے۔ پھر وہ بھی ڈوری سامنے بچے اور شاہدہ کی پتنگ سے بندھا ہم سے رخصت ہو گیا۔۔۔۔۔

جہانگیر کو جلد ہی اس کے سر نے اپنی فیکٹری میں فٹ کر لیا اور اس طرح امریکہ آنے سے بہت پہلے وہ ہمارے گھریلو سسٹم کا حصہ نہ رہا۔ شاہدہ کو امریکہ جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اسے ہر قسم کی آسائش میسر تھی لیکن ارجمند اور بلال جب رخصت ہوئے تھے۔ شاہدہ نے امریکہ کو اپنے لیے چیلنج بنالیا ارجمند اور بلال کے لیے امریکہ لینک مجبوری تھی۔ وہ پاکستان میں اپنے لیے نا کافی دولت اور عزت مآ کر ماز آگئے تھے۔ جہانگیر کے لیے ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا وہ اپنے سر کی ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مل کا جنرل مینجر تھا۔ پھر بھی وہ لاہور چھوڑ کر نئی دنا چمک دمک دیکھنے کے لیے رخصت ہو گیا۔ ارجمند اور بلال کو ہجرم کیے ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا جبکہ جہانگیر اور شاہدہ بھی پروایسی ہوئے۔۔۔۔۔ اصغری نے بیٹی کی جدائی تو سہہ لی لیکن بیٹے کے جانے کے

بعد وہ بالکل بیکار ہو گئی۔

عورت بڑھا پے میں اگر پرورش کے چکر میں نہ پڑے تو بیماری کے چکر میں پڑ جاتی ہے اس کے ارد گرد بچت پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں ہر عمر اور طبقے کے رشتہ دار گھرا ڈالے رکھیں تو وہ خوش رہتی ہے۔ ہر قسم کا صدمہ، نسخہ، ٹونا ٹونکا۔ کھانے پکانے کی ترکیبیں، رنگائی دھوائی کی باکیاں، رشتوں کی چھان پھٹک اسے نوجوان عورتوں میں ممتاز کر دیتی ہیں بڑھاپا عورت کا سنہری دور ہوتا ہے بڑھا اس سے خوفزدہ اور نوجوان اس کے دبدبے سے خائف ہوتے ہیں اس میں سرداری تھانیداری اور جی داری کے وصف پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔ بہوئیں پوت لے کر چمپت ہو جاتیں۔ رشتہ دار امیر ہونے بعد مشورے مانگنے میں اپنی تک محسوس کرتے کھانے پکانے کی جو ترکیبیں درکار تھیں ان کا نام بھی بڑھیاں نہ سنا تھا۔ نہاری، سمو، پلاؤ، شامی کباب اور ایسے ہی گھریلو پکوان آؤٹ ہو چکے تھے ڈائیننگ کرنے والی لڑکیاں اب مغربہ کھانوں پر سوچ آن کر چکی تھیں۔

چینی کھانا ان تھا۔ کپڑوں کے لیے ماڈلز اور بوتلیوں کی طرف رجوع تھا۔ ڈائنامک کپڑوں کی تلاش جاری رہتی تھی۔ اس لیے بڑی عورتیں گھنٹوں کے درد زیا، ہلیس اور بلند پریشر کے چکروں میں کھو گئی تھیں اب موئے ڈاکٹر ہی ان کی باتیں سنتے اور ان کو مشورے دیتے۔ باقی جاندان دوست بچے ترقی کی ہوا اڑالے لگی تھی

اصغری ساری عمر ماں رہی۔

وہ نہ صرف اپنے بچوں کی ماں تھی بلکہ مجھے بھی اس نے اپنی ماما کی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ اسی ماما کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنا آسان تھا۔ اس میں کسی قسم کا چیلنج، مقابلہ بدتمیزی، گستاخی نہ تھی جب ارجمند اور جہانگیر اپنے اپنے دائروں میں گومتے امریکہ بدر ہو گئے تو ماں کا جینا دو بھر ہو گیا۔ پہلے اس نے مازموں کو بچے بنایا۔ پھر ایک

جنگلی بلی کو سدھا سدھا کراپنے پوؤں میں لوٹا سیکھا دیا۔ ان سے بھی دل نہ بھرا تو سارے گھر میں ان ڈور پودے لگا کر اس نے ماں حوا کا باغ بنا دیا رہی سہی کسر اصغری مجھ پر نکالتی رہی۔ وہ میری آیا، نرس، سیکریٹری، پڑوسن دوست ماں سب کچھ تھی ان سارے آرام دہ رشتوں میں کوئی کاٹا، چھین سوزش نہ تھی وہ کسی میں بے کلی کو جنم دینے یا ابھارنے کے قابل نہ تھی۔

اصغری صرف ماں تھی۔۔۔۔۔ ماں ارد گرد پرورش کا بکھڑا نہ ہو تو وہ بن پانی کے جھاڑ کی طرح پہلے کھمباتی ہے پھر زرد ہو کر جان چھوڑ دیتی ہے۔۔۔۔۔ جہسگیر امریکہ سدھارا۔ پہلے تو وہ اس کا انتظار کرتی رہی۔ گرین کارڈ بن جانے کے باوجود جب وہ ماں سے ملنے نہ آیا یا نہ آسکا تو وہ حیران رہ گئی۔ پھر سال دو سال وہ جہانگیر کے پاس جانے کا ارادہ کرتی رہی۔۔۔۔۔ آخر میں اس نے زندگی کے دم دلا سہ کا جواء گلے سے اتار اور چپ چاپ رخصت ہو گئی۔

اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ میں اس کا اس طرح عادی تھا جیسے گود کا بچہ چوسنی کا ریسا ہوتا ہے، بڑی دیر میں، خالی کمروں میں اصغری کو تلاش کرت رہا۔ پھر میں نے ایک دن گلاس سے دو دھ پینا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ یہ گلاس میرا ملازم غلام نبی تھا ہاں تو میں آپ سے اصغری کی بات کر رہا تھا۔ ہر عورت میں ماں اور طوائف کا امتزاج ہوتا ہے۔۔۔۔۔ جب عورت خدمت گزار ایثار پسند، تخلیق کار و جدان کی خوبیاں سے متصف ہوتی ہے اس وقت اس میں ماں پن واضح ہو جاتا ہے جو نہ اس میں طوائف پن ابھرتا ہے وہ ذات کے حوالے سے خود غرض سوچ میں رنگی جاتی ہے اب اس عورت پن یا Self ابھرتا ہے۔ وہ اپنے وجود کی نمائش کے لیے کوشاں ہو جاتی ہے۔ وہ کیا پہنتی کیسا کھاتی اور کسمعیار زندگی میں دن بسر کرتی ہے اس کے لیے یہ چیزیں اہم ہو جاتی ہیں اس کا ہر سوال اس کی اپنی ذات سے نکلتا ہے اور کا جواب اس کی اپنی ذات کو دیکر ہوتا ہے۔

جس طرح عورت ماں اور طوائف کا ملغوبہ ہے۔ ہر مرد میں بھی ایک کارندہ کثالت کرنے والا اور ایک زنا کار موجود ہوتا ہے۔ کفیل زندگی کو دماغ کے بائیں حصے سے پرکھنے کا عادی ہوتا ہے وہ عقلی روشنی میں استخراجی احتیاطی خارجی عملی اور تجویزی زندگی بسر کرتا ہے لیکن مرد Rapist ایک اور سچ کا آدمی ہوتا اور کہلاتا ہے، جو نبی ماں اور کفیل بنجوگ میں بندھ جاتے ہیں کامیاب شادی شدہ زندگی جنم لیتی ہے۔ طوائف اور انا کار مل بیٹھیں تو ہی ہی باہاموج میلاٹھٹھا مذاق جنم لیتا ہے مشکل یہ ہے کہ کوئی عورت یا کوئی مرد سو فیصد اپنا ایک روپ قائم نہیں رکھ سکتا۔ کسی عورت میں سیر بھر عورت اور پاؤ بھر ماں ہوتی ہے کوئی پچاس پچاس فی صد دونوں رنگ رکھتی ہے مرد میں بھی دونوں روپ ملے جلے ہوتے ہیں خود نہ مرد کو علم ہوتا ہے نہ عورت کو کہ اس کے اصلی روپ پر کس وقت دوسرا ہمزاد شب و خون مارے گا اور حاوی ہو جائے گا۔ عمر موسم میل جول غریبی امیری اتنے فیکٹرز اس پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ بالآخر کہنا پڑتا ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے خطرہ موجود ہے اور وہ کسی وقت بھی روپ بدل سکتا ہے۔

لیکن میں آپ کو اصغری کے متعلق وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ وہ پوری پوری ماں تھی اگر اس میں کہیں عورت پن موجود تھ تو اس روپ کو اس نے اپنے خیالوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی۔۔۔۔۔ اپنے خیالوں میں نہ جانے اس نے کیسی پینگیں چڑھائیں کیسی عیاشی کی۔ خیال کی مینے لگ رنگ سے میں نے اس کا چہرہ بھی کبھی تمتمایا ہوا نہ دیکھا۔ میرا خیال ہے اصغری کے جینز ترقی کرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ بچپن کی تربیت کا نچوڑ تھی۔ وہ جھڑے اور فساد سے نا اشنا اس دارالحسن میں سنی اور کسی قسم کی ترغیب دلائے بغیر کسی سید کے درخت کو چھیڑے بنا ہی رخصت ہو گئی اس کے بعد میری زندگی خالی کو کا کولا کی بوتل تھی۔

اصغری کی اصل کو میں پہچان نہ سکا اور اقبال کے متعلق میرا علم اتنا ناقص اور

کی زندگی مثال، مسکراتا تو روشنی میں اضافہ ہو جاتا سوچتا تو ماحول تفکر میں ڈوب جاتا سیانے وزیر نے دست بستہ عرض کی۔۔۔۔۔ ”سرکار اگر اپنے افغانستان میں آپ صاحب اقتدار ہوتے تو وہاں رعایا کا حق کیسے ادا کرتے۔ ان کا کارساز کیوں کر بن کر دکھاتے؟“

افغانی درویش نے کہا۔۔۔۔۔ ”اے عالی مرتب وزیر۔۔۔۔۔ ایک تجربہ کرنے کی ضرورت ہوگی۔۔۔۔۔ اگر کوئی شخص کسی ضرورت مند کو آدھ سیر خوبانی نہایت عمدہ عنایت کر دے اور دینے والے کو بتائے کہ اس عمل سے اسے زمانے بھر کی دولت نصیب ہوگی اور عنایت کرنے والا مان جائے تو یقین رکھ، اس بادشاہ کی سلطنت میں لبر بہر ہوگی اور فلاح کا راستہ بھی کھل جائے گا۔“

چندے توقف کے بعد بادشاہ نے کہا۔۔۔۔۔ ”یہ کیوں کر ممکن ہے کہ آدھ سیر خوبانی ایک سلطنت کا پانسہ پیٹ دے۔“ بادشاہ کا تذذب دیکھ کر فقیر بولا۔۔۔۔۔ ”چل پھر میرے ساتھ چل۔۔۔۔۔ تجربہ شرط ہے۔ میں تجھے بازار کا بل کی سیر کرواؤں۔۔۔۔۔“

بادشاہ اور وزیر نے عام لوگوں کا بھیس زیب تن کیا اور افغانی درویش کے ہمراہ سدھارے۔ لمبی مسافتیں طے کر کے کابل کے بازار میں پہنچے۔ ایک امیر کبیر پھل فروش سے سامنا ہوا۔ درویش نے دست سوال پھیلا یا اور بلتی ہوا۔۔۔۔۔ ”اے پھل فروش! ایک بہت ہی غریب آدمی لذیذ خوبانی کی آرزو رکھتا ہے۔ تو مجھے آدھ کلو خوبانی بطور خیرات عطا کر کہ میں اس کی دیرینہ خواہش پوری کروں۔۔۔۔۔“

پھل فروش نے قہقہہ بلند کیا۔۔۔۔۔ ”واہ میں نے ان گنت فقیر دیکھے لیکن آج تک خیرات میں خوبانیاں مانگتے کسی کو نہ پایا۔ تم جیسے ٹھگلوں کو میں خوب پہچانتا ہوں رستہ ناپو۔“

تینوں کچھ فاصلے پر جا کر کے تو درویش بولا۔۔۔۔۔ ”اے بادشاہ یہ شخص سارے

بازار میں اپنی دولت کے باعث عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن میرے نزدیک نا کارہ۔ اس کی جانب مت دیکھ کہ یہ اپنے لیے جنت کا سودا بھی نہ کر سکا۔ ملک کی خوشحالی کا باعث کیوں کر ہو جاتا؟“

گھومتے پھرتے، ٹہلتے وہ دریائے کابل کے پل پر پہنچے۔ یہاں وزیر با تدبیر اور درویش نے مل کر بادشاہ سلامت کو دریا میں دھکا دے دیا۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو بادشاہ پیرا کی کے فن سے نا آشنا تھا۔ غوطے کھانے لگا۔ جان برب ہوا۔ پل کے کنارے کا کا دیوانہ کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جونہی بادشاہ کو ڈوبتے پایا تو قہقہے لگاتا روانہ ہو گیا۔۔۔۔۔ دریں اثنا بہت سے لوگوں نے بادشاہ با وقار کو ڈوبتے دیکھا اس کا واویلا سنا لیکن سب نظر بچا کر اپنی اپنی راہ چل دیئے۔

جب ظل الہی کے حواس درست ہوئے تو اس نے اس حرکت کی وجہ دریافت کی۔ درویش نے کہا۔۔۔۔۔ ”دیکھ بادشاہ! جب ہم پل پر پہنچے تو میں نے کا کا دیوانہ دیکھا۔ اس جیسا نا کارہ شخص سارے کابل میں نہیں۔ ذرا عقل ہے۔ نہ اپنے بھلے کی سوچ سکتا ہے نہ کسی کی فلاح کا باعث بن سکتا ہے، لیکن لمحہ فکر یہ تو یہ ہے کہ بحران کے وقت یہی دیوانہ کار آمد کام آیا۔“

اب جن ضلیل القدر بادشاہ یمن لوٹا تو اس کھوج میں رہنے لگا کہ علم کے حامل کی ضرورت علم کے توسط سے پوری کرے اور فاتحوں سے بیزار لوگوں تک ان کا مطلوب پہنچے۔ اس جنگ و دو میں بادشاہ راب کو بھیس بدل کر نکلتا اور انس کی اصلی طلب کی کھوج لگاتا۔ برسوں بھیس بدل کر نکلتے رہنے سے اس کی بصیرت میں اضافہ ہوا۔۔۔۔۔ لیکن ایک بات سمجھنا اس کے لیے پھر بھی محال رہا کہ نا کارہ کو کیسے کار آمد سمجھے حتیٰ کہ غنیم نے اس پر چڑھائی کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔۔۔۔۔ ایک دیوانہ وزیر با تدبیر کے پاس حاضر ہوا۔ کہنے لگا۔۔۔۔۔ ”دیکھ راتوں رات ساری فوج کو قریبی دریا میں چھپا دے۔ جب دشمن کو یقین ہو جائے کہ خطرہ نہیں فوج دریا سے نکل کر قلعے پر حملہ کر

”بالکل ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“

”کچھ دیر کے لیے یہاں ہمارے پاس آ جائیں ابو۔۔۔۔۔ میں ٹکٹ بھجوا

دوں؟“

”نہیں نہیں ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ میں خود ہارون کو دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ کتنا بڑا ہو گیا

ہے وہ۔“

”اب تو وہ سکول جانے لگا ہے ابو۔۔۔۔۔ پوری پوری باتیں کرتا ہے“

”ہاں۔۔۔۔۔“ دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھی۔۔۔۔۔ انسان کتنا مجبور ہے!

میں اپنے پوتے کی باتوں سے بھی آشنا ہوں۔۔۔۔۔ میں اپنی اصغری کے سائے

سے بھی محروم ہوں اور اب اقبال کی ہلکی پھوار بھی مجھ پر نہیں پڑتی۔

”پھر آ آ جائیں ناں پوتے کو دیکھنے۔۔۔۔۔“

”ابھی تو بچے اکیلے ہیں۔ بلالا اور ارجمند جاپان گئے ہوئے ہیں“

پتہ نہیں کیا بات تھی۔ میں جہانگیر کے گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔۔۔۔۔ وہاں بھی خالی

دن اور خالی راتوں کا ہی سامنا تھا۔

ارجمند کو جاپان سے لوٹے دس بیس دن گزر گئے تھے۔ واپسی پر اس نے مجھ سے

سرسری طور پر اقبال اور اس کے میاں نثار کے متعلق پوچھا وارتت کر کے چپ ہو

گئی۔ میں کارڈلیس لے کر ہیلکونی میں بیٹھا تھا۔ جہانگیر کا فون پھر آ گیا۔ شاید وہ کسی

قسم کے احساس جرم میں مبتلا تھا۔

”ابھی پھر کیا پروگرام ہے آپ کا۔۔۔۔۔“

”یار میں کچھ سفر سے گھبراتا ہوں۔۔۔۔۔“

”میں کار میں آپ کو لینے آ جاتا لیکن نہیں ملی ابو۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ تم کہاں مجھے مل واکے سے بیٹے آئیں گے۔“

”یہاں فاصلے بے معنی ہیں ابو۔۔۔ امریکن ہوائی جہاز کے مقابلے میں کار کو پسز کرتا ہے آزاد جو ہوا۔۔۔۔۔۔“

پتہ نہیں شاہدہ نے اس سے فون لے لیا یا نہیں پھر جہانگیر نے اسے چونکا کپڑا دیا۔۔۔

”ابو السلام علیکم۔۔۔“ بسوجی بولیں۔

”وعلیکم السلام وعلیکم“

فون پر مجھے شاہدہ کی آواز دوستانہ لگی

”آجائیں ناں ابو۔۔۔ جہانگیر کبھی کبھی بہت اداس ہو جاتے ہیں۔ لاہور انہیں

بھولتا نہیں۔ کار کا سفر لمبا ہے۔ ٹکٹ بھجوادوں۔۔۔۔۔۔“

”کیسے بھولے بیٹا۔۔۔ لاہور لہور ہے“ میں خوش دلی سے اضافہ کرتا ہوں۔

”واپس لوٹنے سے ایک بار پہلے تو ہمارے پاس آجائیں۔۔۔“

میں پچھلی ساری سرد مہریاں بھلا کر جواب دیتا ہوں ”یار میں سفر سے بہت گھبراتا

ہوں۔ اتنے لمبے لمبے تو ایئر پورٹ بنا رکھے ہیں تمہارے امریکنوں نے۔۔۔ چل چل

کر آدمی ہف جاتا ہے۔۔۔۔۔“

”نہیں ابو ضرور آئیں ہمارے گھر سے کوئی تین منٹ کے فاصلے پر ایک

مسز غار رہتی ہیں۔ ابو۔۔۔ وہ آ کی بہت باتیں کرتی ہیں۔ میری بڑی مند جیلہ کی

کھلی ہیں۔ کل بتا رہی تھیں کہ آپ بڑے اچھے شاعرے ہیں کہ سیدھی سیدھی پڑھتے

تھے۔۔۔“ میری شاعری کو جاننے والی اس کے علاوہ اور کون تھی؟

یکدم میرا پروگرام بن گیا۔

میں اپنے پوتے کو دیکھنے جا رہا تھا۔

”اچھا یہ بتاؤ ایئر پورٹ گھر سے کتنی دور ہے“

”دس منٹ لگتے ہیں کل“

”بس اس ویک اینڈ پر تمہارے پاس ہوں گا۔۔۔۔۔“

میں اسے یہ نہ بتا سکا کہ وہ اقبال کو بھی اطلاع کر دے اور ہارون کو بھی۔ شام سے پہلے میری جیب میں مل واک کی کانکٹ تھا۔

بلال نے اپنے بریف کیس گاڑی میں رکھا اور مجھے دیکھ کر کہا۔۔۔ ”ابو جی اس ویک اینڈ پر ہم سب پاکستان اسمبلی جا رہے ہیں۔ انکل نار آپ سے منے کے آرزو من ہیں۔“

مجھے اب واشنگٹن جانے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

”اوہ۔۔۔ میں تو اس ہفتے مل واک جا رہا ہوں بیٹے ہارون کو دیکھنے۔۔۔ ارجمند میرا کانکٹ بھی لے آئی ہے۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ آکو میں ان کے گھر بھی لے جاتا۔۔۔۔۔“

میرے لیے ٹریڈ منسٹر انکل نار اب کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مل واک میں اصلی اقبال موجود ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے دو مرتبہ جہانگیر کے گھر فون کیا لیکن گھر پر کوئی موجود نہ تھا۔ پھر رات گئے شاہدہ کا فون آ گیا۔

”ابو جی سلام۔۔۔“

”وعلیکم۔۔۔۔۔“

”ابو جی آپ کا پیام مہاتما مشین answering پر، افسوس ہم لوگ گھر نہیں

تھے“

میں نے خوش دلی سے پوچھا ”نوجہیں کہاں گئی ہوئی تھیں؟“

”وہ آٹنی اقبال تھیں ناں مسسز مٹار ... وہ Long Island چلے گئے
 ہیں، ساتھ ساتھ ہم ان کا سامان بیک کر رہے تھے، ساتھ ساتھ باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ
 رفعت آپا سے بہت چھوٹی تھیں تو دوستی کیسے ہو گئی ابو۔۔۔“
 ”بس کبھی کبھی ایسے بھی ہو جاتا ہے۔۔۔“ بھلا اب میں اس چھلاوے کو اور کہاں
 تلاش کروں؟

”تم نے انہیں بتانا تھا کہ میں شاید آؤں۔۔۔“
 ”یہاں تبدیلی Rule of the Game سے کوئی امریکن ایک ہی جگہ جم کر
 نہیں بیٹھ رہتا۔ جہانگیر بھی اوہائیو جانا چاہتے ہیں، بس آٹنی نے ارادہ کیا اور چل
 دیں۔“

”جی ابو کیوں فون کیا تھا آپ نے۔۔۔“
 ”بس تمہیں یہ بتانا تھا شاہدہ کہ میں آنہیں سستا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔“
 مجھے یوں لگا جیسے شاہدہ دوسری جانب رو پڑی ”آپ ہارون سے ملنے بھی نہیں آ
 سکتے ابو؟“

پر دیس میں یوں بھی ہوتا ہے۔۔۔ سر بھی اچھا لگنے لگتا ہے۔۔۔ بہو۔۔۔ سرے
 کا بھی انتظار کر سکتی ہے۔

اصغری کی گمشدگی سے جو خلا پیدا ہوا، اس سے گھبرا کر میں باہر کی طرف
 دوڑتا۔۔۔ ہم دونوں ایک عرصہ تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی الگ
 الگ رہے تھے لیکن اصغری کے بعد اب گھر کی سے مجھے فاصلے کی رفاقت کی کوئی
 شعاع نہیں ملتی تھی۔ ایک دن مجھے پنواڑی کی دکان پر عارفین مل گیا۔

ہم دونوں سکول میں اکٹھے رہے تھے۔ نہ ہم پہلے کبھی دانت کاٹی روٹی کھاتے
 تھے، نہ ہی ہمارے درمیان کوئی خاص رابطہ بن سکا لیکن اصغری کے بعد ماضی سے

رابطہ جڑ گیا اور چونکہ میں مستقبل میں سوائے موت کے اور کسی چیز کو حتمی طور پر بدل نہ سکتا تھا، اس لیے میں نے عارفین کے روپ میں ماضی کو اپنا لیا۔ بد قسمتی سے اسی مجبوری کی وجہ سے میں عارفین سے مکمل طور پر مات بھی کھا گیا۔

یہ بات نہیں کہ وہ مجھ سے طاقتور تھا یا مالی طور پر وہ مجھ سے بہتر تھا۔ شکل و صورت بھی اس کی واجبی سی تھی۔ وہ ٹوون مقابلے میں وہ مجھ سے کمتر تھا۔۔۔۔۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ مجھے اس کی ضرورت تھی اور ضرورت ہمیشہ مجبوری کو جنم دیا کرتی ہے۔ میں اپنے خاں دنوں کو کسی کے نام معنوی کرنا چاہتا تھا۔ عارفین نے مجھے اس لیے قبول کیا کہ اسے کسی میڈل کی اشد حاجت تھی۔ اس نے مجھے شکست دے کر یہ میڈل اپنے سینے پر سجا لیا۔ اس اضافی تمنے نے اس میں عجیب قسم کی خوش اعتمادی پیدا کر دی جو شاید اس میں اس سے پہلے نہ تھی۔

کبھی ہم دونوں تاش کھیلتے، کبھی شہرنج کی بازی لگ جاتی۔ کبھی ہم سیر کو نکل جاتے، سارے راستے وہ اپنی بیوی کے رویے کی شکایتیں کرتا رہتا کہ کیسے وہ ساری کی ساری اپنے بچوں میں صرف ہو چکی ہے اور بڑھیا کو علم ہی نہیں کہ عارفین بڑھے کے دن رات، ماہ مہینے، سال بہ سال کن حالوں میں گزر رہے ہیں۔ بڑھا صبح کی بیڈٹی سے لے کر رات کو فریج ٹوٹتے رہنے تک خود کثالت کے مختلف مرحلوں سے گزرتا تھا۔ اصفری کی طرح بڑھیا نے ایک مدت سے اپنا بیڈ روم علیحدہ کر لیا تھا اور اپنی خوابگاہ میں وہ اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں، بہو بیٹیوں کے درمیان مجسٹریٹ، نرس، دایا، آیا، کی حیثیت میں پر بہار زندگی گزارتی تھی۔ اس اہمیت میں گم ہو کر اسے بھول گیا تھا کہ عارفین لمبے وقفوں کے لئے اکیلا ہی وقت کے خلاف ڈنڈ بیٹھکیں نکال رہا تھا۔

میں عارفین کو اپنے متعلق کچھ بتانے کی کوشش کرتا۔ ارجمند اور جہانگیر کی کج ادائی، بے وفائی، کم الفتی کا ذکر چھیڑتا تو وہ سنی ان سنی کر دیتا۔۔۔۔۔ اسے میری

مشکلات کا کوئی اندازہ نہ تھا۔۔۔ نہ ہی وہ میرے حالات معلوم کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

”چھوڑو یا رچھوڑو۔۔۔ بچوں سے آس لگانا چھوڑ دو۔ تم اپنی توقعات سے ان کی راہیں کھوٹی کر دو گے۔۔۔ پہلی بیوی کی طرح رقبت کو زندگی نہ بناؤ۔۔۔ بڑھاپے کو صرف بڑھیا بھر سکتی ہے۔ پہلی مرگئی مرنے دو۔۔۔ مناجان نہ سہی چنا جان سہی۔ کسی طلاقن بڑھیا کا سراغ نکالو اور گھر ڈال لو۔۔۔ جب تم دو ایساں پیئے لگو تو گلاس پانی کا لے کر حاضر ہو جائے۔ در دستائے تو گرم پانی کی بوتل بنالائے۔۔۔ فجر کا الارم بجتا چلا جائے تو الارم بند کر دے۔ جھینگڑوں کی آواز ستائے تو پچکاری پھک‘ پھتق کر دے کیڑے مار دوائی ڈال دے۔ گھنٹی سن لے۔ فون کا جواب دے ڈالے۔۔۔ چھڑی پکڑائے۔۔۔ بھائی شادی کر لو کسی بیوہ سے لیکن اس کے بچے نہ ہوں۔ تمہاری تنہائی کا اور کوئی علاج نہیں۔۔۔“ میری نظروں میں کہیں اقبال آ کر تک جاتی اور ہماری سیر اور لمبی ہو جاتی۔ مستقبل کو سوجانے کے لئے یہی ایک خواب رہ گیا تھا، لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اقبال کہاں ہے؟ اور کن حالوں میں جی رہی ہے؟

”تم کو یہ سارے انعامات جو ابھی تم نے گنوائے ہیں، مل رہے ہیں بھابھی نہ بے“

”بتانا ہوں ناں تمہیں۔ زینب تو اب اپنی مجسٹریٹی میں مشغول ہو گئی ہے۔ وہ اپنا اقتدار اہیت چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔۔۔ اپنے بیڈ روم سے۔۔۔ وہ عارفین سے آزاد ہو چکی ہے“

”تو پھر تم دوسری شادی کر لو۔۔۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں دو بہنوں سے شادی کر لیں۔۔۔“ میں مشورہ دیتا۔

”میرے گھر والے مجھے گھر سے نکال دیں گے یا ر جی۔۔۔ وہ سارے کے سارے زینب بڑھیا کے ہاتھ پر بیعت ہیں“ وہ سر ہلا چلا جاتا۔

”تم میری طرف شفٹ کر جاتا ... ڈیفنس کی یہ کوٹھی دو گھرانوں کے لئے بہت بڑی ہے ... تم اوپر رہنا میں نیچے ...“

میرے تخیل کو پر لگ جاتے۔ میں سوچتا شاید اب تک تو اقبال بیوہ ہو چکی ہوگی ... کوئی اس کی کزن وغیرہ بھی آخری عمر کا سہارا چاہتی ہوگی ... ہم بڑھوں سے شادی کرنے پر وہ دونوں رضا مند ہو جائیں گی اور جیتے جی باب جنت کھل جائے گا ... نوکروں کے آگے خوشامدی لہجے اختیار کرنے کا موسم، ان کے انتظار کی صعوبت اور نوکروں کو مسلسل بخشش دیتے رہنے کی مصیبت ختم ہو جائے گی۔ پھر خیال آتا اگر اقبال کے بچے ہوئے اور انہوں نے اڑچن ڈالی تو؟ ... میں عارفین سے کبھی اندر کی بات نہ کر سکا۔

ہمیں دونوں بڑھاپے میں دوسری شادی پر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ کئی اسکیمیں بنائیں، فیصلے ہوتے لیکن آخر میں عارفین کہتا ... ”چھوڑو یار ... اس عمر میں کیا جھک ماریں ... ساری عمر بھورا بھورا کر کے عزت جمع کی ہے، ایک ہی ہلے میں سب بہہ جائے گی۔ لوگوں کو کیا معلوم بڑھوں کو بھی مرنے سے پہلے تھوڑی سی ہمدردی، آرام، سہولت درکار ہے؟ ہمیں تو محلے والے، گھر کے لوگ سارے کبھی کامیابی صاحب چھوڑ آئے ہیں۔ اب کیڑے جانیں اور ہم ... منکر نکیر سمجھیں اور ہم سمجھائیں چھوڑو یار تھوڑا وقت رہ گیا ہے اوکھے سوکھے کاٹ لو“

عارفین کے ساتھ بھی میرا رشتہ عجیب سا تھا۔ مجھے اس کا ہر وقت انتظار کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی تو راہ دیکھنے کا وقفہ اتنا لمبا ہو جاتا کہ مجھے لگتا زندگی کا وقت تھوڑا نہیں بلکہ بہت زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔ وہ وعدے کے مطابق کبھی نہ آتا، کبھی میں گیٹ پر کھڑا بار بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے اس کا انتظار کرتا۔ پہلے میرے انتظار میں تھملا ہٹ ہوتی، پھر یہ طیش کی شکل اختیار کر لیتا۔ میں سوچتا اس سے تو بہتر تھا کہ میں انہیں ہن بھائیوں سے رشتہ جوڑ لوں ... وہ لوگ سٹیٹس میں مجھ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ مجھے اب ان کی

کربل کربل باتوں سے گھن آتی تھی۔ پھر مجھے یہ خدشہ ستاتا کہ وہ لوگ میرے پیسے اور سٹیٹس سے تو رشتہ جوڑ لیں گے، لیکن مجھے شاید تروتازہ نہ کر پائیں۔ دائم المریض شاہد بھائی ابا اماں کے بعد ٹمپل روڈ والے گھر پر ہی رہ گئے تھے۔ ابھی تک ہال روڈ کی چھوٹی سی دوکان کے مالک تھے، لیکن ان کا طرز زندگی ایسا تھا جس میں دیمک جیسی چھوٹی بڑی مصیبتیں جنم لیتی رہتی تھیں۔ بچوں کی تعلیم کے مسئلے، گھر والی کے خرچے کے مسائل، یوٹیلیٹی بلز کی ادائیگی کا رنڈی رونا۔۔۔ وہ گھر اس قدر معاشی بد حالی کا شکار تھا کہ مجھے وہاں جا کر احساس جرم ہونے لگتا۔ شاہد بھائی یا تو دے کے الٹیک میں داخل ہوتے یا داخل ہونے والے ہوتے۔ ان کا سانس اکھڑا دیکھ کر مناسب بات بھی نہ ہو سکتی۔ ویسے بھی طبقاتی اونچ نیچ گفتگو میں رکاوٹیں پیدا کر دیتی ہے۔ جب کبھی میں وہاں جاتا، جیب بھاری کر لیتا۔۔۔ واپسی پر مجھے لگتا جیسے ٹمپل روڈ میں مجھے آنسوؤں بھرے دہشت گردوں نے لوٹا لیا۔۔۔

رفعت آپا کراچی رہتی تھی۔ کبھی کبھی عید پر ملاقات ہو جاتی تو مجھے اس کے بچوں کے نام بھی ٹھیک سے نہ آتے۔۔۔ فریدہ اور ظفر دونوں جرمنی میں تھے۔۔۔ ان تارکین وطن کی اصل کہانی سے کوئی واقف نہ تھا۔ شاہد کی بیوی ان کی باتیں کیا کرتی تھی، لیکن میں نے کبھی ان دونوں کا سراغ لگانے کی کوشش نہ کی۔۔۔ ابا، اماں نے گھر سے رخصت ہوتے ہی ہم سب کو آزاد کر دیا تھا۔ میں ایک کمفرٹبل زندگی کو مسائل کے حوالے نہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اطلاع اور انتظار دونوں سے خوف آیا تھا۔ پھر بھی میں صبح و شام اچھے دنوں کا انتظار ہی کئے جاتا۔ گویا یہی زندگی کا اصل مفہوم ہو۔

عجیب سی بات ہے لیکن عارفین مجھے انتظار کروانے بغیر کبھی نہ آیا۔ کچھ دیر غصے کی حالت میں ٹہلنے کے بعد میں مکمل طور پر اضمحلال اور شکست میں بدل جاتا۔ خود ترسی کا شکار، اپنی حالت زار پر دل شکستہ اس کے آنے تک میں مکمل طور پر پسپا ہو جاتا۔

وہ گاڑی سے اترتے ہی بڑے زور و شور سے آئی ایم سوری آئی ایم ویری سوری کے

نعرے لگاتا۔ اس کی کھلی کھلی مسکراہٹ، صاف اجلے کپڑے، شو شائین والے بوٹ
دیکھ کر میری تھکاؤٹ کم ہونے لگتی اور میں آئی ایم سوری پر اکتفا کر کے اس کے ساتھ
ساتھ اندر کی طرف چل پڑتا۔

عارفین نے ہمیشہ وعدے توڑے۔ اس کے نزدیک ہر نیا وعدہ پچھلے وعدے کی
توسیع تھا۔ اول تو وہ پیسے لے کر کبھی واپس نہ کرتا اور اگر کبھی اس نے رقم واپس بھی کی تو
قسطوں میں ... گویا رہٹی چلا دی۔ ہمیشہ پوری رقم لیتا اور کبھی سالم ادا نہ کرتا۔ میرے
ہر پروگرام میں مجھ سے پہلے شریک ہوتا، لیکن جونہی سیر و تفریح کا کوئی پروگرام وہ اپنی
فیملی یا کسی دوست کے ساتھ علیحدہ طے کرتا، فوراً میرا پیسہ کاٹ کر ان کے ساتھ شامل ہو
جاتا۔ مجھے ان تفریحات کی تفصیل ہمیشہ بعد میں الیم کی تصویروں کی طرح الٹ پیٹ
کر دکھایا کرتا۔ اس کا خاندان، دوست، شکار، اخبار بینی، کتب بینی کے مشاغل میں
میرا کوئی گزرنہ تھا

میں ڈیفنس کی چارکنال کوٹھی میں صرف عارفین کے انتظار کی رسی سے بندھا کتا
تھا۔ میں نے نہ تو بھاگ جانے کی سوچی، نہ عارفین کو چھوڑ دینے کا خیال ہی کبھی مجھے
آیا۔

میں نے اس کے سامنے ہمیشہ ہار مانی

وہ طاقتور فاتح سکندر تھا۔ بگ باس، سرجی! فیصلے صادر کرنے پر قادر۔ اس نے
اپنے کسی رویے سے اپنے عمل کی Explanation کبھی نہ دی۔ میں اگر کسی
معاملے میں ذرا سا بھی قصور وار ٹھہرتا تو ادنیٰ چپڑا سی، کلرک، خانساں کی طرح جواز
پیش کرنے لگتا۔ غلط ہو کر بھی اس کی گفتگو الزامی ہوتی۔ درست ہوتے ہوئے بھی
میری باتوں پر اس کا غصہ جائز لگتا۔ وہ بھڑکتا ... ”تم جیسے کلرکوں کو چھڑکیاں ہی کھانا
پڑتی ہیں اور شوکانوٹس بھی کبھی کبھی ہاتھ میں آ جاتا ہے ... تمہاری پرنسپلٹی اتنی دولت
کے باوجود دبو ہے۔ یہ سارا تمہاری پینڈ و بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ہے۔“

”آئی ایم سوری یار“ میں کہے جاتا۔

لیکن بگ باس کبھی میری ”سوری“ کو قبول نہ کرتا اور جھڑکتا چلا جاتا۔

کوٹھی بہت بڑی تھی۔ میرا رول اس کوٹھی میں رکھوالے کا تھا۔۔۔ بھونکتے رہنا، چوکیداری کرنا، رائگ نمبر کے فون سننا، دروازے کنڈیاں بند کرنا کھولنا، ارجمند اور جہنگلیر کے فون کے انتظار میں رہنا۔۔۔ دھوئی، دودھ والے، اخبار کے ہاکر سے دوستی کرنا، کوٹھی سے نکل کر گیٹ پر کھڑے ہو کر آتے جاتے لوگوں کو سلام کرنا، غریبوں کو خیرات دینا، کوئے چیلوں کو صدقے کا گوشت پھینکنا، لان میں مالی کو شرمندہ کرنے کے لئے جڑی بوٹی نکالنا۔۔۔ میں نیاپنے لئے کچھ چھوٹی چھوٹی اذیتیں ایجاد کر لی تھیں، کیونکہ ان اذیتوں کے علاوہ میرا کوئی مصرف نہ تھا۔۔۔ باقی بچے ہوئے وقت کو میں نے مارفین کے انتظار اور اقبال کی یاد کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر اچانک ایک واقعہ ہو گیا۔

اس دن عارفین بڑے سادہ سے شلوار قمیض میں آیا، اس کی نمک مرچ داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی اور یوں لگتا تھا گویا وہ رویا سا ہے۔ میں عارفین کا انتظار بھی نہیں کر رہا تھا کہ وہ اچانک وارد ہو گیا۔۔۔ یہ بھی عجیب بات ہوئی۔

ہم دونوں آگے پیچھے اندر کی طرف چل دیئے۔

”سیر کو چلیں، موسم اچھا ہے۔“

”نہیں یار یہیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔“

ہم دونوں شطرنج والی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ میں نے میز کے ساتھ لگی ہوئی گھنٹی

بجائی۔۔۔ مودب، چالاک غلام نبی آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس شام وہ اس معمولی سروں کے بدلے مجھ سے ادھار مانگے گا۔ چھٹی۔

”کافی لائے کریم کے ساتھ“

”ناں ناں جی نہیں چاہتا۔۔۔۔۔“

”ہاں ...“

”چلو چائے لاؤ“

غلام نبی درخواست ہو گیا

ہم نے شطرنج پر مہرے جمائے۔ دو چالیں چلنے کے بعد عارفین نے کہا ... ”بش

یار جی نہیں کرتا“

”تاش نکالو ...“

”ہاں یار ... دو آدمیوں میں ... فلاش کھیل کر مزہ نہیں آتا ...“

”تو پھر تیسرے آدمی کی تو چوائس ہی میرے پاس نہیں ہے“

عارفین دونوں گھٹنے کھول کر ان پر ہاتھ جمائے بیٹھا تھا۔ پھر کہیں سے مغرب کی

اذان سنائی دی۔ وہ سیدھا غسل خانے میں چلا گیا، میں نے باورچی خانے کا رخ کیا

اور اس کی پسند کی کافی بنا کر لوٹا تو وہ سر پر رومال باندھے ایک کونے میں سامنے کھن

رکھ کر نماز پڑھنے میں مشغول تھا۔ چند لمحوں میں نے اس کی کمر کو گھوڑا تو مجھے یوں لگا

جیسے وہ رو رہا ہو۔ جب تک وہ مغرب کی نماز پڑھ کر اٹھ، کریم بی کافی ٹھنڈی ہو چکی

تھی۔ وہ سر سے رومال اتارتا ہوا کچھ اکتایا سا آکر صوفے میں دھنس گیا۔

”بھائی صاحب تم نے تو کافی برف کر دی۔ مجھے بتا دیتے میں کافی نہ بناتا“

”ٹھیک ہے چلے گی“ اس نے پیاں اٹھ لی۔

یہ میرے لئے عجیب سی بات تھی، کیونکہ عارفین کھانے پینے کے معاملے میں بہت

نازک مزاج تھا۔ گرم چائے، الہتی کافی ... درست نمک مرچ، اچھی بھنائی والا

گوشت، خستہ چیزیں، لذیذ کھانا بروقت حاضر نہ ہونا تو وہ چڑچڑا سا ہو جاتا۔ اچانک

کھاتے کھاتے وہ کہتا۔ ”یار! اس غلام نبی کو نکال دو۔ یہ ہدیٰ کچی رکھتا ہے۔“ میرے

لئے یہ علم بالکل نیا تھا کہ ہدیٰ کچی رہ سکتی ہے، اسے بکرے کے تمام اعضاء کا ایسے

علم تھا جیسے میڈیکل کے طالب علم کو گھرے کی کتاب سے علم الابدان حاصل ہوا کرتا

ہے۔ وہ بتایا کرتا کہ پٹھ کا گوشت کس سبزی میں پڑے گا، گردن کا شور بہا اور دتی کا حلیم کیسے تیار ہوتا ہے۔ ران کے روسٹ کی ترکیب کس نائی نے اسے سکھائی تھی؟ پسندے کٹوانے سے پہلے کیا احتیاطی تدابیر قصائی کو بتانا ضروری ہیں؟ چانپ کو کیسا مسالہ لگایا جائے؟ ... اسے شاہی باورچی ہونا چاہئے تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ سارا علم کتابی تھا۔ چسکے کی حد تک وہ یہ ساری انفرمیشن دے سکتا تھا ورنہ نہ تو اس نے کبھی باورچی خانے کی شکل دیکھی تھی، نہ کبھی کسی نے اسے باورچی خانے میں گھسنے دیا تھا۔ وہاں پر بڑھیا زینب کا کٹ سکے چلتا تھا۔

ٹھنڈی کافی کے کھونٹ وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد پی رہا تھا۔

”یار ابھی مائیکرو اون میں گرم کر لاتا ہوں ...“

”بس ٹھیک ہے ...“

کافی کے بعد وہ کچھ دیر خالی الذہن ہونق سا بیٹھا رہا۔

”یار چلو سیر کے لئے چلیں۔ واپسی پر آئس کریم کھائیں گے ...“

اس کے چہرے پر ایسی ناگواری آئی جیسے میں نے کوئی گالی دے دی ہو۔

”نہیں ...“

”کیا بات ہے ...؟“

”بس موڈ نہیں ہے ...“

”یہ کیا بے ہودہ ٹنکار ہے۔ اٹھو چلیں ...“

وہ غصے سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔ چند لمحے بعد اس کی کار شارٹ ہو گئی۔ پتہ نہیں

کیوں میں نے بھی باہر جانے کی زحمت نہ کی۔ میں اس کے کافی لاڈلہ چکا تھا اور اندر ہی اندر میں نے بھی کچھ شکایتیں پال رکھی تھی۔

چند دن اپنے اپنے انتر بھاؤں میں گزر گئے۔ پھر ایک رات گئے اس کا فون آ گیا۔

”وہ میں کل آؤں گا ... تم سے کچھ بات کرنا ہے“

”کب آؤ گے ...“ میں نے رسان سے پوچھا

”مغرب کے بعد ...“

وقت بتانے کا یہ طریقہ مجھے اس کے منہ سے عجیب لگا۔ پھر بھی میں ہمیشہ کی طرح انتظار کی چرخی سے بندھ گیا۔ وہ مغرب کی اذان سے ٹھیک آدھ گھنٹہ بعد حاضر ہو گیا۔ اس نے قانوسے کا چہرہ آج پہلے سے بھی زیادہ مدقوق نظر آ رہا تھا۔ دبلا پتلا، سنیک سلائی، رفین مجھے اصلی عمر سے زیادہ لگا، اس کے ہونٹ دونوں جانب لٹک رہے تھے ... آنکھیں غم تھیں۔ ماتھے کی لکیریں بہت نمایاں نظر آ رہی تھیں اور پہلے بار مجھے لگا کہ کسی چوٹیل جانور کی طرح اس کے کان کلوں سے باہر نکل آئے تھے۔

میں نے عارفین کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا اور تر تر تھا، یہ پسینہ نہیں تھا۔ موت سے پہلے کی ٹھنڈی تریلی تھی۔ ہم دونوں جب اندر پہنچے تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کچھ کانپ بھی رہا تھا۔

”ٹیٹھو کیا ہوا؟ ...“

عارفین کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

”کچھ نہیں۔ تاش نکالو“

میں نے اس سپورٹن اداسی سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور تاش پھینٹنے لگا۔ اس کی نگاہیں تاش کے پتوں پر نہیں تھیں۔ وہ کھڑکی سے باہر لان میں کچھ دیکھ رہا تھا۔

”چال چلو ...“

اس نے اپنا پتہ چھانٹ کر پھینک دیا اور ڈھیری میں سے نیا پتہ نکالا۔ دو تین ہاتھ میں ہی اس کی رمی بن گئی اور اس نے شوکرا دیا، لیکن اس جیت نے اسے رتی بھر خوشی نہ دی، اس کا چہرہ کسی پرہیزگار بوڑھی عورت کی طرح جھریوں بھرا تھا۔ وہ بے یار و مددگار انداز میں بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہم نے دو چار بازیاں کھیلیں اور ہر بار وہی جیتا۔ اگر وہ پہلے والے عارفین ہوتا تو کسی پاکھنڈی کی طرح، کبھی اچھلتا، کبھی تالیاں بجاتا، کبھی مجھے

چھبیاں دیتا لیکن اب وہ خیانت کرنے والے بدعتی کی طرح مجھ سے آنکھیں چرا رہا تھا۔

میں نے تاش جمع کر کے ایک طرف رکھ دی اور معذرت سے بولا ...
”عارفین میں تمہارا پگڑی بدل دوست نہ سہی، لیکن میں تمہارا خیر خواہ ضرور ہوں۔
مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے۔“

”تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بتانے کا فائدہ؟ ...“

”چلو ... اور کچھ نہ کر سکا تمہارے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا“

”یہ ایسا کلیش ہے جس کا کوئی علاج نہیں ...“

”چلو تم بیان تو کرو بھائی“

آنکھیں موند کر اس نے سرکسی سے نکالیا ... ”ہر عہد کی اپنی آزمائشیں اپنے دکھ
... بچپن میں کھیلنے کو نہ ملے تو دکھ ... جوانی میں محبوبہ کا روگ لگا رہے ہو گھڑی ... پھر
شادی رچالے بڑی امید کے ساتھ اور بیوی گھاس نہ ڈالے۔ گرہت کی کڑکی میں مرا
ہوا چوہا بن کر گزارے ساری ادھیڑ عمر، لیکن یہ دکھ کچھ بھی نہیں۔ بڑھاپے کا دکھ تو ایسے
ہے میاں، گویا بیلنے میں سارا وجود آگیا ہے۔“

میں چپ رہا۔ میرا خیال تھا ہنکارا بھرنے سے وہ چپ ہو جائے گا۔

”اولاد اور مال کی آزمائش تو سب سے بڑا دکھ نکالا۔ گھوڑا گھڑ دوڑ کی ہرٹس ٹاپ سٹا
ہے، لیکن اولاد کی آزمائش کو نہیں ٹاس سٹا ... ہمایوں۔“

اس کے بعد اس نے مجھے آہستہ آہستہ اپنے بیٹے خلیل کے متعلق بتانا شروع کیا۔ وہ
اسلام آباد میں فیڈرل حکومت کا بہت ہی سینئر افسر تھا اور اس پر لاکھوں کے غبن کا کہیں
تھا۔ اس وقت اسے Suspend کر کے انکوائری چل رہی تھی اور اہلے دودھ کے
جھاگ کی مانند اس کی چھوٹی بڑی برائیاں بڑھ چڑھ کر اخباروں میں چھپ رہی تھیں۔
پتہ چلا کہ وہ ہاؤس ارسٹ میں تھا۔ اس کا پاسپورٹ ضبط ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔

عارفین کی باتوں سے احساس ہوا کہ خلیل خاں نے جو فاختائیں اڑائی تھیں، اسے مہنگی پڑیں۔ اب نوکری بھی جاتی نظر آتی تھی۔ اوپر سے جس عزت کو حاصل کرنے کے لئے اتنے داؤ بیچ کھیلے تھے، وہ خاک میں مل گئی۔ عارفین تو اس قدر خوفزدہ نظر آتا تھا کہ اسے دیکھ کر لگا کہ خلیل خاں کو اگر جیل ہوگئی یا مقدمہ چلا..... یا جائیداد ضبط ہوئی تو وہ خبر سنتے ہی عارفین فوت ہو جائے گا۔

”کہتا ہوں.... جب جب اسلام آباد گیا سمجھایا اپنی بہو صوبیا کو کہ اتنے ٹھاٹھ ٹھیک نہیں۔ اکیسویں گریڈ کے افسر کی اتنی تنخواہ نہیں ہوتی کہ وہ دو کاریں، چار ملازم اتنی سوشل لائف رکھے.... یہ جاگیر داروں کا رخانے والوں کے چو نچلے ہیں تو پتہ ہے صوبیا کیا کہتی تھی۔ ابا جی! آپ فکر نہ کریں۔ ہم افورڈ کر سکتے ہیں۔ پھر جس سرکل میں ہم Move کرتے ہیں، ان کا یہی معیار زندگی ہے۔ اب ہم اردو میڈیم سکول میں تو بچے نہیں بھیج سکتے ناں.... آپ کو پتہ ہے تنخواہ میں سے تو صرف بچوں کی فیس جاتی ہے یونیٹی بلز بھی پورے نہیں ہو پاتے۔“

”تم فکر نہ کرو.... اللہ مالک ہے۔ وہ کوئی صورت نکالے گا.... دیکھتے جانا کوئی نہ کوئی ہادی ہاتھ پکڑے گا“ عارفین کو میں اعتقاد کے بغیر تسلی دیتا۔

”ہاں جی.... وہی آخری سہارا ہے.... میں تو کسی منسٹر وغیرہ کو بھی نہیں جانتا اللہ سن لے تو عزت رہ سکتی ہے ورنہ“ نمود کا ڈرایا عارفین نڈھال ہو کر جواب دیتا۔ یہاں سے بڑھا اور بھگوان کی کتھا شروع ہوتی ہے.... ساری عمر جس عارفین نے مسجد کا رخ صرف عیدین پر کیا تھا، اب ساری نمازیں مسجد میں پڑھنے لگا۔ عارفین کی کچھ ایسی کایا کلپ ہوئی کہ دنیاوی دارو نہ ملا تو ہر فقیر کے پیچھے بھاگتا، ہر شاہ صاحب سے تعویذ لکھاتا، درگاہوں پر حاضری دینا، مسجد میں چٹائیاں بچھانا، نمازیوں کی جوتیاں قطار میں رکھنا، درگاہوں پر جھاڑو پھیرنا، داتا دربار میں دیکیں مذر کرنا.... وظیفے پڑھنا، محفل میں بیٹھ کر تسبیح پھراتے رہنا اس کا وطیرہ ٹھہرا۔ عارفین کی زندگی کا نقشہ

بدل گیا۔۔۔ اولاد کی آزمائش نے گویا اس بٹڈیلے کو بکری بنا دیا۔ اس بنی آدم کے لئے اولاد کی آزمائش، مال کی آزمائش میں بدلی۔ جگہ جگہ عارفین کو شنوائی کے لئے رشوت سفارش کے لئے بھاری رقموں کی ضرورت پڑی۔ اولاد اور مال کی آزمائش میں پھنس کر بیچارہ قرے کا بہکایا اور جوگی کا پھٹکا را آخری عمر میں ایسی دلدل میں پھنس گیا کہ ساری تاش، شطرنج دھری کی دھری رہ گئی اور عارفین نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔

کچھ دیر کے بعد میں صرف عارفین کو تلاش کرتا رہا۔ پہلے پتہ چلا اسام آباد میں ہے۔۔۔ پھر کسی نے بتایا ہے تو اسام آباد میں ہی، لیکن بری امام کے پتھروں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔۔۔ نہ کسی سے بات کرتا ہے، نہ کسی کو پہچانتا ہے۔۔۔ حلئے سے بھی پہچانا نہیں جاتا!

نیگرو لوگ گایا کرتے ہیں

سوچتا ہوں میرا بھائی گیا کہاں

سوچتا ہوں میرا بھائی گیا کہاں

جنگلوں میں کھو گیا شاید

آئے گا اب کہاں؟

جانے کہاں وہ لیٹے گا

جانے کہاں بکھروں گا میں

مالک کسی اداس جگہ میں

زمین پر ڈھیری کی صورت

گر کر اسے پاؤں گا

کیا پہچانوں گا اسے

میرا بھائی گیا کہاں

میں لکڑی کی کتیا جسے امریکن گزے بو کہتے ہیں، میں بیٹھانے لکڑی کے جنگل کی

طرف دیکھ رہا تھا۔ اس جنگل کا سبزہ بہت خوش رنگ ہے۔ درختوں کے تنے سیاہ اور

شاخیں تازہ سیبوں کے رنگ جیسی ان پر موٹی موٹی گلہریاں بڑی آزادی سے چڑھتی اترتی نظر آتیں، کبھی کبھی کوئی پرمدہ اچانک درخت سے ٹپتا اور بلند یوں کی طرف اڑان بھرتا۔

ہر طرف شانتی تھی، چونکہ اس دیس میں بلاوجہ ہارن بجانا گالی دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے گاڑیوں کے چلنے کی آواز تو آئی، لیکن بریکیں لگنے یا ہارن بجتے کا شور زیادہ نہیں تھا۔ پھر ایک پاکستانی عورت نہ جانے کس بلاکج یا سپر مارکیٹ کی جانب سے چلتی ہوئی اچانک وارو ہو گئی۔ مجھے اس کے ورود کا علم نہ ہوا۔۔۔ ٹوٹی بیساکھی پر سہارا پا کر وہ بولی۔

”میں یہاں بیٹھ جاؤں چا چا جی۔۔۔“

مجھے چا چا جی القاب سن کر ذرا سی ناگواری محسوس ہوئی، کیونکہ وہ عورت پچاس سے کم نہ تھی، پھر یہ سوچ کر ارجمند اور بلال کی ٹھوڑیاں بھی دوہری ہو کر ڈھلکنے لگی ہیں، میں چپ ہو گیا۔

یہ سرکاری گزے بو ہے۔ پ شوق سے جہاں چا ہے بیٹھیں۔۔۔ بیٹی۔“

اس نے اپنی خریداری کے چند لفافے بیچ پر رکھ دیئے اور آہستہ سے بولی۔۔۔ ”میں بہت دور سے آپ کو دیکھ کر آئی ہوں۔۔۔ یہاں تو اتنی تنہائی ہے کہ کوئی مشورہ دینے والا بھی نہیں۔“

”آپ خود بہت سمجھ دار ہیں۔ آپ کو مشورے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ اور پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انسان مشورہ لے تو لیتا ہے، اس پر عمل نہیں کر پاتا۔ یہ انسانی مجبوری ہے۔ وہ اپنے سے زیادہ کسی کو عقل مند نہیں سمجھتا۔“

”نہیں چا چا جی۔۔۔ میری آرزو ہے کہ کوئی مجھے گائیڈ کرے۔ میں بڑی مشکل میں

ہوں۔۔۔“

میں یکدم اپنے آپ کو اہم سمجھنے لگا۔۔۔

”ہاں ہاں فرمائیے فرمائیے۔ اگر میں کوئی چارہ جوئی کر سکا تو مجھے خوشی ہوگی۔“

وہ بھی بٹاش سی نظر آنے لگی۔ گویا میں اس کی اصلی مدد کرنے والا تھا۔

”بات یہ ہے چا چا جی۔۔۔“ پھر وہ رکی، گروسریز کے ایک لمبے لفافے میں سے

جس می Cereals کے ڈبے تھے، اس نے بازو گھسا کر ایک چوکولیٹ نکالا۔

”آپ کو Hazel Nuts پسند ہیں۔ یہ چوکولیٹ میکن اور ہیزل نٹز سے بنا

ہے۔“

منہ کے ذائقے کو بھڑکانے کے لئے انسان گندم کے دانے سے چل کر کہاں سے

کہاں پہنچ گیا تھا۔

”شکریہ۔۔۔“ میں نے چوکولیٹ کا براؤنڈ پڑھا۔ اسے ناک سے لگا کر سونگھا اور

شکریہ کہہ کر ریپر کھولنے لگا۔

”یو آریٹم۔۔۔ چا چا جی بات یہ ہے کہ میرے دو بیٹے ہیں اور وہ دونوں امریکہ میں

ہیں۔ بڑا سکندر تو یہاں ایک معمولی سے سٹور میں کام کرتا ہے اور چھوٹا اختر پڑھ رہا ہے

انجینئر سکول میں۔۔۔“

امریکہ میں کالج کی تعلیم کو عموماً سکو جانا کہتے ہیں۔

”بڑی خوشی کی بات ہے۔۔۔“

”بظاہر تو خوشی کی بات ہے ہی چا چا جی لیکن میرے بہت مشکل کا سامنا ہے۔“

اس کی باتوں سے زیادہ چوکولیٹ مزے دار تھی۔

”میرے میاں ان کے یہاں پر رضا مند نہ تھے۔ ہم لوگ پیچھے سے بڑے سوکھے

ہیں چا چا جی، دو پلازہ تو گلابرگ میں ہیں۔ اندرون شہر بھی پراپرٹی ہے۔ شیخ جی کہتے

تھے کہ تم کو باہر جا کر کیا ملے گا۔ دھکے محنت مزدوری، بھانڈے کپڑے دھونا، آرام سے

رہو۔۔۔ جیسے سارے خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دوست یہاں

آگئے۔۔۔ سکندر کو تو ڈھنگ کا کام بھی نہیں ملا، لیکن وہ واپس نہیں جاتا۔ اس کا ابھی

تک گرین کارڈ نہیں بن سکا اور وہ کبھی ایک وکیل پکڑتا ہے کبھی دوسرا۔ آج کل وہ ایک پیپر میرج کے چکر میں ہے۔“

”خود ہی تھک جائے گا اس مشقت سے تو لوٹ جائے گا وطن ...“

”وہ بھی یہی کہتا ہے لیکن شیخ صاحب کی جھوک مجھ سے سنبھالی نہیں جاتی۔ وہ مجھے بدو بدی بھیج دیتے ہیں یہاں بیٹوں کو منانے ... جب میں اکیلی واپس جاتی ہوں تو گھر میں چومکھی بڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ سارا الزام ہی مجھ پر دھرتے ہیں۔“

میں نے سقراط کے سے لہجے میں کہا ... ”تم ایسے کرو عزیزہ۔“

”آپ کو میرا نام کیسے پتہ چلا ...“ وہ کھل اٹھی

”بس ایسی باتوں کا علم ہو جاتا ہے“ ڈبہ پیر کے سے لہجے میں جواب دیتے ہوئے میں نے کہا ... ”تم عزیزہ ایسے کرو ... اپنے شیخ صاحب سے کہو جا کر خود بچوں کو راہ پر لائیں۔“

”آئے تھے چار سال پہلے۔ ہم دونوں آئے تھے۔ پہلے ملتیں ساجتیں کیں۔ پھر دھمکیاں دیں ... آخر میں عاق کرنے کا فیصلہ بھی سنایا، لیکن الو کے پٹھے مانے نہیں۔ شیخ صاحب تو بھوں بھڑک واپس چلے گئے دس دن کے بعد ہی ... میں مہینہ بھر ٹھہر کے لوٹی تب سے آج تک وہ اٹھتے بیٹھتے طعنے مہینے دیتے ہی رہتے ہیں ... ان کا خیال ہے کہ دونوں جو بھٹکے ہیں تو یہ میری کارگزاری ہے۔ بتائیں میں کیا کروں؟ بڑا تو پھر بھی لیگل امی گرنٹ ہے۔ چھوٹے کے پاس تو گرین کارڈ بھی نہیں۔ ایک حلال گوشت کی دوکان پر کام کرتا ہے اور آدھی اجرت لیتا ہے، لیکن واپس نہیں چلتا۔ کیا کروں چا چا جی۔“

میرے دل میں آئی کہ کہہ دوں، کرنا کیا ہے بی بی عزیزہ، صبر کرو شکر کرو ... اولاد کی آزمائش سہو اس عمر کے یہی میوے ہیں لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر ہمت نہ پڑی اور میں چپ رہا۔

”وہاں لاہور میں رہتی ہوں تو ان دونوں کی یاد دل میں ٹسکتی رہتی ہے۔ یہاں آؤں تو شیخ جی کا خوف جینے نہیں دیتا۔“ شیخ جی واپسی پر کہتے ہیں، اگر بچوں نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو تم بھی انہیں چھوڑ دو۔۔۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمیں ان کے سہارے جیوں، صرف ان کا سوچوں اور وہی میری ساری دنیا ہوں۔۔۔ ان کی ڈیمانڈ بھی ٹھیک ہے۔ وہ بھی درست کہتے ہیں۔ لیکن میں بیٹوں کا تعلق کیسے توڑوں چاہا جی۔۔۔ ان دونوں کو دل سے کیسے نکالوں۔۔۔ کوئی ترکیب بتائیں چاہا جی۔۔۔ مشورہ دینے والے کے لئے سب سے بڑا مرحلہ یہی ہوتا ہے، جب وہ جواب نہیں جانتا۔

”دراصل عزیزہ تمہارا کوئی قصور نہیں۔۔۔ یہ تعلق چیز ہی ایسی ہے۔ انسان کو بھگل کر دیتا ہے۔۔۔ صوفیا تو کہتے ہیں کہ رستے کا سب سے بڑا حجاب ہی تعلق ہے۔ نہ تعلق سے دل خالی ہوتا ہے، نہ اصلی قرار دل میں آتا ہے۔ معمولی سے مہمان کے لئے کمرہ خالی کرنا پڑتا ہے۔ پھر اوپر والے کے لئے تو چھوٹا سا بت بھی اندر رہ جائے تو اس کی سواری نہیں اترتی۔۔۔“ وہ کچھ نہ سمجھی

”چلو نہ جائیں پاکستان۔۔۔ ان کی مرضی۔۔۔ ان کو آزادی من مرضی کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ کہاں چلتے ہیں میرے ساتھ نہ سہی جیسے اللہ کرے میں ہی ان کے پیچھے نہ کھلتی پھروں۔۔۔ بتائیں چاہا جی۔۔۔ تعلق کو توڑنے کا کوئی نسخہ جلدی بتائیں ورنہ میں تو نہ یہاں خوش نہ لہور میں۔“

اب عزیزہ کے آنسو جھرنے کی طرح بہنے لگے۔ میں نے اسے بتانا چاہا کہ ہم جیسے گوشت پوست کے بنے معمولی لوگوں کے تعلق ٹوٹنا نہیں کرتے۔ کوئی ساتھ رہے یا خواب بن کر خیالوں میں بس جائے۔۔۔ تعلق جان لیوا ہوتا ہے۔۔۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ تو پھر ماں ہے اور بیٹوں کو گنوائے بیٹھی ہے۔ میں نے تو ایسے ہی ایک

بدی بھرا قبل پر نگاہیں جما کر عمر گزار دی ... جبکہ یہاں وہاں کبھی بھی کچھ نہ تھا۔

جھشید اور قیصر دور سے بھاگتے ہوئے میری جانب آئے۔

”نانا۔ نانا ... ہم واشنگٹن ڈی سی جا رہے ہیں۔ جلدی جاؤ چا چا ثار، ہمارا انتظار

کر رہے ہیں ...“

”حوصلہ کرو عزیزہ ہمت پکڑو ... سوائے دعا کے میں تمہیں اور کوئی نسخہ نہیں دے

سکتا۔ اس عمر میں اولاد اور مال کی آزمائش آیا ہی کرتی ہے ... اور جن مسائل کا حل نہ

ہو، سوائے دعا کے اور کیا تجویز کروں ان کے لئے ...“

”نانا ... نانا ... بابا ... نے کارآن کر دی ہے ...“

دور سے قیصر چلایا۔

”وہ سب کو ڈانٹ رہے ہیں۔ جلدی کریں ...“

ہم واشنگٹن ڈی سی کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں یو ایس راؤٹ آیا، کئی

ایگزٹ آئے، میجر آئے، کئی جگہ ہم نے Hov کا راستہ اختیار کیا ... باہر نظریں

دوڑاتا میں سوچ رہا تھا کہ امریکہ کو یورپ والوں نے طعنے دیئے تھے کہ امریکی بھی

کوئی لوگ ہیں۔ جن کا نہ کوئی کلچر، نہ کوئی زبان، نہ ان کی ہسٹری، نہ ان کے آثار

قدیم۔ اس خود رو گھاس جیسی جنگلی تہذیب کے مالکوں نے ثقافتی برتری والوں کا تکبر

ریزہ ریزہ کر دیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ جب ہم کسی میں کیڑے نکالنے کے مسلسل عمل

میں ہوتے ہیں تو کہیں ہوا میں سے ان کیڑوں کا پولن ہماری اپنی ذات پر بھی جھڑنے

لگتا ہے۔ آج امریکہ کی جدیدیت ہی سارے پرانے کلچروں کو کھ گئی۔ امریکہ کی

ہسٹری ان کی سرکیں اور بازار ہیں۔ ان کی امریکن زبان ساری زبانوں کو اکھاڑے

میں پچھاڑ چکی ہے۔ حتیٰ کہ جو انگریزی انگریزوں کی دستار تھی، وہ بھی اسے اتار کر

امریکنوں کے قدموں میں رکھ چکے ہیں۔

آسمان پر ایک چھوٹی سی اقبال مند بدلی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ یہ بدلی

کبھی اقبال کا دوپٹہ بن جاتی، کبھی اس کے سینڈلوں کا روپ دھار لیتی ... میں سوچتا چلا جاتا ہوں۔ یہ کیسا تعلق ہے جو بل وجہ بے نام ایک خلش کی طرح میرے ساتھ چلتا ہی چلا آیا ... اس تعلق نے میری روزمرہ کی زندگی میں کوئی کھنڈت نہ ڈالی۔ میرے گربست آشرم کو برباد نہ کیا اور پھر بھی ... کارے نظر آنے والے منظر کی طرح یہ ساتھ ہی رہا۔

میں نے ہال روڈ کی دوکان سے ڈیفنس کی کوٹھی تک دنیاوی زندگی کے لئے جدوجہد میں وقت گزارا اور کبھی پٹ سیپا نہیں ڈالا پھر بھی ...
نہ میرا کوئی راز داں تھا، نہ ہی کسی کو علم ہو سکا۔
اور پھر بھی ...

یہ کیسا تعلق تھا اصغری؟ تم تو صرف مامتا کو سمجھ سکی ہو۔ میں تو اس تعلق کا کوئی نام بھی نہیں رکھ سکتا جو میں اقبال کے لئے محسوس کرتا رہا۔
کارتیختھی۔

خیالات تیز تر ... میں بھی بچوں کی طرح مناظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ میں ریڈمنسٹر سے ملنے ایبھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے من کا موتی لانگ آئی لینڈ چلا گیا ہے۔ اگر میں جہانگیر کی گھر جا کر تصدیق کر سکتا تو بات پایہ ثبوت کو پہنچ سکتی تھی۔ لیکن میں نیو بیٹھے بٹھائے بیجانی من موجی فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے تو شاہدہ کو بھی ایک بار پھر اپنے سے دور کر لیا تھا۔ ہارون کو بھی دیکھنے میں نہ جاسکا، کیونکہ وہاں کی اقبال لانگ آئی لینڈ چلی گئی تھی۔

بلال اور ارجمند چھوٹی چھوٹی بات پر لمبی لمبی بحث کر رہے تھے۔ بچوں نے نیلی ویژن لگا رکھا تھا اور مناظر قدرت دیکھنے کے بجائے وہ میڈیا سے وابستہ تھے ...
یکدم میں بھی ایک اے ٹریک پر چلنے لگا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ لانگ آئی لینڈ جانے والی وہ اقبال نہ ہو جو آپا کی دوست

تھی؟ ... بڑھاپے میں امید چھوٹی چھوٹے اشاروں سے شکونوں میں بندھ جاتی ہے اور اس سے بھی کمتر واقعات سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اب میرے خیال نے ایک نیا جال بنا شروع کر دیا۔ ٹریڈ منسٹر ٹار کی بیوی ہی اصلی اور وڈھی ہیر ہے ... یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اسے ملنے جا رہا تھا۔ شید ٹریڈ منسٹر کی بیوی ہی اصلی اقبال نکلتے۔
یقیناً یقیناً یقیناً یہی اقبال اصلی ہے۔

کیا اقبال موٹی ہو چکی ہوگی ...؟

کیا اس کا چہرہ جھریوں زدہ ہوگا ...؟

کیا اقبال نے بال ڈائی کر لئے ہوں گے ...؟ سنہری سنہری براؤن ہو سکتا ہے اس کے سامنے والے دانت ٹوٹ چکے ہوں۔۔۔۔۔
یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس کے بارے دانت نکلتی ہوں ...

میں نے اس وقت سکھ کا سانس لیا جب ٹریڈ منسٹر کی بیوی اقبال ہی نے دروازہ کھولا ...

یہ وہ اقبال نہ تھی، جسے میں جانتا تھا۔

خوشبو میں بسی ایک بوڑھی عورت رنگ کے سیلاب میں ملبوس تھی۔ اس کے سارے تارو پود ڈھیلے اور بناؤٹی تھے ... اتنے ڈھیر سارے قیمتی Props کے باوجود وہ قابل ذکر نہ تھی۔ آنٹی اقبال ہمارے لئے چائے لینے چلی گئی۔

ارجنند کو انفارمیشن دینے کا بہت شوق ہے۔ اس کی رزرو ہوتی ہے کہ وہ اخبار کی طرح ہمیشہ تازہ خبر دے، چونکا ڈالے، ہر دوانی کا علم رکھتی ہو، وہ پہننے اوڑھنے میں اتھارٹی مانی جائے۔ ارجنند نے انفارمیشن کی شوق میں امریکی زندگی کے متعلق اتنی ان گنت باتیں جمع کر رکھی ہیں کہ کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ اس کی سات پشتیں اسی سرزمین میں رہتی رہی ہیں۔ وہ ٹار کا اعروہ یو پیش کرتی ہے۔

”مائل تو بڑی ٹھیک ٹھک پر سنیلٹی ہے۔ بڑی عالی شان باتیں کرتے ہیں، لیکن

وائف میں ہسپارک نہیں۔“ کمرہ خالی پا کر ارجمند بولی۔
”کیوں۔“

”یوں لگتا ہے آٹنی اقبال سے ان کی شادی زبردستی ہوئی ہے۔ دونوں بیزار سے
بیٹھے ہوتے ہیں جیسے اپنے ماضی میں کوئی معنی تلاش کر رہے ہوں۔“
میں حیران ہو کر ارجمند کی شکل تکلتا ہوں۔
انکل ٹار؟ آٹنی اقبال۔

”تمہارے انکل ٹار خوبصورت ہیں؟“
”جی ابو بہت ... چھ فٹ ایک انچ قد ہے ... سنا ہے جوانی میں ٹینس کھیلا کرتے
تھے۔“

میں ذہن میں ٹار کی شناخت پر یڈ کرنے لگتا ہوں۔ بڑے چھوٹے ہسپارک سے
خیال کی گاڑی سٹارٹ ہو جاتی ہے۔ دراز قد، خوبصورت، ٹینس کا کھلاڑی ... ٹریڈ
منسٹر لیکن اب مجھے ٹریڈ منسٹر سے خوف نہیں آتا ... نہ اس کی ٹینس سے نہ اس کے حسن
سے ...

”بچے کتنے ہیں انکل ٹار کے؟“

ارجمند مسکراتی ہے۔ ”پتہ نہیں دو بیٹے ہیں کہ ایک بیٹا ہے۔ بات یہ ہے ابو! یہ
امریکی معاشرہ جھوٹ کا عادی نہیں جب ہم لوگ پہلے پہل یہاں آیا کرتے تھے تو
ہم جس سے ملتے، اس کے بال بچے کا حال ضرور پوچھتے۔ پیچھے سے ہمیں عادت پڑی
ہوئی تھی۔ جس سے ملنا بچوں کی بات ضرور کرنا، حالانکہ ہم تو بچوں کے نام تک نہ
جانتے تھے، لیکن یہاں آ کر عادت بدل گئی۔ امریکہ میں ہم پرسنل باتیں نہیں کرتے۔
اقبال کو دیکھ لینے کے بعد مجھے ٹریڈ منسٹر کو دیکھنے کی خواہش نہ رہی ... اس کے بچے کتنے
تھے، اس کی مجھے رتی بھر پروا نہ تھی۔ یہ میرے والی اقبال نہ تھی۔

واپسی پر کار میں بیٹھا سوچتا جاتا ہوں۔ معاشرتی زندگی میں امریکی تبدیلی کا

خواہاں رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ دب دبا کے پانچ دن کام کرتے ہیں، لیکن ویک اینڈ پر ضرور بریک لیتے ہیں۔ چھٹی لینا اور چھٹی منانا ان کا بنیادی حق ہی نہیں، ضرورت بھی ہے۔ وہ ایک ریاست سے دوسری ریاست میں خوشی خوشی جاتے ہیں، نوکریں تبدیل کرتے ہیں، حتیٰ کہ ساتھی کو تبدیل کرنا بھی ان کے نزدیک کوئی جان لیوا حادثہ نہیں۔

دراصل تبدیلی فطرت ہی کا قانون ہے۔ انسان ہمیشہ بچہ نہیں رہتا۔ تبدیلی اسے نوبالغ سے بالغ اور جوانی سے بڑھاپے میں منتقل کر دیتی ہے۔ ایک مدت حالات کی تبدیلی، پیدا نہ ہو تو انسان کی نہ صرف طبیعت پتھریلی ہو جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کی خوبیاں بدل کر خرابیوں میں بدلنے لگتی ہیں۔ مدتی غریبی اور غیرت کے ہاتھوں پسے والے نادار طبیعتاً کنجوس ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کے حالات خوشگوار بھی ہو جائیں تو ان کا بٹہ نہیں کھلتا۔ وہ دوسروں کو ہنتا کھیلتا دیکھ کر چڑتے رہتے ہیں اور ان کے نزدیک صاف ستھری خواہشیں بھی قابل احترام نہیں رہتی۔ اپنی خواہشات پر صبر کا ڈھکنا تا دیر بند رکھنے سے وہ اپنے نفس پر غلم کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ لوگ جنہوں نے مدتوں سخت حالات کا مقابلہ کیا، وہ شقی القلب بھی ہو جاتے ہیں۔ انہیں نہ اپنے پر ترس آتا ہے، نہ دوسروں کے آنسو گرتا دیکھ کر انکے دل پگھلتے ہیں۔ اگر ڈاکٹروں ہی کی مانند یہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک بھی رہیں تو بھی انکے دل پیچتے نہیں اور ان میں رقت پیدا نہیں ہوتی۔ اس طرح قوت برداشت اور صبر کی سل سینے پر رکھنے والے رحم دلی جیسی نعمت سے خالی ہو جاتے ہیں اور ان کی قوت برداشت کی خوبی خرابی میں بدل جاتی ہے۔ یہی زندگی کا سب سے بڑا اچنچا ہے کہ کیسے نیکی بدی میں اور بدی نیکی میں بدلتی رہتی ہے۔ کیسے انسان کی خوبی ہی اس کی خرابی بن جاتی ہے اور اس کی خرابی ہی میں خوبی کی گنجائش رہتی ہے۔

جو عورت اپنی مجبوری یا کسی مرد کی مجبوری کی وجہ سے استحصال کا مرکز بنتی ہے۔ اگر

بار بار وہ مرد کی شہوت کا شکار ہوتی رہے اور مدتوں استحصال کا نشانہ بنی رہے تو اس کی نسائیت کی نرمی، حیا، پاک بازی جیسی خوبیاں ہولے ہولے اسے ظلم کی طرف مائل کرنے لگتی ہیں اور وہ پتھر دل بن کر مرد کا استحصال کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ مدتوں طوائف بنے رہنے سے مظلوم سے ظالم بننے کا عمل پیش آتا ہے اور وہ تمام نرم دل کیفیتیں جن سے عورت کے دل میں چراغاں رہتا ہے، اندھیرا بن کر ڈسنے لگتا ہے۔

امریکہ نے اعتدال پر آنے کے لئے تبدیلی کا نسخہ تجویز کر رکھا ہے۔ وہ "Move On" کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔ سفر کو وسیلہ ظفر جان کر دور دراز ملکوں میں رمتے جوگی بن جاتے ہیں۔۔۔ امریکن طرز کہن سے چڑتا ہے، آئین لو کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اسی تبدیلی کے ہاتھوں اپنی خوبی کو خرابی میں بدل جانے سے بچاتا ہے۔ وہ وفا کو بہ شرط استواری استعمال نہیں کرتا، بلکہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ بے وفائی سے زندگی میں تازگی رہے۔ درست علاج ہو یا نہ ہو، درد کم سے کم رہے۔ وہ ماں کا دن مناتا ہے۔۔۔ باپ کا ڈے مناتا ہے۔ بوڑھے لوگوں کا سال Celebrate کرتا ہے۔۔۔ لیکن انہیں اپنے پر سوار نہیں کرتا۔

امریکہ میں تبدیلی بھی ترقی کا ہی ایک راستہ ہے۔۔۔ تبدیلی بہتر سے بہتر کی تلاش میں تو مدد دیتی ہے، لیکن شاید فلاح اس راستے پر نہیں ملتی۔ تبدیلی اس بات کی متقاضی ہے کہ انسان میں خواہش پیدا ہو۔ خواہش کبھی مرنے نہ پائے۔ خواہشات کو ابھارنے کے لئے بازاروں یک جنگل میں۔ ابلاغ ہے۔ ذرائع آمد و رفت کا لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔ امریکی کبھی خواہش سے خالی ہونا نہیں چاہتا۔۔۔ بدلتی خواہش اسے ترقی کے زینوں پر اوپر چڑھنے میں مدد دیتی ہے۔

لیکن کیا کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوئے بغیر کموائی اصلی تبدیلی آسکتی ہے؟ کیا مسلک، مذہب، خیال، تحریک صرف علم کے سہارے ممکن ہے؟ کیا نبی کے بغیر، اس کی شفقت کی روشنی نہ ہوتے ہوئے صرف کتاب سے مذہب کی تبدیلی ممکن ہے؟ کیا

استاد، گرو، مرشد کے بغیر انسان علم کو عمل میں ڈھالنے کی تبدیلی لاسکتا ہے۔۔۔؟ ترقی اور فلاح میں تبدیلی بھی مختلف ہے۔ فلاح کے راستے پر اپنی خواہش بدلنا نہیں پڑتی، بلکہ اسے ایک ہی سمت میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس بظاہر جامد خواہش کے باوجود فلاح پانے والا تبدیلی سے آشنا رہتا ہے، لیکن بقدر ضرورت۔ ہر وقت کی اکھاڑ پچھاڑ اس کا پیچھا نہیں کرتی۔

واشنگٹن میں جو کچھ گزری، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ واشنگٹن سے واپسی پر میں ایک بار پھر سوالوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ ہیلکوئی میں بیٹھ کر میں سڑکوں پر نگاہ دوڑاتا پھر تقابلی سوچ کے حوالے ہو گیا۔ یہ سلسلہ تکلیف دہ بھی تھا اور وقت بھی اس کے سہارے آرام سے گزر جاتا تھا۔

مشرق میں ابھی تبدیلی سے اتنی محبت پیدا نہیں ہوئی۔ تبدیلی ہمیں خوفزدہ کرتی ہے۔۔۔ ہم صبرین اور شاکرین میں سے ہونا چاہتے ہیں۔ ہم مابعد اور آخرت میں اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کے باعث پھر کہنا پڑتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی مل نہیں سکتے۔

امریکن خواہش کو تازہ دم کرتے ہیں۔ تبدیلی سے اپنے آپ کو انکجٹ کرتے ہیں۔ خرابی اور خوبی کو ادا لے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی انہیں مسابقت کی طرف کھینچتی ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں مبتلا رہتے ہیں۔

مشرق کو جاہل کہہ لیجئے۔ کم علم، ناقابل اندیش سمجھ لیجئے۔۔۔ دلدل میں دھنسا ہوا مشرقی انسان مکمل طور پر روایت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اپنی لوک ریت، رسم و رواج سے محبت کرتا ہے۔۔۔ شاید وہ دکھ سہتا سہتا اپنی خرابیوں میں راسخ بھی ہو جاتا ہے، لیکن فلاح کی منزل دھندلاتی نہیں۔ سائنس سے دور، ہر لحظہ کی تبدیلی سے نا آشنا، اس کے صبح و شام ایک سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مذہب سے وابستہ رہ کر صبر کی ڈھال آگے رکھ کر چلتا رہتا ہے۔ عام انسان کو مذہب کی اصلیت سے چاہے آگاہی ہو، نہ ہو

وہ قبر پرستی، تعویذ گنڈے، پیر حضوری میں دن گزارتے ہوئے ہو لے ہو لے غلطی کے ڈھیروں میں گزارتے ہوئے مست اور مجذوب کے مرحلوں سے واقف، جسم پر رنگ برنگ منکوں کی مالائیں سجائے فقیر کو سامنے پا کر مشرقی انسان کو اپنی تمام تر بد نصیبی کے باوجود یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا دارا لکھن ہے۔ یہاں انسان کا امتحان مقصود ہے اور اصلی حیات مابعد سے شروع ہوتی ہے۔ کوئی تبدیلی سفر آسان نہیں کر سکتی۔ کسی قسم کی ترقی انسان کو مکمل طور پر پرسکون، قناعت پسند، مسرت، شہنائیں بنا سکتی۔ جب تک اوپر والے کا فضل نہ ہو، کچھ بھی مثبت نہیں ہوتا۔

سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ دونوں الگ الگ وقت کے تابع ہیں۔

مشرق تبدیلی کا خواہاں نہیں، استواری کا دلدادہ ہے۔

مشرق میں خواہش کو دوبانے کا عمل ہے مغرب میں ابھارنے کا ...

یہاں عقیدہ اہم ہے اور وہاں قاعدہ

دونوں میں فرق اتنا زیادہ ہے کہ یہ دونوں راضی نامہ نہیں لکھ سکتے ... اور اگر کبھی مشرق نے مغرب کی سوچ میں ضم ہونے کی کوشش کی بھی تو اس کو مذہب سے ہاتھ دھو کر فلاح کا راستہ چھوڑ کر یہ منزل مل سکے گی ... پھر شرمندگی، احساس گناہ، بے حیائی کا نیا سفر ہوگا اور مشرقی لوگ

کبھی کبھی میں سوچا کرتا ہوں کیا ترقی کی اس قدر قیمت ادا کرنا درست ہے؟ کیا آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے قرضوں کی طرح معمولی انسان بھی صرف تبدیلی کی قسطیں ادا کرتا فوت ہو جائے گا ...؟ نہ ترقی حاصل کر پائے گا، نہ فلاح ... نہ حل کی ترقی اس کی ہوگی، نہ مابعد کی۔ ہم کیوں نہیں جان پائے کہ انسان کلی طور پر کبھی بھی مادیت میں ضم نہیں ہو سکتا۔ غالباً یہ مشیت کی نشا بھی نہیں۔

یہ تب کی بات ہے جب اصغری زندہ تھی اور جہانگیر شاہدہ کے گھر شفٹ نہ ہوا تھا۔

وہ دونوں ہنستے کھیلتے باہر نکلتے لیکن جب تک جہانگیر اور شاہدہ بند کمرے میں ہوتے، بڑی خوفناک آوازیں آتی رہتیں۔

”تم کچے حرام زادے ہو۔“ کونونٹ کے لب و لہجہ میں بجلی کے لشکارے جیسی آواز آتی، آگے کچھ منمنسا سا جواب ملتا جیسے طالب علم کو غلط جواب دکانے پر حساب کے استاد کا خوف دامنگیر ہو۔۔۔۔۔

”الو کے پٹھے اگر یہی تمہارا معیار زندگی تھا تو مجھے کیوں بیاہ کر لائے تھے۔۔۔؟“
باوجودیکہ دونوں کمروں کے درمیان صرف کھلے دروازے کا حجاب تھا۔ بگی دارھی والا میں ہمایوں فرید جواب نہ سن پاتا اور اپنے بیٹے کی آواز مجھ سے پہچانی نہ جاتی۔
”اور تمہارا یہ باپ؟ ہوگا کوئی بڑا امپورٹ ایکسپورٹ والا۔۔۔ مجھے اس کی تڑی نہ دینا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔۔۔ وہ بھی کسی ریٹائرڈ اولڈنول سے۔۔۔ میرے باپ کا تم لوگ کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔۔۔ ہی ازاے بزنس ٹائی کون۔۔۔ جانتے ہو بزنس ٹائی کون کیا ہوتا ہے۔ جانتے ہو سٹو پڈ۔“

”ہم کب مقابلے کی سوچتے ہیں۔۔۔“ آگے پھر جہانگیری آواز منمننا جاتی۔
”میں دیانت داری کو نہیں جانتی۔ یہ کم عقل۔۔۔ نالائق للو قسم کے لوگوں کے بہانے ہیں۔ جو نہ زندگی میں کچھ بن سکے اور نہ ہی ان کا بننے کا کچھ ارادہ ہو۔۔۔ تم خوفزدہ، نن کم پوپ، چھوٹے اور ٹوٹے ہوئے آدمی ہو۔ یاد رکھو اگر تم نے جلد کچھ نہ سوچا تو میں جا بھی سکتی ہوں۔ مجھے اس گھر سے ویسے بھی کچھ نہیں لینا دینا۔ باسٹرڈ۔۔۔“ یہ میری بہو شاہدہ کا میزائل حملہ تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے اپنا کمرہ اوپر والی منزل میں منتقل کر لیا۔ اصغری اور میں شاہدہ کی باتیں سن کر سو نہیں سکتے تھے۔ نیند کی گولیاں کھا کر بھی مجھے ساری ساری رات نیند نہ آتی۔ نیند تو غالباً جہانگیر کو بھی نہیں آتی تھی، لیکن وہ جوان تھا اور ابھی اپنی آئی ایم ایف جیسی بیوی کے آگے حال احوال بیان کرنے کا اہل تھا۔ جہانگیر اب مجھے

خمیدہ کمر Shuffle کرتا ہوا بوڑھا بوڑھا نظر آتا تھا۔

پھر اچانک جہانگیر نے ڈاکٹری چھوڑ کر مقابلے کے امتحان میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ بہار کے دن تھے۔ آڑو اور آلوچے کے شگوفے لان میں پھول رہے تھے۔ ہوا میں آزاد پرندوں کی چہک اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ لان میں امریکی Sprinkler آہستہ آہستہ جھولتا فوارے کی طرح بوندیں چھوڑ رہا تھا۔ اس مصنوعی فوارے کی پھوار میں چڑیاں نہانے کی کوشش میں تھیں۔ کئی دنوں سے میری جہانگیر سے تفصیلی ملاقات نہ ہوئی۔ وہ دونوں ہمیں رسمی سلام کر کے اپنے پروگرام میں نکل جاتے۔

اصغری کچھ وقت ارجمند کو یاد کرنے میں بسر کرتی۔ پھر ڈرتے ڈرتے ہارون کو دیکھنے نیچے جاتی۔ اب کچھ عرصہ سے وہ ہارون کی زیارت کرنے بھی نیچے نہ گئی تھی۔ ... اصغری کو اپنی ہانی جین پر بھروسہ نہ تھا، اس لئے وہ ہارون کو اٹھانے سے پرہیز کرتی۔

میں نانی کی دوکان پر خط بنوانے کے لئے گیا تھا، لیکن حسن اتفاق سے دوکان بند تھی۔ میں نے واپس آ کر ارجمند کا بھیجا ہوا سیل والا اسٹرا نکالا اور اپنی بگی داڑھی کو ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے دراصل عینک کے ساتھ بھی اپنا چہرہ آنیٹے میں صاف ستھرا نظر نہ آتا۔ عینک کا آخری نمبر بھی نا کافی تھا اور اب میں سبز کے ساتھ صبح کا اخبار پڑھتا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے اسٹر ا بند کیا۔

سمنے جہانگیر کھڑا تھا۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ رنگ سفیدی مائل گندمی آنکھیں روشن اور مسکراتی ہوئی۔ اب وہ درمیانے قد، سانولے چہرے اور اس آنکھوں والا نوجوان تھا۔ باڈی بلڈنگ کے شوقین جہانگیر کے کندھے خمیدہ، دانت زرد اور ناخن میلے تھے۔ اسے دیکھ کر ہوسٹ منخوسیت کا خیال آتا۔

”آؤ آؤ ...“

”آپ داڑھی Trim کر رہے تھے بابا۔ ...“

”ہاں ہاں ... بڑا مزہ آتا ہے۔ خلیفہ کے پاس جانا نہیں پڑتا۔ کم از کم ایک سہارے سے چھٹی ملی ...“

”میں آپ کا خط بنا دوں ...“

”نہیں نہیں ... میں تو ایسے ہی شوقیہ واڑھی بناتا ہوں، ورنہ وہ خلیفہ رزاق بڑا اچھا خط بنا دیتا ہے ...“

”کچھ زیادہ ہی اچھا بنا دیتا ہے آپ کا خط۔ مولوی سے نظر آتے ہیں۔ میں ٹرم کر دوں واڑھی، فرانسیسی شاعر لکھیں گے؟“

میں جی سے چاہتا تھا کہ جہانگیر میرا خط بنا دے، لیکن اندر ہی اندر شاہدہ سے پتہ کیوں خوفزدہ تھا۔ نہ جانے اسے اچھا لگے یا نہ لگے ... نہ جانے یوں باپ بیٹے کے قریب نے پروہ کیا سمجھے؟ میں کچھ اسے بخار رہا ہوں۔ اپنے جال میں پھنسا رہا ہوں۔

”میں آپ سے مشورہ لینے آیا تھا ... ایک“

”ضرور ضرور ...“ ہنس کر میں نے کہا ... ”اس عمر میں ہم اور دے بھی کیا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس سوائے مشورے کے اور دینے والی کون سی چیز ہے؟ کوئی ٹیٹھو ...“

”وہ جی میں نے سوچا ہے کہ میں ... سی ایس ایس کر لوں ... میں ... شاید اچھا ڈاکٹر ثابت نہیں ہو سکتا ... پھر نہ اس میں اتھارٹی ہے نہ پیسہ ...“

میں غسل خانے سے نکل کر بہر آ گیا۔ مجھے جوانی والی اصغری بھول چکی تھی، لیکن اتنا ضرور یاد تھا کہ جہانگیر کی تعلیم کے لئے جوان اصغری نے بڑے پاڑے بیسے تھے۔ اسے ڈاکٹری تک پہنچانا پھر باؤس جو ب کے لئے سفارشی تلاش کرنا ... شادی کا مرحلہ یہ اصغری جیسی دھان پان کے لئے ماؤنٹ ایورسٹ فتح کرنے کے مصداق تھا۔ خیر شادی تو جہانگیر نے اپنی مرضی سے اپنی ہی ہم جماعت سے کی، لیکن اسے ڈاکٹر بنانے میں ہم میاں بیوی کے کئی سال امید و بیم میں کئے۔ اپنی کئی خوشیاں قربان کرنے کے

بعد یہ راحت ہمیں نصیب ہوئی کہ ہمارا بیٹا ڈاکٹر بن گیا۔

”تمہارا اچھا بھلا کیریئر ہے۔۔۔ تم اسے کیوں چھوڑنا چاہتے ہو۔۔۔“ میں خوفزدہ ہو گیا۔

”میں۔۔۔ اچھا ڈاکٹر نہیں ہوں اب۔ میں Organized نہیں ہوں۔ میری شخصیت Focused نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ مجھ میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔۔۔ میں مقابلہ نہیں کر سکتا، نہ کسی فرد کا نہ سوسائٹی کا، ترقی کا راز مسابقت میں ہے۔ میں ساری عمر سرکاری نوکری کروں گا چھوٹے چھوٹے ہسپتالوں میں۔۔۔ کبھی پرائیویٹ کلینک نہ بنا سکوں گا اپنا۔“

”خواہ مخواہ ہم کسی سے کم نہیں۔ میں نے نہ کبھی کوئی ٹٹ پونجیا دوست بنایا نہ کسی غریب رشتہ دار کو پاس پھٹکنے دیا، کس لئے؟ تاکہ تمہارے راستے میں کوئی حائل نہ ہو۔۔۔“

”میں پر اعتماد نہیں ہوں۔۔۔۔۔“ جہانگیر بول۔

”یہ تم سے کس نے کہا۔۔۔ تم پڑھائی میں ہمیشہ پہلے چارپانچ لڑکوں میں آتے رہے ہوں۔۔۔ اگر اعتماد نہ ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا۔۔۔۔۔“

”نہیں ابو۔۔۔ پڑھائی میں اول، دوئم آنا کوئی معیار نہیں ہے۔ ہر کتابی کیڑا ایسے کر سکتا ہے۔ میرے کوئی دوست نہیں۔ میں محفل میں روانی سے پر اعتماد طریقے سے بات نہیں کر سکتا۔ میں سیاست، معیشت، محفلی گفتگو سے نا آشنا ہوں۔ میں اپنی ہی کلاس فیلو کے پروں میں چھپ گیا۔ اس نے کیا رام سے فائنل امتحان نہیں دیا، لیکن نہ اسے کوئی احساس جرم ہے، نہ ہی اس کے اعتماد میں کمی آئی۔۔۔ اب جب ہماری شادی ہو گئی ہے ابو تو میں ہر معاملے میں اس سے ہنٹ لیتا ہوں۔ اس سے کیوں حاصل کرتا ہوں۔ میں کسی معاملے میں اسے کچھ ڈکٹیٹ نہیں کر سکتا۔ جب میں شاہدہ کے گھر فنکشنز پر جاتا ہوں تو میں بالکل Oddman Out ہوتا ہوں۔ پر اعتماد

شخصیت کے لئے جو کچھ درکار ہے۔ وہ مجھ میں نہیں ہے۔ ابو، مان لیں۔۔۔ وہاں میں
 الوہاٹ محسوس کرتا ہوں۔ للو سا۔ آپ کی اور بات ہے۔ آپ سیلف میڈ آدمی ہیں۔
 آپ نے ٹھونک بجا کر زندگی سے دست پنجر ملا کر زندگی بسر کی ہے۔ مجھے تو آپ نے
 روٹی میں پیٹ کر چوزے کی طرح پالا ہے۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

میں نے بڑی شفاف، با اصول، پر اعتماد زندگی بسر کی تھی۔ میرے ہاتھوں پر
 سفارش، رشوت، جینکوں کے روپے پیسے کے خرد برد کا کوئی لہو نہیں تھا۔ میں ہمیشہ اپنی
 ہمت اور کام کام سے آگے بڑھا۔ میں نے نہ کبھی بزنس میں دو نمبر کام کیا، نہ کبھی پی
 آر کو اپنایا، نہ ہی کسی سیاسی دباؤ، جھکندے اور میر پھیر سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش
 کی۔ میں ایک ایسا کردار تھا جسے شاید قائد اعظم پسند کرتے لیکن اب تو یہ سند بھی قابلیت
 اعتماد نہ رہی تھی۔ اصغری کے گھر پر بے ڈیفنس میں چار کینال کی کوٹھی بن گئی۔ تھوڑی سی
 سیانی، کافی تختی اور چپ چاپ سی اصغری اور جہانگیر جیسے نیک دل بیٹے کو میں نے
 حاصل کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اپنی انگڑ بڑی شفاف کھیلیں۔ لیکن مجھے
 معلوم نہیں تھا کہ زندگی سے جو بھی نفع کشید کریں اس میں تلچٹ ضرور ہوتی ہے اور
 وقت کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کے گلاس میں یہ دردناک مواد بڑھتا جاتا ہے۔

”آپ کیا سوچ رہے ہیں ابو۔۔۔؟“

”کچھ نہیں کچھ نہیں بیٹے“

شادی سے پہلے جہانگیر ماں کا لاڈلہ، اکلوتا، من چاہا تھا۔ اصغری تو چپا چپا کر بعد
 میں بھی بیٹے کے گرد طواف کرتی رہی، لیکن جہانگیر کے روپے میں سرد مہری آگئی تھی۔
 وہ جہانگیر جو کالج سیواپسی پر ماں کو گود میں اٹھا کر چکر پھیریاں دیا کرتا تھا، کہیں نظر نہ
 آتا۔ وہ سرد مہری سے ماں پر نظر ڈالتا۔ اس کے کسی التماس کا نوٹس نہ لیتا۔۔۔ ماں
 اس کے لئے ایک فالتو چیز بن گئی تھی۔ شادی کے بعد اس کا نظریہ اپنی ماں کے متعلق
 بدل گیا تھا۔

”آپ مائنڈ نہ کریں ابو تو ایک بات کہوں“

”کہو ... کہو ... بلکہ ضرور کہو۔ باتوں کو دل میں نہیں رکھنا چاہئے۔ اس سے جزیشن گیپ بڑھتا ہے ... خاص کر بزرگوں پر تو ایسا نکتہ نظر ضرور واضح کرنا چاہئے لیکن احترام کے ساتھ ...“

”بیچاری امی نے میری تربیت ٹھیک نہیں کی۔ انہوں نے مجھے اتنا ٹوکا، اس قدر راہیں بند کیں میری کہ میں آج کی مارڈن مسابقت بھری زندگی کے قابل نہیں رہا۔ شام کو سات بجے گھر آؤ ... نماز پڑھو، روزے رکھو ... ابو کے آگے خبردار بولے ... بڑوں کو سلام کرو ... پیٹ ٹاف کرو جیسے مکے میں جھاڑو پھیرتے ہیں۔ نہا کر سکو لچو۔ کوئی ایک آڈر ہوتا تھا امی کا ... کوئی دوست نہ بننے دیا۔ کوئی رات باہر نہ گزارنے دی ... اب یہ حال ہے کہ کسی نئے، حول میں جاؤں تو ہاتھوں میں پسینے آجاتے ہیں۔ ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ کوئی کام کروں، لگتا ہے غلط کر رہا ہوں۔ Conecntration کا یہ عالم ہے کہ ادھر بات کرتا ہوں، ادھر بھول جاتا ہوں ... آپ کو کیا معلوم ابو ... کبھی تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ میں مریضوں کو درست دوا بھی لکھ کر نہیں دے رہا ... اس طرح تو میں دس پتی رہ جاؤں گا ابو ... موٹی عینک والا پرچیاں لکھنے والا ہنٹی ڈاکٹر ... جس کے خلاف مریض اخباروں میں خط لکھتے ہیں۔“

”لیکن سی ایس ایس کر کے کیا ہوگا وہاں بھی تو اتنی ہی تنخواہ ہوگی جہاں گنیر ڈاکٹر اور سی ایس ایس افسر کا ایک ہی گریڈ ہوتا ہے ...“

جہاں گنیر نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں مزید نہ بول سکا۔ میرے اندر ڈاٹ لگ گیا۔

”گریڈ ایک ہی ہوتا ہے ابو، لیکن اتھارٹی سول سرونٹ کی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی پاورز کا کیا مقابلہ۔ آپ کو معلوم نہیں ابو، سیاسی وگوں کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے میں کہاں سے کہاں پہنچ جاؤں گا۔ شاہدہ کا خیال ہے مجھے سیاست میں جانا چاہئے ...“

وہی میرا آخری کیریئر ہوگا۔۔۔ اصلی طاقت اصلی پاور وہیں ہے۔۔۔“

ڈنڈوت کے سے انداز میں صوفے پر میں آگے ہو گیا۔ مجھے پرانے ماہ و سال یاد آرہے تھے۔ شاہد بھائی کی دوکان پر بیٹھ کر میں نے آہستہ آہستہ اپنے لئے الیکٹرونک گڈز امپورٹ کرنے کا ایک لمبا چوڑا بزنس تیار کر لیا تھا۔ اس میں کئی پڑاؤ آئے تھے۔ ہال روڈ سے گلبرگ اور وہاں سے ڈیفنس تک کئی ناما کامیاں بھی ہوئی تھیں۔ نقصانات بھی سبہ تھے، لیکن مجھے اپنی لائن چھوڑنے کا کبھی خیال نہ آیا۔

”تم محنت کرتے چلے جاؤ جہانگیر۔۔۔ برکت اللہ ڈالے گا۔“

اصغری کی ریانتیں میری نگاہوں میں گھوم رہی تھیں۔۔۔

”ہمیں پاور سے کیا لینا ہے بچہ۔۔۔ ہم کو سیاسی جوڑ توڑ سے مطلب۔۔۔ ہم نے کفایت سے گزارہ کیا۔۔۔ ایک پائی قرض مجھ پر نہیں ہے۔ کبھی پاور کا تصور بھی میرے دماغ میں نہیں آیا۔۔۔ دیکھ لو کسی سے کم نہیں۔۔۔ آرام وہ گھر ہے۔۔۔ تعلیم یافتہ بیٹا بیٹی ہے۔۔۔ اللہ رسول کا نام ہے اور کسی کو کیا چاہئے۔۔۔ دنیا بھی ملی اور دین بھی، ترقی بھی ملی اور فلاح بھی۔ ہمارے نبی ﷺ تو دو جہاں کے بادشاہ ہیں، وہ ہمیں بھی دونوں جہان دلاتے ہیں۔۔۔“

جہانگیر کو لگا جیسے باپ نے اس کے ماتھے میں ڈال مار دیا۔

”یہ آپ کی سوچ تھی، ابو جس نے مجھے مروادیا۔ یہی آپ کی قناعت پسندی تھی جس نے مجھ سے میرے ترقی کے خواب چھین لئے۔۔۔ آپ اور امی تو اتنے قابض تھے میرے جسم پر۔۔۔ میری روح پر۔۔۔ کہ میں سانس بھی آپ کو خوش کرنے کے لئے لیتا تھا۔۔۔ آپ کا بس چلتا تو مجھے روئی میں پیٹ کر پالتے۔۔۔ فیڈر سے اب تک۔۔۔ دودھ پلاتے۔۔۔ خود نہلاتے۔۔۔ منہ میں چوسنی ڈالتے اپنے سامنے رکھتے۔۔۔ ابو۔۔۔ یہ محبت نہیں ہے جو آپ نے مجھ سے کی۔۔۔ پرفینچ پرندہ۔۔۔ ہوں میں زخمی پرندہ۔۔۔ آپ نے شہباز کے ناخن کاٹ دیئے ہیں اور اب اس سیف کا رکنے کی امید

رکھتے ہیں ... ایسے نہیں چلے گا ... ایسے چل نہیں سکتا ... میں دیوانہ ہو جاؤں گا ...
 یہ گھر ہے؟ آپ نے گھر دیکھے نہیں ... نہ آپ کا کوئی Exposure تھا، نہ آپ نے
 مجھے آنکھ کھول کر کچھ دیکھنے دیا ابو ... میں ... بدحواس جھپٹی ہوں ... میں شاہدہ کے
 لئے کچھ نہیں کر سکتا ... وہ ٹھیک کہتی ہے، آپ دونوں بڑھوں نے مجھے Passivity
 سکھادی ہے ... میں Fight Back نہیں کر سکتا ... مجھے سی ایس ایس کرنا پڑے
 گا ابو ... ورنہ میں پیچھے رہ جاؤں گا ہر وہڑ میں ...“

”پیچھے رہ جانے سے تمہاری کیا مراد ہے جہانگیر؟ ... ترقی کی دویمتیں ہوا کرتی ہیں
 ... ایک دنیاوی، دوسری روحانی ... ایک، دی ترقی، دوسری فلاح دارین ...“
 ”آپ شاید سمجھ نہیں رہے ابو ... زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے اور آپ ابھی
 گڈے کی سواری میں خوش ہیں۔ یہ رفتار کا زمانہ ہے ابو۔ جو بیٹھ کر سوچتا رہے گا، وہ
 پیچھے رہ جائے گا۔“

”تمہاری تعلیم اچھی ہے، اگر کوشش کرو تو ایف آر سی ایس بھی کر سکتے ہو ... دیکھتے
 نہیں، آج کل ڈاکٹروں کی آمدنی کتنی ہے؟ ... تم باہر جا کر ابھی بھی اپنی تعلیم بہتر
 کر سکتے ہو۔“

”ان ڈاکٹروں کی ابو ... جن کے ریسورس ہیں ... جو پرائیویٹ کلینک بنا سکتے
 ہیں۔ میرے جیسے ڈاکٹر تو مشکل سے ہٹی چلا سکتے ہیں۔ بازار میں دوکان ڈال سکتے
 ہیں ...“

”شروع شروع بازار میں دوکان چلانا کوئی برائی نہیں جہانگیر ...“
 ”یہی تو آپ کی مشکل ہے ابو ... نہ آپ سٹیٹس کو سمجھتے ہیں، نہ دولت کو، نہ ماڈرن
 لائف کو ... آپ ابھی ایک اور عہد میں جی رہے ہیں جہاں دولت ہوتی ہے، لیکن
 معیار زندگی نہیں ہوتا۔ جہاں سب کچھ ٹھہرے پانیوں کی طرح جامد و ساکت رہتا ہے
 ... یہ زندگی ہے، زندگی ہے یہ ... چل کر شاہدہ کے گھر دیکھیں۔ اول بدل، یہ جاوہ ...“

... مصروفیت، سوشل لائف، رفتار ... آپ نے مجھے اور ارجمند کو اردو میڈیم سکول میں پڑھایا۔ ہم نے اقبال غالب کے نام تو سن لئے، لیکن ہمیں وہ گفتگو بھی نہ آسکی جو آج کل اردو میڈیم Elites کرتے ہیں۔ لیکن ہم وہ باتیں بھی نہیں کر سکتے جو اقبال غالب والے کرتے ہیں۔ آپ نے میں نہ سیر و سیاحت کا شوق ڈالا، نہ ہمیں معلوم ہو سکا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ سکول سے گھر ... گھر سے کالج ... ہر وقت واپس گھر گھر گھر ... کسی دوست کو گھر نہیں لاسکتے، کسی کے گھر جا نہیں سکتے ... آپ اسے تربیت سمجھتے ہیں۔ آپ سمجھتے تھے میں لڑکی ہوں جسے چادر اور چار دیواری میں بند کر کے آپ درست کر رہے تھے۔ سچ بتائیے میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے مجھے یوں لڑکیوں کی طرح پالا؟ کیا آپ نے مجھے شریف بناتے بناتے خصی نہیں کر دیا؟ ... مجھ سے میری مردانگی نہیں چھین لی ...؟ میں مرد ہوں؟ مردوں کی یہ ہمت ہوتی ہے۔ مرد ایسے بزدل ہوتے ہیں ... اپنی بیوی سے ڈرنے والے؟“

میں بھی ساری عمر دوکان سے گھر اور گھر سے دفتر جاتا رہا تھا۔ میں سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ کانتوں سے محفوظ رہنے، اندر اور باہر کے شر سے بچنا حاصل کرنے کا مجھے اور کوئی طریقہ بھی نہ آتا تھا۔ اسی گھر کے ساتھ میں نے جہنگلیر کی پرورش کی۔ یہی وہ آخری جنگ تھی جھوس عادت مند جہنگلیر نے مجھ سے لڑی اور عین اس لڑائی سے تیسری رات جب میں اور اصفری داتا دربار گئے ہوئے تھے، وہ اپنے بیٹے ہارون اور شاہدہ کو لے کر اپنے سسرال چلا گیا اور اسی ایس ایس کی تیاری کرنے لگا۔ داتا دربار سے لوئے تو اس کا رقعہ ملا۔

”اماں ... میں آپ سے مل کر اس سے نہیں جاسکتا کہ پھر میں یہ گھر چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ یہاں رہ کر میں ہی ایس ایس کی تیاری نہیں کر سکتا۔ آپ کی نگاہیں اور ابو کی باتیں مجھ میں احساس جرم پیدا کریں گی۔ میں آتا جاتا رہوں گا۔ آپ بھی پلیز ہمیں ملنے آیا کریں ... امید ہے آپ مجھ جائیں گے۔“

اس رفقے کے بعد ہم دونوں دیر تک چپ چپ بیٹھے رہے، نہ جانے کیوں مجھے اچانک ارجمند بھی بہت یاد آئی۔۔۔۔ ہم دونوں اتنا تو سمجھ گئے تھے کہ بچوں کی پرورش میں ہم سے کہیں غلطی ہوگئی تھی، ورنہ وہ دونوں ہمارے ساتھ رہنے پر رضامند رہتے۔

مجھ سے قریباً پچیس سو سال پہلے کھل و ستو کے راجہ شد و دھن نے بھی یوں ہی سوچا تھا۔ وہ گوتم قبیلہ کا راجہ تھا، وہ علاقہ جو آج نیپل کہلاتا ہے، یہاں ہی کھل و ستو کے مقام پر اس کی مہارانی مایا نے سدھارتھ کو جنم دیا جو پہلے گوتم پھر سدھارتھ رفتہ رفتہ شاکیا منی اور اتم میں بدھا کہلایا۔ بدھ کی پیدائش سے کچھ عرصہ بعد مہارانی مایا فوت ہوگئی اور سدھارتھ کی پرورش کا ذمہ دار راجہ شد و دھن ہی ٹھہرا۔ شد و دھن راجہ جو کھشتری تھا اور شاکیا منی تھا، اپنے بیٹے گوتم کے لئے اس درجہ متکبر اور بدحواس تھا کہ اس نے ہر طور کوشش کی کہ پردھ درد کے دروازے بند رکھے۔ بڑھاپا، بیماری، موت کے مناظر محل کے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ کسی مرجھائے ہوئے پھول کو ٹہنی پر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ کانٹوں کو شاخوں سے اتار دیا جاتا، لیکن زندگی کا مننی Exposure نہ ہونے کے باعث گوتم سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ جس مننی سوچ کو راجہ نے محل سے نکالا تھا۔ وہی سوچ سدھارتھ کے تخیل میں جا بسی۔ شد و دھن کی اس خود ساختہ جنت سے بدھا کا دل اچاٹ ہو گیا۔ حضرت آدم کی کہانی ایک بار پھر دوہرائی گئی اور ایک رات سدھارتھ انتیس برس کی عمر میں رانی یشو دھرا اور اپنے بیٹے کے پہلو سے نکلا اور جنت کی خوشیوں سے دبے پاؤں غم سے بوجھ زندگی کی تلاش میں نکلا۔

بدھا جاننا چاہتا تھا کہ کس طرح دکھ کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینکا جاسکتا ہے، دکھ کا حاصل کیا ہے اور دکھ انسان کی زندگی میں کہاں کہاں معاون ثابت ہوتا ہے۔ آٹھ سال دو برہمنوں کے آگے دست بستہ ٹریننگ لیتا رہا۔۔۔۔ لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ چھ سال اس نے اپنی ذات کو شدید مجاہدات کے حوالے کیا۔۔۔۔ لیکن پھر اس پر صرف اتنا عرفان ہوا کہ زندگی کی راحت فقط درمیانی راستہ اختیار کرنے میں ہے۔ مننی

اور مثبت کے درمیان میں دکھ اور خوشی کے وسط میں ... اس کے باپ شد و دھن پر محل میں کیا گزری؟ یہ دوسری کہانی ہے ... یثودھرا اور بچے نے گیا کے درخت تلے نروان حاصل کرنے والے کا کیسے انتظار کیا۔ یہ تیسری کہانی ہے، جس پر لوگوں کی توجہ اس لئے نہیں جاسکتی کہ جو لوگ انسانیت کے لئے بڑے کام کر جاتے ہیں۔ ایسے ہاتھیوں کے پیروں تلے کچھ بونے، ادنیٰ رسومات، ناکارہ مسلک، پس بھی جاتے ہیں، لیکن پھاؤڑا جب دھرتی کا کلیجہ پھاڑ کر نئی فصل کاشت کرنے کا عزم کر لیتا ہے تو اسے علم نہیں ہوتا کہ زیر زمین بسنے والے کیڑے مکوڑے، جڑی بوٹیاں، گھاس پھوس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہی ارتقاء لانے والے بڑے آدمی کی قسمت اور چھوٹی مخلوق کی قربانی ہے، جس کے تحت بنی نوع انسان آگے سے آگے، آگے سے آگے اور آگے ارتقاء کرتا چلا جاتا ہے ... اور اسی ارتقاء کے سہارے ابد کی جانب اور آگے بڑھتا ہے۔

مجھ بگی داڑھی والے راجہ شد و دھن کا کمرہ اوپر والی چھت پر تھا۔ جن دنوں شاہدہ ہمارے پاس تھی، وہ کبھی کبھی ہمارے پاس خیر خیریت دریافت کرنے چلی آتی اور ممس کی طرح ہر رے دائرے کو چھو کر نکل جاتی۔ اوپر والے دو کمروں کے سامنے چھوٹا سا ٹیرس تھا، جس کے سامنے رواں دواں سڑک تھی۔ میں لوہے کی آرام کرسی میں دھنس کر اسی ٹیرس سے سڑک کا منظر دیکھتا رہتا۔ یہیں بیٹھ کر مطالعہ کرتا، اخبار پڑھتا اور یہاں ہی ورزش کے طور پر چلا بھی کرتا تھا۔ مجھے ایک عرصہ سے کبھی بس پر سفر کرنے کا موقع نہ ملا۔ لمبی سیاہ گاڑی پر دوکان سے گھر اور گھر سے دوکان جاتے آتے احساس نہ ہوا کہ بزنس ختم کرنے کے بعد یہ آسائش بھی زاید ہو جائے گی۔ میں نے ساری بزنس گول کر دی تھی۔ اب مجھے مزید بھاگ دوڑ کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی کبھار پرانے دوست یا رشتہ دار ملنے آ جاتے تو وہ اسی ٹیرس پر بیٹھ کر چلے جاتے۔ ان لوگوں کے بھی تیز رفتار زمانے میں بہت سے مسائل تھے۔ اس لئے یہ بھیڑ بھی جلد

چھٹ گئی اور میل ملاقاتی اپنے مسائل میں گم ہو گئے ... یہ بہت بہت پہلے کی بات ہے۔

شاہدہ جوں پتی ہوئی او پرواں منزل پر آئی۔ ابھی جہانگیر شاکیہ منی ہم سے رخصت نہ ہوا تھا۔ میں چھوٹے میز پر شیشہ گائے الیکٹرک شیور سے خط بنانے میں مصروف تھا۔

”آسکتی ہوں جی“

”آئیے آئیے رہے نصیب بسم اللہ ...“ شاہدہ نے میز پر رکھا ہوا آئینہ نشو سے صاف کیا۔

میں دل میں سوچنے لگا کہ شاہدہ کیا مجھے سلام کرے گی نہیں؟ سارے میں پائین اپیل کی خوشبو پھیل گئی۔

”آپ یہاں بیٹھ کر شیو کرتے ہیں“ شاہدہ نے سلام کے بغیر گفتگو کا آغاز کیا۔

مجھے اپنے اس فعل پر کچھ شرمندگی کا احساس ہوا۔

”یہاں ذرا روشنی زیادہ ہے ...“ اب عینک کے نمبر ختم ہو چکے تھے اور میں انز لگا کر اخبار پڑھنے لگا تھا۔

نشو سے کرسی صاف کر کے شاہدہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر پائین اپیل کا جوں پینے کا شغل جاری رہا۔

”وہ ایک بات کرنا تھی آپ سے ... جہانگیر تو ہرگز معاملہ آپ کے سامنے پیش نہیں کرے گا۔“

”ہاں ضرور ...“ مجھ کو اپنی اہمیت کے احساس نے سیدھا ہٹھا دیا۔

”ہم لوگ امی کی طرف شفٹ کرنا چاہ رہے ہیں ...“

میں نے بہت سی باتیں پوچھنا چاہیں۔ کیوں؟ کس لئے؟ کتنے عرصے تک ...

لیکن سارے سوال دل میں چھپا کر میں خوش دلی سے بولا ...

ہاں ہاں کیوں نہیں کیوں نہیں“

”یہ میں جہانگیر سے کہہ رہی تھی کہ ابو کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ تمہاری طرح

Unreasonable نہیں ہیں“

اس تعریف کو میں نے غنیمت جانا اور خاموش رہا۔

”ویسے میں ایک بات پوچھوں آپ ماسٹڈ تو نہیں کریں گے؟“

”نہیں نہیں پوچھو پوچھو“

”یہ جہانگیر کو آپ نے کیسے پالا ہے؟ میں سمجھ نہیں سکی۔ اس قدر Sissy آدمی

.... آپ مرد پال رہے تھے کہ لڑکی چوڑیاں پہنا دیں، دوپٹہ پہنا دیں اسے

کسی سے سیدھی بات نہیں کر سکتا، ہکلا نے لگتا ہے Confidence نام کی کوئی

چیز نہیں اس میں آپ نے جہانگیر کو لائف کے قریب نہیں ہونے دیا، کچھ Face

نہیں کرنے دیا He has no Confidence اگر یہ یہاں رہا تو سی ایس

ایس نہیں کر سکے“

میں نے کہنا چاہا کہ اسی گھر سے تمہارے جہانگیر نے ایم بی بی ایس کیا تھا، لیکن

چپ رہا۔ ہر شد و دھن کو چپ رہنے کا حکم ہے۔

”اچھا جی کوئی Hard Feelings کے بغیر ہی کام بن جائے تو اچھا ہے۔

بس جہانگیر کا کام تو اتنا ہے جو ہو چکا اس پر بھی خوفزدہ جو ہو رہا ہے اس سے بھی

ڈرے ہوئے اور جو ہونے والا ہے اس سے تو مائی گوڈ اتنے Scared کہ جان ہی

نکل جاتی ہے“

وہ بغیر اضافی جملوں کے اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ صرف ایک پھڑپھڑاتا ہوا نشو اس کی

نشانی میز پر رہ گیا۔ جانے سے کچھ دن پہلے ڈرائنگ روم میں زبردست ہنگامہ بھی ہوا

تھا

میں بارہ کھلنے والی کھڑکی کے سامنے لا نہیں بیٹھا تھا، لیکن پردے کھینچے تھے، اس لئے

اندروالوں کو احساس نہ ہوا کہ آواز بار بھی جاسکتی ہے۔ شلہد نے گرج کر کہا ”جب میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نے ابو جی کو انفورم کر دیا ہے تو اب تمہیں فارمل اجازت لینے کی کیا مصیبت ہے یہ کوئی سرکاری تبادلہ ہے کہ فارمل اطلاع دینا ہوگی۔“

”امی ابو اس بڑے گھر میں بالکل تمہارے جائیں گے، شلہدہ This is not fair

“

ڈاکٹر جہانگیر نے منمننا کر جواب دیا.....

”اور یہ میرے ساتھ فینر ہے؟ میں ایک ایکڑ کی کوٹھی چھوڑ کر اس چار کنال کے ڈر بے میں آئی۔ میرا خیال تھا کہ تم جلد کوئی انتظام کرو گے، لیکن تم جیسے چکن ہارنڈ لوگ خود بھی پستے ہیں اور دوسروں کو بھی پسے کا حکم لگا دیتے ہیں۔ تمہارے نزدیک یہ Idealism ہے۔ مائی فٹ ...“

”میں کب کہتا ہوں کہ میں Idealism کا شکار ہوں“

”میں جانتی ہوں، سمجھتی ہوں ساری چالیں انگو رکھتے ہوں تو آدمی نیک بن جاتا ہے۔ تم جیسے لوگوں کو اگر دولت، سٹیٹس اور موقع ملے تو تم نہ جانے کیا کیا کرو ... نمبرون لپے بد معاش نکلو ... تمہارا ہاتھ ہی نہیں پڑتا، اس لئے تم نے نیکی کی وردی پہن رکھی ہے ... تم یہاں رہے تو جہانگیر میں تمہیں چھوڑ دوں گی ... یہ جگہ میرے لئے گالی ہے ... ان کمفر ٹیبل ہے ... میں قربانی تو دے سکتی ہوں، لیکن ساری عمر قربانی کا بکر نہیں بنی رہ سکتی ... انسان ایک بار پیدا ہوتا ہے، ایک بار زندگی گزارتا ہے۔ "Life is for once only"

منمننا کر جہانگیر نے کچھ جواب دیا۔

”بلڈی شٹ تم اپنے ماں باپ کے لئے Considerate ہو اور میرے لئے ... میرے بچے کے لئے؟ تم کو علم ہی نہیں میں یہاں کس طرح Suffer کر رہی ہوں۔ تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو باسٹرڈ؟ تمہارے پاس ہے کیا دینے کے

لئے ایک سیکنڈ ہینڈ سوزو کی کار ... یہ Bitchy ہاؤس، ایک نالائق کک ... ایک ہاف بیکڈ ہاپ ... ایک پاگل ماں ... یہ سب کچھ دینے کے لئے تم نے شادی کی تھی مجھ سے ... میں نے تمہاری خاطر اپنی مٹی ڈیڈی کا دل توڑا ... ساری فریڈز چھوڑیں۔ اس ڈرنٹی جین ہول میں آکر انہوں نے میرا ہی مذاق اڑانا تھا ناں۔ اتنی ساری قربانی کا یہ صلہ دیا تم نے جہانگیر ...؟ تم اتنا بھی ریلیز نہیں کرتے کہ اس Un hygeinic جگہ میں میرا بچہ نہیں پل سکتا ... میں ... کوئی فرشتہ نہیں ہوں کہ تمہاری ہر بات مان لوں گی ... کچھ باتیں تمہیں بھی ماننا ہوں گی جہانگیر ... ایک بڑھے پھوس جوڑے کی خاطر ہم اپنی زندگی کا پیٹرن بر باد نہیں کر سکتے ہاں۔“

جہانگیر اور شاہدہ کے چلے جانے کے بعد ہم دونوں پھر اوپر والی چھت سے اتر کر نیچے آئے، لیکن ہماری زندگی کا پیٹرن بالکل نہ بدل۔ ہم پہلے بھی بغیر پانی کے پھول تھے اب بھی ماہی بے آب بن کر وقت گزارتے رہے۔ صرف اتنا ہوا کہ میرے سامنے والے سارے دانت یکے بعد دیگرے ٹوٹ گئے اور مجھے علم نہ ہو سکا۔ اب نہ مجھے نام یاد رہتے، نہ لوگوں کے چہرے دیکھ کر کوئی شناخت ابھرتی۔ پل بھر پہلے کا واقعہ ذہن سے محو ہو جاتا۔ صرف پرانی یادیں گھیرا ڈالے بیٹھی رہتیں۔ جہانگیر کا بچپن، اصغری کی جوانی، ارجمند کا چہرہ، جوانی میں رخصت ہو جانے والا باپ اور بہن بھائی جن کو زندگی کھا گئی یا میری ترقی اور پھر اقبال ... ایک واہمہ، ایک خواب، پرانے گھر، سکول میں ہونیوالے واقعات چھوٹی چھوٹی باتیں جنہوں نے انہونی کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ مای گویا زندہ اور جاندار ہو کر میرے انتظار میں رہتے۔ گھنٹوں چھوٹی سی آرام وہ کرسی میں بیٹھ کر پھانک کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بسوں کو دیکھتا رہتا۔ بظاہر بچوں کے لوٹ آنے کے علاوہ مجھے اور کسی چیز کا انتظار نہ رہتا۔ شاید میں موت سے خائف تھا، اسی لئے ماضی میں پناہ بیٹا تھا۔ شاید میں خوشی کے معجزے کا انتظار ہی تھا جواب نامکمل تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ انتظار مہینوں کا ہے کہ سالوں کا ... کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے ... ہمیشہ دل نے کہا ... عقل کہتی رہی کچھ ہونے کو باقی نہیں رہا۔ اب اور کیا ہوگا ... سزائے موت ... لیکن ایک بات میری سان وگمان میں نہ تھی کہ اصغری بھی بچھڑ سکتی ہے۔ وہ سلیپروں میں کھڑ پڑ کرتی، گھر کے ساز و سامان کو چھیتھڑوں سے صاف کرتی۔ اپنے دونوں بچوں کی رخصتی کے بعد ایک سایہ سا گھومتی پھرتی موجود تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی مجھے انتظار رہتا، کچھ بدل جانے کا ... اچانک بہار کے آئے کا ... شاید اقبال کا؟ ... بہر کیف ایک اندھی سی شام کو بغیر اطلاع کے جہانگیر وارد ہو گیا ... اصغری کی موت کے بعد میں جہانگیر سے ملنے نہیں گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس نے سی ایس ایس کا امتحان دیا کہ سر کی فیکٹری میں حلول کر گیا۔ پوتے کی یاد کبھی کبھار آتی تھی، لیکن میں نے اس یاد کو بھی اسی الماری میں بیگنر پر لٹکا کر رکھ دیا، جہاں اور بہت سی استری شدہ یادیں کپڑوں کی صورت پہنے جانے کی منتظر تھیں۔ ملازم چھٹی پر تھا۔ میں چائے کی پیالی بنا کر ڈرائنگ روم میں آ رہا تھا، جب جہانگیر دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ دروازہ کھلنے پر نظر آیا کہ جہانگیر کی گاڑی بڑی تھی اور اسے ڈرائیور چلا کر لیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے دل میں شکر کیا کہ شام کا اندھیرا تھا اور ابھی میں نے بتی نہیں جلائی تھی۔ ایک شہر اور اتنے لمبے فاصلے ...

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں ابو“ جہانگیر نے باپ کے ہاتھ سے پیالی پکڑ کر تپائی رکھی۔

”چائے پینے لگا تھا۔ پیو گے“

”اور وہ کہاں ہے غلام نبی“

”وہ سوات گیا ہے چھٹی پر ...“

”کب آئے گا“

”پر سوں آ جائے گا۔ پندرہ دن کی چھٹی پر گیا تھا ...“

”آپ اتنی لمبی چھٹی نہ دیا کریں اسے ... امی کے بعد آپ کو کون لک آفر کرے“

گا۔ اس کی آواز میں احساسِ جرم تھا۔۔۔ سعادت مند بیٹے کا احساسِ کم مائیگی۔

”ہاں۔۔۔ تم ٹھیک ہو۔۔۔“

”جی۔۔۔“

”اور بے بی کہاں ہے؟۔۔۔“ مجھے یاد نہیں تھا کہ کا بے بی اصلی نام ہارون ہے۔

”میں آپ کو کچھ بتانے آیا تھا۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں ضرور۔۔۔“

جہانگیر نے اٹھ کر کمرے کی بتیاں روشن کر دیں۔۔۔

”میں نے فیصلہ کیا ہے۔۔۔ میں امریکہ چلا جاؤں۔۔۔ یہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے اور میں

نے کمپیوٹر میں ایم سی ایس کر لی ہے۔۔۔“

لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، وہ سی ایس ایس کرنے کے لئے شاہدہ کے گھر منتقل ہوا تھا۔ جب تک اصغری رہی، ہم کبھی کبھی ان دونوں سے ملنے جاتے بھی رہے، لیکن ہماری معلومات جہانگیر کے معاملے میں ہمیشہ نا کافی رہیں۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کبھی اس نے مجھ سے کمپیوٹر کا ذکر کیا ہو۔

میں نے روشنی میں اپنے ڈاکٹر بیٹے کو دیکھا۔ وہ اب کسی فیکٹری کا چیف ایگزیکٹو لوگ رہا تھا۔ ڈاکٹری اور سرکاری افسری اس کے قریب قریب کہیں نہ تھی۔

”لیکن تم تو یہاں سے سی ایس ایس کرنے گئے تھے جہانگیر۔“

”بس ایسے ہی ہے ابو۔۔۔ وہاں میرے سر نے مجھے اپنی فیکٹری میں جگہ دے

دی۔ امتحان نہ دے سکا میں۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا کیا چھوڑ دیا امتحان۔“

”نہیں ابو۔۔۔ اب میں خود اعتمد مرد بن گیا ہوں۔۔۔ میں کسی کارخانے دار کی

پلیٹ سے لے کر نہیں کھا سکتا۔ مجھے اپنا مستقبل۔۔۔ اپنے بچے کا مستقبل خود بنانا ہے

۔۔۔ میں ان لوگوں کا دست نگر نہیں رہ سکتا۔ اگر شاہدہ کے لئے یہاں رہنا مشکل تھا تو

میرے لئے بھی وہاں زندگی کچھ آسان نہیں۔۔۔ میری غیرت کے بھی کچھ تقاضے ہیں آخر۔“

میں نے ٹھنڈی چائے کا گھونٹ بھر کر اسے دیکھا۔۔۔“ لیکن امریکہ کی زندگی تو بہت مشقت طلب ہے۔۔۔ شاہدہ اتنی اوکھی زندگی بسر کر لے گی۔۔۔ وہ تو نازوں میں پلی ہے۔ پانی بھی اٹھ کر خود نہیں پی سکتی۔۔۔“

”اب اس کے لئے کوئی چوائس نہیں ہے ابو، فیکٹری چلا کر میں بھی بندوں کو چلانا سیکھ گیا ہوں۔“

”یہاں سسرال میں ہم دونوں کی کوئی عزت نہیں۔ وہ بھی اب ریلیز کرتی ہے۔ یہ اسی کا فیصلہ ہے کہ ہم باہر چلے جائیں اور اپنی زندگی خود بنائیں اسے بھی شوق چڑھا ہے۔۔۔ وہ بھی ارجمند کی طرح Independent ہونا چاہتی ہے۔“

جب میں جہانگیر کو ایئر پورٹ چھوڑ کر واپس لوٹا تو مجھے پتہ چلا کہ اتنے بڑے شہر کی اداسی کیا ہوتی ہے اور رونق کے دل میں تنہائی کا چٹاخ کیسے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ امریکہ سدھارنے سے پہلے کبھی کبھی جہانگیر مجھے فون کر دیتا تھا۔ دو مرتبہ عید کے موقع پر شاہد بے بی کو بھی لے کر آئی، لیکن بچہ دادا کے ہاتھ سے کچھ لے کر رکھ نہ سکا۔ اسے باہر کی چیزیں کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک دفعہ میں نے آئس کریم والے سے قلفی لے کر بے بی کو دی تو ہارون نے لچائی نظروں سے قلفی کو دیکھا اور پھر لوٹاتے ہوئے کہا۔۔۔“ دادا مجھے Allowed نہیں ہے۔“

جہانگیر نے جلدی سے قلفی بچے کے ہاتھ سے اچک لی اور بولا۔۔۔ اپنے بیٹے کو کھاتے نہیں اور پوتے کی خدمت ہو رہی ہے۔۔۔ ساری زندگی آپ نے مجھ سے سوتیلے بیٹے کا سا سلوک کیا۔ شاہدہ اور بچہ ابلا ہوا پانی پیتے تھے، اس لئے بازاری پانی کی الگ بوتل بھی ساتھ آتی۔ میں انہیں اپنے نل کا پانی بھی پلا نہیں سستا تھا۔۔۔ نام بھی شہدہ کے والدین نیر کھا تھا، اس لئے مارے انا کے میں بھی نام نہ سیکھ سکا اور بچے کو بے بی ہی بلا

رہا

کپل وستو کے محل میں مہارانی مایا نے جب گوتم کو جنم دیا تو راجہ شتو دھن کو علم نہ تھا کہ بیٹے کی پرورش کیوں کر اور کیسے کی جاتی ہے؟ راجہ شاکیا قبیلہ کا سردار رہا تھا۔ اسے حکومت، سیاست اور ظلم کا علم تو ضرور تھا، لیکن پرورش، مہربانی اور آنسوؤ کی تاثیر سے وہ نابلد تھا۔

مرنے سے پہلے مہارانی مایا نے شتو دھن کی گود میں سدھا رتھ کو دے کر کہا ... ”راجہ جی اس کام نہ تو دیکھئے بھلا ... یہ چت چور تو بڑے گہرے دھیان میں لین ہے۔۔۔۔۔ اس کا من کیسے لگے گا؟ اس سنسار میں۔۔۔“

”تم اپنی چٹا کرو مہارانی جی۔ اس بالک کی اور مت دیکھو ...“

لیکن مہاں مایا کو اپنا دھیان نہ تھا ... مہاراج ادھیراج یہ سنتاں کبھی کشت نہ اٹھائے ... میں جیتی رہتی تو اس کے منہ سے یہ ساری چٹا ہرن کر دیتی، پر اب یہ بالک آپ کے شرن ہے۔ اسے کشت اور اداسی سے بچائے گا ورنہ میری آتما۔“

راجہ کی ممتاز محل جاتے جاتے جملہ ادھورا چھوڑ گئی ... پر راجہ راج پاٹھ کے چلن بھول گیا ... اب اسے ایک ہی کارگزاری سے غرض تھی کہ بہت سوچنے اور دھیان کرنے والے چہرے پر اداسی کی چھاپ نہ ہو ... گوتم کشت بچھیلے، نہ اندر نہ باہر ... گیان دھیان کی چٹا کسی طرح گوتم کے چہرے کی پر چھائی نہ بنے۔

مرنے سے پہلے اصغری بولی۔ ”ہمایوں صاحب آپ بڑے بھولے اور سیدھے آدمی ہیں۔ میں نے ساری عمر بچوں کی تربیت کا بوجھ آپ پر نہیں ڈالا۔ لیکن اب بیچ منجدھار جانا پڑے گا۔ مجھے نظر آ رہا ہے ... جہانگیر کا اپنا کوئی اس کے قریب نہیں۔ آپ کے گھر والوں نے تو کوئی رشتہ نبھانے کی کوشش نہ کی۔ سب اپنے اپنے بلوں میں گھس گئے۔ ارجمند پہلے سے امریکہ زادی ہو گئی ہے اب جہانگیر بھی سرال جا بسا ... برسوں ادھر میرا نیکہ بھی چھوٹ کر کراچی جا بسا ... اب آپ ہی آپ ہیں ...“

جہانگیر بڑا صابر اور حساس ہے۔ دل کی بات کو زبان پر آتے آتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ آپ اگر اس کی خاموشی کو نہ سمجھتے تو قیامت آجائے گی۔۔۔ وہ۔۔۔ اپنی کسی خواہش کا اظہار تو کرنے والا نہیں۔۔۔ بس اسے اداسی سے بچائیے گا۔ میں ہوتی تو۔۔۔“ قدرت نے اصغری کو نہ تو اپنا پنٹھ نبھانے دیا، نہ ہی دکھڑا ہی بیان کرنے کی خوش بیان دی۔“ لیکن میں بھی کیا کر لیتی بھلا۔ آپ ہی آپ ہیں اب تو۔۔۔“

اصغری کی سرری خواہشیں بھی اس کی باتوں کی طرح ادھوری تھیں جیسے اس کی پوری بات سن کر جواب دینے والا کوئی تھا ہی نہیں۔۔۔ اس ادھوری عورت نے جانے میں بھی عجب بے تکاپن دکھایا۔۔۔

ہم باپ پیٹا ڈائلاگ تو قائم نہ کر سکے، کیونکہ وہ امریکہ میں تھا، لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک ایسا پل تعمیر ہو گیا تھا جو میلی پیتھی کے سہارے چلتا تھا۔ فون پر جتنی باتیں ہوتیں وہ غیر ضروری ہوا کرتیں۔ ہم اندر کے حالات زیر بحث نہلا سکتے۔ بہن کی نقل میں یا اپنی آزادی کی تلاش میں جہانگیر بھی امریکہ چلا گیا۔ اسے بھی شاید کسی بودھی درخت کی تلاش تھی جس کے نیچے بیٹھ کر وہ راحت اور غم دونوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا۔ امریکہ میں اسے کمپیوٹر کی ایک بڑی کمپنی میں بڑی اچھی نوکری مل گئی۔ شاہدہ اس تبدیلی پر خوش تھی اور بالآخر اسے آزاد چلن کی ویسی زندگی مل گئی، جس کی وہ ہمیشہ سے آرزو مند رہی۔ جہانگیر کینون باقاعدگی سے آتے، لیکن ڈاکیہ کبھی کوئی پریم پتر نہلایا۔ میں جانتے بوجھتے ہوئے ہر روز ڈاکے کا انتظار کرتا رہتا۔ کبھی کبھی لفافے میں ہارون کی تصویریں مل جاتیں تو میں ان تصویروں کو تکیے تلے رکھ کر بار بار نکالتا، دیکھتا اور پھر رکھ دیتا۔۔۔ خالی کمروں میں گھومتے رہتا، کئی بار پڑھے ہوئے اخبار کو پھر پڑھنا۔۔۔ بازار جا کر سب کچھ بھول جانا، درختوں سے زرد روپے گرتے دیکھنا، پرندوں کی آواز پر کھڑکی کھول کر پرندوں کو عتابی نظروں سے تلاش کرنا، ملازم کو اپنا خدا سمجھنا، سردیوں میں جرابوں اور سویٹر سمیت سونا اور گرمیوں میں کھانسی کے اندیشے سے بغیر

ایئر کنڈیشنر کے رات بسر کرنا، عبادت میں دل لگانے کی ناکام کوشش اور مسجد میں نماز ادا کرنے کو اہم تو سمجھتا ... لیکن ایسا تو اتر سے کر نہ سکن۔ نہ جانے کیوں رفتہ رفتہ ساری بھیڑ چھٹ گئی۔ رشتہ دار سب راستوں میں کھو گئے یا میں نے ان کا تعاقب بھی سلیقے سے نہ کیا۔ زندگی لوگوں سے اور کام سے خالی ہو کر بنجر ہو گئی ... کچھ تو جہانگیر کی یاد کا جھکڑ اس صحرا پر اڑانے پھرتا۔ کچھ ارجمند کو پرایا مال سمجھ کر بھولنے کی کوشش میں دن کٹتے۔ پھر خالی خولی ہو کر کہیں نہ کہیں بیٹھ رہنے کو پرانی یادوں کو کان لگا کر سننے میں وقت گزرنے لگا۔

پتہ نہیں یوں کتنے سال گزرے ... میرا وقت اب کیلنڈروں کا تابع نہ رہا تھا۔ میں موسموں اور واقعات کا سہارا لے کر بھی اپنے وقت کی بانٹ نہ کر پاتا۔ اب تو رب کی وقت کی طرح میرے ماہ وصال بھی آپ گزرنے لگے۔ پھر اچانک ایک دن جہانگیر وارو ہو گیا۔ اس کے ساتھ صرف دو سوٹ کیس اور ایک بیگ تھا۔ شاہدہ اور ہارون ساتھ نہ تھے۔ لمبے سفر کی تکان نے اس کے چہرے کو اور بھی ادا اس کر رکھا تھا۔ ہم دونوں میں خاموشی، تنہائی اور ان کہی محبت کا گہرا حجاب تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور رکی باتوں کا آغاز کیا ... کچھ دیر کے بعد یہ باتیں بھی ختم ہو گئیں۔ کوئی راستہ دل کی اندھیری غار میں نہ اترتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چھپتے، شرماتے اور کتراتے سے رہے۔

”شاہدہ کا کیا حال ہے؟“ کوئی دسویں مرتبہ اندر کے باپ نے پوچھا۔
 ”ٹھیک ہے ... ہوا مریکہ میں بہت خوش ہے۔ جس طرح کی آزادی اسے درکار تھی مل گئی ہے۔ نہ سسرال، نہ مایکا۔ سارے جنجال ختم۔“
 ”لیکن وہاں تو کام بہت کرنا پڑتا ہے ...“

جہانگیر مسکرایا۔ پھر بولا۔ ”کام تو ہم دونوں مل کر ہی کرتے ہیں۔ میں برتن دھو دیتا ہوں، وہ واشنگ کرتی ہے ...“

”ابو جی ... امریکہ میں ہر کام برابر ہے۔ مرد عورت کی کوئی تمیز نہیں ... کام کام ہے ... چاہے پرائم فیسٹر کا ہو یا ٹرک ڈرائیور کا ...“

”اچھا اچھا ...“ میری سمجھ بوجھ پرانی تھی۔ میں پرانی روایات کو اتنی آسانی سے بھول نہیں سکتا۔ مشرق میں ابھی مرد اور عورت کی دنیا اس قدر گنڈنہ ہوئی تھی۔ دونوں کے رول اور کام کافی حد تک Defined تھے۔ امریکہ میں یونی سکس کی تیاریاں شروع تھیں۔

”بس Gloves پہن لیتا ہوں ... ایپرن سجالیتا ہوں۔ میرے ایپرن پر اباجی آئن سٹین کی تصویر بنی ہے ... میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے آپ یاد آ جاتے ہیں۔“

آئن سٹین کی تصویر ایپرن پر؟ کبھی کبھی اپنے آپ کو عزت بخشنے کی خاطر ... لوگ بے ادبی کے بھی مرتکب ہو جاتے ہیں ... بڑے ناموں کو چھوٹے مقاموں پر استعمال کر کے بے حرمتی کا شکار ہوتے ہیں۔ جیسے جناح بوٹ ہاؤس، لنکن باربر شاپ، اقبال ٹی ہاؤس وغیرہ ...

”اور بے بی ...؟“ میں نے دانستہ ہارون کا نام استعمال نہ کیا۔ مجھے ابھی تک نہ بھولا تھا کہ پوتے کا نام رکھنا اداے کا آبائی حق ہے اور شاہدہ کے گھر والوں نے مجھے اس اعزاز سے محروم رکھا تھا۔

”وہ تو بے حد خوش ہے اب ... نہ اسے شاہدہ کی پرواہ ہے نہ میری سکول سے آکر انٹرنیٹ ... پھر ہوم ورک ...“

”اسے اپنا سکول پسند ہے جہاں گھر؟“ حیرانی سے میں نے سوال کیا۔

”پسند؟ ... اسے تو سکول سے عشق ہے عشق ... خود بستہ پیک کرتا ہے، خود تیار ہوتا ہے ... خود سکول بس کے لئے وقت پر چلا جاتا ہے ...“

میں سراسیمگی کے عالم میں سوچتا رہا کہ وہ کیسا سکول ہوگا جس کے لئے ہارون خود تیار ہوتا ہے ... آپنی بس پکڑتا ہے۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شاہدہ کی کال

تھی۔ وہ دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔۔۔ جہانگیر اسے سارے سفر کی تفصیلات بتاتا رہا۔ نہ جانے کیوں اس نے مجھ سے اس کا ذکر نہ کیا۔۔۔ میں اٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا اور جہانگیر کے لئے کافی پھینٹنے میں مشغول ہو گیا۔۔۔

دس بارہ دن میں اسی کوشش میں رہا کہ جہانگیر کو کے ایف سی، میکڈونلڈ، پیزا ہٹ اور چائینز کھانا کھلاؤں۔ میں جہانگیر کو سمجھانا چاہتا تھا کہ اب پاکستان پسماندہ نہیں رہا۔ ہم نے اتنی ترقی ضرور کر لی ہے کہ اپنے شہر میں پیزا ہٹ، تھائی فوڈ، بروسٹ، میکڈونلڈ موجود ہیں۔ جہانگیر گھوم پھر کر غلام نبی سے فرمائش کرتا کہ اسے کڑھی، سرسوں کا ساگ، نہاری، ہریسہ، کنا اور شب دیگ کے ساتھ ساتھ مکئی کی روٹی، پراٹھے اور قیتے والے نان پیش کئے جائیں۔ وہ ایک ہی ہلے میں فرنی کی کئی کئی ٹھوٹھیاں، بازاری قلفیاں، کھیر کھا لیتا۔ کشمیری چائے پر تو اس کی جان نکلتی۔ ہر کھانے کے بعد باورچی خانے میں پہنچ کر لجاجت سے استدعا کرتا۔۔۔ ”ایک پیالی کشمیری چائے مل جائے گی؟ جناب غلام نبی صاحب۔۔۔“ ہم ہپ بیٹا ایک دوسرے سے دور دورہ کر ایک دوسرے میں بس رہے تھے۔ ایک رات جب کشمیری چائے سے اٹھنے والی باداموں کی خوشبو سارے میں پھیلی، جہانگیر نے کہا۔۔۔ ”ابا جی۔۔۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ امریکہ شفٹ ہو جائیں۔“

”ہماری کہ تمہاری“ میں سرد مہری کے پچھلے تجربے میں ابھی غوطہ زن تھا۔

”ایک ہی بات ہے ابا جی۔۔۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہارون اور شاہدہ خوش ہوں گے۔“

”لیکن کیوں۔۔۔؟ کیوں خوش ہوں گے۔“

”میں۔۔۔ وہاں آپ کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔۔۔ پتہ نہیں کیوں جب میں لمبے راستوں پر ڈرائیو کرتا جاتا ہوں تو آپ مجھے ان خالی کمروں میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔۔۔ میں تو آپ کا تصور اماں کے بغیر نہیں کر سکتا۔“

”اور اگر میں انکار کر دوں تو...؟“

کچھ دیر جہانگیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”اس صورت میں ایک ہی بات ہوگی۔۔۔ میں واپس آ جاؤں گا اور یہیں رہوں گا۔۔۔ آپ کے پاس۔۔۔“

”اور تمہاری بیوی اور بے بی۔۔۔۔۔“

کچھ دیر لمبے لمبے سانس بھرتا جہانگیر چائے پیتا رہا۔ پھر کسمسا کر بولا۔ ”وہ تو شاید نہ آسکیں۔ دیکھیں آگے آگے ہارون کی تعلیم کا اصلی مسئلہ ہوگا۔۔۔ ہمارے وطن کی تعلیم سے تو اب کیریئر نہیں بنتا ناں۔۔۔ شاہدہ میں ایک خوبی ہے ابا جی۔ وہ وقت کی ضرورت کے تحت بہت جلد تبدیل ہو جاتی ہے۔۔۔ اسے کچھ چھوڑ کر راستہ بدل کر، غلط یا درست فیصلہ کر کے دیر تک احساس جرم نہیں ہوتا۔ وہ Move Over میں یقین رکھتی ہے۔۔۔ میں بند گٹر کی طرح ہوں۔ ایک بار Choke ہونے لگے تو پھر ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔۔۔“

اس کے بعد ہم میں کوئی بات نہ ہوئی اور ایک ان کہا ”مجھوتہ ہو گیا کہ میں کوٹھی بیچ کر امریکہ سدھاروں گا۔۔۔ جہانگیر کا زیادہ وقت علاقے کے پراپرٹی ڈیلروں کے ساتھ گزرتا، لیکن ملکی حالات، ڈالر کی چڑھتی قیمت اور بھرپور تکیے جارحانہ سی سی رویے کی بدولت قیمتیں گر رہی تھیں۔ دو ایک بار اخباروں میں اشتہار بھی دیئے، لیکن گاہک ان مانے جی سے کوٹھی دیکھ کر یوں لوٹے، جیسے سانولی چھوٹے قد کی غریب لڑکی کا رشتہ دیکھ کر لڑکے والے واپس چلے جایا کرتے ہیں۔ پھر جہانگیر نے کوٹھی کے گیٹ پر فار سیل کا بڑا سا بینر لگا دیا۔ ہم دونوں مل کر گھر کا سامان پیک کرنے لگے۔ پیکنگ کے دوران بھی کچھ وقت باہمی مشورہ کے تحت بسر ہونے لگا۔

”ابا جی آپ کوٹھی کو فرنشڈ حالت میں بیچیں۔ آپ کو اس طرح کسی کباڑیئے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی اور آپ سامان کی سچل سے بھی بچ جائیں گے۔ سامان الگ فروخت نہیں کرنا۔ یہ بہت Hassle ہے۔“

”ایسے ہوستا ہے کہ میں ضرورت کا کچھ سامان گیراج میں رکھ جاؤں۔۔۔“
 ”جب کوٹھی بک گئی ابا جی، تو پھر گیراج میں سامان کون رکھنے دے گا؟ ویسے بھی
 صوفے، قالین، میزیں، الماریاں پرانی وضع کی ہیں۔ ان کا کیا ملے گا بھلا۔“

میں نے کہنا چاہا کہ سامان کے ساتھ استعمال کی وجہ سے یادوں کی ایک برات رہا
 کرتی ہے۔ اس کا کیا کروں گا؟ لیکن چپ رہا۔ جس روز پی آئی اے کے دفتر سے
 جہانگیر ٹکٹس بنا کر واپس لوٹا، شام کافی جا چکی تھی۔ پچھلی لان میں بڑے چھتھارے
 درخت پر میری نگاہ پڑی۔ کوؤں کی ایکٹولی سنبل کے درخت پر کائیں کائیں کرتی
 آکر بیٹھتی، پھر پہلے سے زیادہ شور کرتے، بلبلاتے، واویلا مچاتے سارا گروہ شام کے
 دھندلکے میں اڑ کر غائب ہو جاتا۔ درخت ساکت و صامت ان کی اڑان سے بے
 پرواہ اپنی جگہ اٹل رہتا۔ کوئے نہ جانے کہاں کاروند کر کے ایک بار پھر ہلما کر ڈالیوں
 پر آگرتے۔ شام کا اندھیرا انکی بے قرار کو درخت میں جذب کرنے کی کوشش کرتا۔
 میں اس سٹپٹا ہٹ کو اپنے اندر کی کھلبلی کے ساتھ میچ کر کے دیکھ رہا تھا۔

جہانگیر نے آکر لمبی سانس لی۔ اپنے دونوں پاؤں بوٹوں سمیت سنٹرل ٹیبل پر
 جمائے اور صوفے کی پشت سے سر نکا کر بیٹھ گیا۔

”مال کا کام ہوا ہے سچ تو۔ میرا ایک پرانا دوست پی آئی اے کے آفس میں مل
 گیا۔ وہ اس کوٹھی کو فوراً خریدنا چاہ رہا ہے۔ اور قیمت بھی اچھی مل جائے گی
 کراچی سیفٹ کرنا چاہ رہا ہے۔ آپ کو عارف یاد ہو گا ابا جی۔۔۔ میرے ساتھ
 ساتویں میں پڑھا کرتا تھا۔۔۔ ہم اکٹھے فٹ بال کھیل کرتے تھے۔“
 ”وہ۔۔۔ وہ عارف جس کے چہرے پر ماتا کے دماغ تھے۔۔۔“

”جی بالکل بالکل وہی عارف۔۔۔ کراچی کے حالات ٹھیک نہیں۔۔۔ اس کے ایک
 بھائی کو کسی نے شوٹ کر دیا۔ لوگ دل برداشتہ ہو کر کراچی چھوڑ رہے ہیں۔۔۔ وہ بھی
 سمجھتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ ہمیشہ تجویز کام نہیں آتی۔ کبھی کبھی عجیب طور پر خوش

قسمت آپ کے تعاقب میں وہتی ہے ... اب آپ ساری کشتیاں جلا دیں۔ ابا جی ... آپ سکندر کا نصیب لے کر پیدا ہوئے ہیں ... آپ کا ہر کام بروقت اللہ کی طرف سے ہو جاتا ہے ...“

جہانگیر زندگی کے دریا کو قابل عبور سمجھتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا ... جب کافی رات جا چکی اور نیند کی گولی کھانے کے باوجود مجھے نیند نہ آئی تو میں جہانگیر کے کمرے تک گیا، ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کم ان پلیز کی آواز سن کر میں اندر داخل ہو گیا۔ جہانگیر پلنگ پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند تھی۔
 ”آئیے آئیے ...“ اس نیاٹھنے کی کوشش کی۔
 ”لیٹے رہو ... لیٹے رہو“

میں کچھ دیر سرا سیدہ سا صوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر لمبی خاموشی کو توڑ کر بولا ... ”بات یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا بیٹا ...“
 ”لیکن کیوں ... کیوں ابا جی ...“
 ”تمہاری ماں زندہ ہوتی تو ضرور چلی جاتی بیٹا ... لیکن میں نہیں جاسکتا ...“
 جہانگیر کے چہرے پر پریشانی آگئی۔
 ”لیکن ...“

”بات یہ ہے کہ نروان حاصل کرنے کے لئے تمہیں اکیسویں ہی ٹکنا ہوگا میں نے جہاں تک ممکن تھا، تمہیں راحت میں پالا ... کوشش کی کہ تمہیں کوئی غم کوئی محرومی کوئی تکلیف نہ ہو لیکن ...“

”میں آپ کو یہاں چھوڑ کر وہاں کیسے خوشی کی زندگی بسر کر سکتا ہوں ... میں اتنا Stress کیسے برداشت کروں گا ابا جی ...“

”میں سمجھ گیا ہوں، ہر انسان کے سنے گرم سرد کنھالیوں میں سے گزرنا ضروری ہے۔ میں تم کو صرف راحت کا سبق دینا چاہتا تھا، لیکن غم بھی تو انسان کا استاد مکرم ہے۔“

ہماری روح دکھ کے بغیر بالیدہ نہیں ہو سکتی، اوپر اٹھ نہیں سکتی۔ تم تو مارڈن آدمی ہو، جانتے ہو۔ جب تک راکٹ کے نیچے دھکتی آگ نہیں جلتی، تب تک اس کا خلائی سفر شروع نہیں ہوتا۔۔۔ گھبراؤ نہیں واپس لوٹ جاؤ۔۔۔ نروان حاصل کرنے کے لئے کھل و ستو چھوڑنا پڑتا ہے ش کیا منی۔۔۔ ہجرت بنیادی اصول ہے آگاہی کے لئے۔ وہاں تمہیں اپنا راستہ مل جائے گا۔۔۔ جب تک تم مجھ سے فارغ نہ ہوئے قد آور درخت نہیں بن سکو گے، ہمارے لئے فراق ضروری ہے۔“

”لیکن اتنی تکلیف۔۔۔ اس قدر سوچ کا وزن میں کیسے برداشت کروں گا۔۔۔ اور پھر آپ یہاں کیا کریں گے اکیلے؟“

”جب فطرت اکیلا کر دے تو گھبرانا نہیں چاہئے جہانگیر۔۔۔ یہاں ان کمروں میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا میں بھی اپنے راستے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب مجھے علم ہو گیا ہے کہ مرد اور عورت کا اسلام اپنے جوہر میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ عورت پرورش کے لئے بنی ہے اور مرد کثالت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ پرورش کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے، لیکن جب بیٹا اپنی کثالت کے قابل ہو جاتا ہے تو باپ کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔ پھر باپ کو بیٹے سے دست کش ہو جانا چاہئے۔“

”یہ غلط ہے بھوٹ ہے۔۔۔ میں آپ سے کبھی بھی دست کش نہیں ہو سکتا۔“

”مغور سے سنو بیٹا تم تفکر کرو تو جان جاؤ گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جد الانبیاء کا مسک اور ہے اور بی بی ہاجرہ کسی اور راستے کی مسافر ہیں۔۔۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بت نکال کر پھینک دے۔ اسے سیدھے راستے پر چلنے والے پیغمبر بیٹے، گھوڑے مویشی باغ۔۔۔ کھیتیاں عورتیں سب راستے کا روڑا ہیں۔ نبی کے لئے ان کی رغبت ٹھیک نہیں۔ جب مکان خالی ہو تو مکین خود بخود آجائے گا۔۔۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی قربانی پر رضامند ہو گئے، لیکن عورت کے لئے اور حکم آیا تھا۔ بی بی ہاجرہ پرورش کی ضامن تھیں۔ وہ صفا و مروا کی پہاڑیوں پر دوڑتی رہیں۔ التجائیں

کرتی رہیں، روتی گڑ گڑاتی رہیں حتیٰ کہ دودھ کے ابال کی طرح چشمہ نکالتو بی بی ہاجرہ نے خوفزدہ ہو کر کہا ... زم زم ... رک رک ... پرورش کی ذمہ داری میں سرگرداں وہ بھاگتی رہیں اور آج کوئی عورت صفا و مروا کے مقام پر نہیں بھاگتی۔ بی بی ہاجرہ نے سب عورتوں کے حصے کی سعی کر لی۔ ان کی دعاؤں کے طفیل کل عالم اسلام آب زم زم کی زم زمیاں بھر بھرتے ہیں ... خود بھی اس پانی سے پاک ہوتے ہیں اور دوسروں کا میل بھی کاٹتے ہیں۔ عورت مرتے دم تک بچے کے لئے سرگرداں رہے عین سعادت! باپ بیٹے میں ضم ہو جائے حکم عدولی۔“

”آپ کی بات میں نہیں سنتا ابا جی ... میں ایک لمحہ ایک دن آپ کے پیغمبر نہیں کاٹوں گا۔“

”تمہیں وہاں کوئی تکلیف ہے۔“

”جی نہیں ...“ جہانگیر بولا۔

میں نے اپنی دائرہ میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا ... ”بھائی میرے پھر بات تو سن لو ...“ نول تو ماں بھی کاٹ دیتی ہے ... میں تو پھر صرف باپ ہوں۔“

”آپ جو مرضی کہیں ... آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا، پڑے گا چلنا ... میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا ... نہیں جاؤں گا۔“

”بھلے دی جد الانبیاء کا حکم ہے، بیٹے کے گرد طواف کرنے کے بجائے خانہ کعبہ کے چکر پھیرے کرو۔ اب ان کے آگے تیری بات کیا حیثیت رکھتی ہے ...“

جہانگیر یکدم چپ ہو گیا

”اچھا جی ...“

میں نے دل برداشتہ جہانگیر کے ہاتھ پر ابھرویوں رگوں بھرا اپنا ہاتھ رکھا اور ہستہ سے بولا ... ”زندگی میں سیکھنے کے وہی طریقے ہیں، بیٹا۔ یا تو بڑوں کی بات مان لو اور شاہراہ کو اختیار کر لو یا پھر اپنے تجربوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے پھرتے بند راستوں

میں سے لوٹتے ہوئے نروان حاصل کرو۔۔۔ دیکھ لو پائلی پتر کا شاکیا منی باپ کی عطا کردہ راحتوں میں نہ رہ سکا۔۔۔ تم کو ہجرت کا راستہ اپنانا پڑا۔۔۔ بھیا اب ہم دونوں الگ الگ ہیں۔ آنول کٹ چکی ہے۔۔۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور دیکھو کبھی پلٹ کر نہیں دیکھنا، ورنہ پتھر کے بن جاؤ گے۔“

مجھے چھوڑ کر جہانگیر چلا گیا۔ پھر جہانگیر کی اطلاع کم کم ملتی رہی۔ میرا بن باس اور جہانگیر کا نروان شروع ہو گیا۔ ہم دونوں آگہی کی مختلف منزلوں میں بھٹک رہے تھے۔ خبر آئی اس کے دن مصروف رہتے ہیں۔ جمعے کی ناز وہ اسلامک سنٹر میں پڑھتا ہے۔ دن پر دن اسلام کی طرف راغب ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بھی سنا کہ شاہدہ کو اسی بات کا خوف تھا کہ کہیں ایک دن بیٹھے بٹھائے جہانگیر حجاب پہنانے پر اصرار نہ کریں گے۔ امریکہ جیسے ملک میں اسے ہر قسم کی آزادی تھی، روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ لیکن یہ فکر اسے اندر ہی اندر پریشان رکھتی۔۔۔ شاہدہ کو اسلام کی ساری باتیں پسند تھیں، لیکن وہ تعدا اوزدواج اور حجاب سے اس درجہ خوفزدہ تھی کہ اسے جہانگیر بھی بنیاد پرست نظر آتا، شاہدہ کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ وہ جب سسرال میں تھی تو یہاں ہم دونوں تھے جن سے جہانگیر محبت کرتا تھا۔ اپنے کارخانے دار باپ کے گھر چلی گئی تو وہاں جہانگیر کی غیرت تھی جو اسے پرہیزگار رکھتی تھی۔ اب امریکہ میں اسے بنیاد پرستی سے خوف آنے لگا تھا۔ نہ جانے یہ خوف اس کے اندر کب سے اور کیوں تھا۔ ہر جنت کو یہی خوف کا کیرا کھاجاتا ہے۔ شاہدہ تبدیلی کی خواہش مند ہوتے ہوئے بھی اس سے سمجھوتہ نہ کر سکتی۔ تعدا اوزدواج اور حجاب کا اسے ذاتی طور پر کوئی تجربہ نہ تھا، لیکن وہ اس سے ایسے خوفزدہ تھی جیسے ایڈز کی بیماری ہو اور اسے یہ بیماری لگنا ہی لگنا ہو۔ اس کی ساری آزادی کو اس خوف نے غلامی میں بدل دیا تھا۔

ہیلکونی میں بیٹھا میں سوچتا ہوں کہ امریکہ کا سب سے بڑا تضاد بیک وقت محبت کی طلب اور آزادی کی خواہش ہے۔۔۔ اور اب ٹھونک بجا کر امریکی فرد نے یہ فیصلہ

کر لیا ہے کہ محبت کا بندھن کبھی کبھی اور آزادی کی آب و ہوا ہمیشہ مٹنی چاہئے۔ آزادی کی یہ خواہش امریکہ کے معاشرے میں ایک بے اطمینانی پیدا کر رہی ہے۔ انسان چونکہ تضاد سے بنا ہے، آگ اور پانی کے سنا جوگ کی وجہ سے تضاد اور دوئی کی خوب اس میں ہمیشہ رہتی ہے۔ وہ آگ کی طرح بھڑکتا، لپکتا اور گرم کرتا ہے اور ساتھ ساتھ مثل پانی بجھاتا، بجھتا، بہتا اور سرد بھی کرتا ہے۔ اس کی خوبی اس کی خرابی میں بدل جاتی ہے اور اس کی خرابی ہی اسے خوبی کا راستہ سمجھاتی ہے۔ اسی لئے یہاں ایک لمحہ فکر یہ بھی سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کسی انسان پر تنقید کہاں تک جائز ہے۔ جس چور کو ہم سزا دلانے لے جا رہے ہوں، شاید وہی قطب بن کر ہماری اور اپنی عاقبت سنوار دے۔ گو خرابی سے خوبی کا سفر یقینی نہیں، لیکن امکانات ضرور ہیں۔ اسی امکان میں اس کی خود مختاری پنہاں ہے۔۔۔۔۔ اسی امکان میں اس کے سارے امکانات پوشیدہ ہیں۔ زندگی کے سفر میں ساری رنگینی، تڑپ اور اسرار اسی بنیادی دوئی میں اس کے اندیشوں میں چھپے ہیں۔ خوبی اور خرابی، جنگ و امن، حق و باطل خوشی و غم تو ام ہیں، زوج ہیں، خوبی کب خرابی میں بدل جاتی ہے۔ نیکی کو کب اور کیسے بدی کا چولا پہن لینا پڑتا ہے۔ غم کن حالات میں خوشی کو راہ دیتا ہے اور حق کی جنگ کب باطل میں بدلتی ہے۔ زندگی کا سارا سفر اسی اول بدل کے سہارے گزرتا ہے۔

ہیلکونی میں بیٹھ کر سوچتا ہوں۔ اقلیتوں کے مسئلے ترقی کی دوڑ اور اس سے وابستہ مسائل نے محبت کے عیسائی فلسفے پر سب سے کاری ضرب لگانی ہے۔ Free Will کی آزادی طاقت و ر لوگوں کا مسلک ہے۔ مرضی اور اختیاری ارادہ انسان کو جہاں ترقی کا سبق پڑھاتا ہے۔ وہیں محبت سے آزادی حاصل کر کے انسان پر اعتماد ہو کر نفرت کرنے کو بھی اپنے بنیادی حقوق میں شامل کر لیتا ہے۔ جب تک حرت مسیح کا کٹ سکے چلتا تھا، کسی سے نفرت کرنے کے بعد لوگ احساس جرم میں مبتلا رہتے تھے۔ پادریوں کے آگے دستہ بستہ Confessions کر کے اپنے آپ کو پاک

کرتے رہتے تھے، لیکن اب محبت کی صلیب سے اتر کر اپنی مرضی کو کسی کی خاطر قربان کرنا آج کے سفید فام معاشرے کا شیوہ نہیں۔ ایسے عمل سے آزادی تلف ہوتی ہے اور محبت اور آزادی میں بنیادی تضاد ہونے کی وجہ سے امریکہ کے معاشرے نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے اور محبت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

آزادی اکیلے آدمی کا سفر ہے۔ رسی تڑوا کر سرپٹ بھاگنے کا عمل ہے۔ محبت ہاتھ باندھ کر اپنی خوشی اور اپنی آزادی کے پھول ارپن کر کے سر نے ہووڑائے اشکبار آنکھوں سے Free Will کو ارادی طور پر ساقط کرنے کا نام ہے۔ محبت اس غلامی کا طوق ہے جو انسان خود اپنے اختیار سے گلے میں ڈالتا ہے۔ یہ عہد پیری مریدی کا نہیں کہ مرشد منوانے اور سالک ماننے کے مقام پر ہو۔ یہ زمانہ شادی کا بھی نہیں کہ شادی میں بھی قدم قدم پر اپنی مرضی کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس طرح اپنے بیٹے کو قربان کرنے پر راضی برضا رہے، یہ محبت کی ایک عظیم مثال ہے۔ محبت میں ذاتی آزادی کو طلب کرنا شرک ہے، کیونکہ بیک وقت دو افراد سے محبت نہیں کی جاسکتی، محبوب سے بھی اور اپنی ذات سے بھی۔ محبت غلامی کا عمل ہے اور آزاد لوگ غلام نہیں رہ سکتے۔

میں نے یہدیکھا ہے کہ زیادہ محبت کرنیوالے عموماً اظہار محبت میں کوڑھ مغز ہوتے ہیں۔ وہ پھول اور چوکلیٹ لے کر محبوب کے دروازے پر حاضری دینا بھول جاتے ہیں۔ عام طور پر وہ دربان سے لیکر محبوب تک اپنی ذات کا گلہ ستہ ہی پیش کرتے رہتے ہیں۔ سٹ پٹا جانا، چپ لگنا، ہاتھ پاؤں پھول جانا، بغیر جواز پیش کئے چپ چاپ ٹوٹ جانا، محبت کرنے والوں کا وطیرہ ہوا کرتا ہے۔ آزادی پسند لوگ پوجا کرنے، آرتی اتارنے، مالا چھنے سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ آپ نے امریکہ کی پارکوں، بازاروں، ایئر پورٹوں، بسوں، ہوٹلوں میں ایسے جوڑے دیکھے ہوں گے، جن کے ہاتھ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو پاتے، جن کے بدن بیلوں کی طرح ایک

دوسرے سے لپٹے جاتے ہیں۔ اس محبت میں ایسے درجے کا اعلان ہے جس کی توفیق آزاد عاشق کو کم کم ملتی ہے۔ یہ محبت کسی آئینے میں اپنی صورت دیکھتے رہنے کی ہوس ہے۔ عاشق محبوب کے آئینے میں اپنی ہی ذات پر مفتون رہتا ہے۔ امریکہ میں جہاں ہر شے چمکائی ستھرائی سجائی اور آئیڈیل بنائی جاتی ہے جہاں اپنے Product کو بہتر بنانے کا جنون ہے۔ یہاں محبت ایسے Perfectionist ہاتھوں سے بڑے عذاب جھیلیتی ہے۔ یہاں آزادی پسند عاشق پہلے محبوبہ تلاش کرتا ہے۔ پھر اسے کبھی خور و دین لگا کر کبھی دور بین کی مدد سے بغور دیکھتا ہے۔ محبت کی اولین سرشاری میں ہی محبوب کی سرجری شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی عادتیں، کردار، عقل شکل، ماضی کی مناسبتیں، مشغلے سب کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ نفرت کرنے پر قور آزاد انسان نکتہ چین بن جاتا ہے۔ اب عاشق اور محبوب دونوں سچ کی بے نیام تلوار لے کر باہر نکلتے ہیں اور جو نہی عاشق کی آنکھوں سے عقیدت و احترام کی عینک اترتی ہے، اسے محبوب کچھ ایسی تیس مار خاں نظر نہیں آتی۔ یہاں سے محبت کا سفر خاردار جھایوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ آزادی کے طالب علم کے لئے زیادہ دیر زنجیر پارہنا ممکن نہیں رہتا پھر اپنی بغل سے اپنا ہی بت نکال کر وہ از سر نو اس کی پوجا شروع کر دیتا ہے اور اسی لئے غیر کی محبت کا رہین نہیں رہتا۔ مغربی معاشرے کا یہی المیہ ہے۔۔۔ کہ یہاں محبوب کا ”ٹھا ٹھیک“ ٹھیک نہیں ہوا کرتا۔ تھوڑی دیر کے لئے تو آزاد عاشق چاکری پر رضامند رہ سکتا ہے۔ لیکن مستقل طور پر عموماً امریکی فرد کا یہ شعار نہیں۔

محبت نہ تو اپنی ذات کی نمائش ہے، نہ من و تو کی تفریق ہے۔ امریکہ کے آزاد معاشرے کے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کو اپنی ملازمت پسند نہیں تو فوراً بدل لیں۔ موسم راس نہیں آتا تو کسی ایسی ریاست میں بسیرا کریں جہاں مہوسم آپ کی طبیعت کے مطابق ہو، اگر بیوی نا پسند ہے تو معاشرے کے دباؤ بچوں کی خاطر اسے لٹکائے نہ پھریں۔ جب بھی کوئی موسم حالت، جگہ انسان آپ کی شخصیت سے ٹکرائے، اسے فوراً

راستے سے الگ کر دیں اور محبت کا جوا اتار کر آزادی کا لٹکوا اڑائیں۔

مغربی معاشرے نے غالباً انسان کے اس بنیادی تضاد کو بھلا دیا ہے کہ وہ مجبور بھی ہے اور باختیار بھی۔ محبت اور آزادی کے تضاد میں عموماً آزادی ہی جیت جایا کرتی ہے۔۔۔ جہاں تک ایک پاؤں اٹھانے کا تعلق ہے ہم باختیار ہیں، لیکن دوسرا پاؤں اٹھانے پر قادر نہیں۔ آزادی ہمیشہ پابندی سے مشروط رہے گی، اگر انسان تمام پابندیاں توڑ کر ساری اقدار سے مادر پدر آزادی حاصل کر کے زندہ رہنا چاہے تو اسے یا تو کسی پہاڑ کی چوٹی پر رہنا پڑے گا یا جیل کی کوٹھڑی میں۔ میں بھی آزادی کی تلاش میں ارجمند کے گھر آیا تھا۔ یہاں پر ایسی محبت حاصل ہوگی جس کا کئی برسوں سے میں عادی نہ رہا تھا۔ یہاں مجھے نہ آزادی کا احساس ہوا نہ محبت کا۔ ڈاکٹر بلال کا اپنا دائرہ کار ہے، ارجمند اپنی مصروفیت میں گم رہتی ہے۔ قیصر اور جمشید کے ساتھ پتہ نہیں کیوں میری اچھی Equation نہ بن سکی۔ وہ دونوں بھی اپنی روٹین کے تابع ہیں۔ چھوٹے چھوٹے میرے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے ابھی سے کمپیوٹر کے ارد گرد رہتے ہیں۔ کارٹون دیکھتے رہنا ان کی ہابی ہے۔ وہ برگر، چیس، کوکا کولا، جوس، چوکیٹ کے رسیا ہیں۔ جب جی چاہتا ہے فریج کھول کر کچھ نہ کچھ نکالتے اور کھانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے معاملات میں ابھی سے آزاد ہیں، انہیں نہ کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہے، نہ انفورم کرنے کی۔ اس طرح ارجمند پر ان کی پرورش کا بوجھ کم ہوتا ہے۔ لا تعلقی بڑھتی تھی تو یہ بھی اس کی ضرورت تھی، کیونکہ ایسے میں اسے آزادی بھی زیادہ ملتی، لیکن محبت کئے بغیر کسی دوسرے انسان کو نہ کوئی جان سستا ہے، نہ جان دے سستا ہے۔ ریستورانوں، کلبوں میں، تفریحی پروگراموں میں ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے۔ Infatuation کا روگ لگ سکتا ہے، محبت ممکن نہیں۔ سب سے زیادہ وہ بچے پر وقت ضائع کرتی ہے، لیکن یہ وقت ضائع ہو کر ایک ایسی نعمت میں بدل جاتا ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ مغربی لوگوں نے کام کے حق میں ووٹ دے کر مشرقی

لوگوں کی اس فلاح کو کھودیا ہے، جہاں وقت کو ضائع کر کے ہی محبت ملا کرتی ہے۔
Support System بامعنی ہوتا ہے۔ رشتہ داریاں چلتی ہیں۔ پیری مریدی
کا سلسلہ قائم ہوتا ہے اور ضائع وقت سونے میں بدل جاتا ہے۔

اس اینٹی محبت کا معاشرہ قائم کرنے میں اقصیت نے بنیادی کام کیا ہے۔ سفید فام
واضح طور پر اینٹی محبت پر عمل کرتے ہیں۔ چونکہ مغربی لوگ محبت کو جزو ایمان نہیں
سمجھتے، اس لئے انہوں نے احساس جرم تلے خیراتی ادارے کھولے ہیں۔ ویل فینر
سٹیٹ بنا کر بے روزگار، پس ماندہ لوگوں کی مدد کی ہے۔ بوڑھے لوگوں کے ادارے
بنائے ہیں۔ جہاں بڑھے موت کے انتظار میں درست دوائیاں، طاقت افزا، وٹامن،
خوراک، آرام حتیٰ کہ تفریح بھی باقاعدگی سے کرتے ہیں، لیکن ان بڑھوں سے محبت
کو سوس دور رہتی ہے۔ وہ Volunteers اور وقت بے وقت آنے والے مہمانوں
کو انتظار میں خالی دن خالی راتیں بسر کرتے ہیں۔ Baby Care Day
Care سنٹر کے پاس بچہ چھوڑا بھی جاسکتا ہے اور پل بھی جاتا ہے، لیکن نہ اسے ماں
کا دودھ ملتا ہے، نہ ماں کی محبت کا شہد آگیں اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ اپنے
اپنے کاموں کے بعد ساتھی پر کام کی تھکن، اضطراب اور ڈپریشن نکالنے کا نام شخصی
آزادی ہے۔ کام کے بعد دونوں ساتھی خیس خیس کر کے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔
کوئی بھی تازہ دم کرنے والی محبت پر وقت اور توجہ صرف کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ گھر
پر بھی کاموں کی زیادتی منہ کھولے دونوں کو ہڑپ کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے، ہو
سکتا ہے کہ اس اینٹی محبت کا الزام ہم صنعتی انقلاب پر دھریں اور ترقی کی خاطر ان
قربانیوں کو درست جانیں جو آج کا ماڈرن تعلیم یافتہ آدمی دے رہا ہے۔ مشکل یہ ہے
کہ جب محبت حاصل نہیں ہوتی تو آدمی کھاتا ہے، لیکن سیر نہیں ہوتا۔ مکان قسطوں پر
حاصل کر لیتا ہے، لیکن وقت کی کمی کے باعث مکینوں سے بچھڑ جاتا ہے۔ محبت کی تلاش
چھوڑ کر جنس کا شیراڈانس میں تھرکتا ہے، لیکن روح پیاسی رہتی ہے، بازاروں کے

طواف کر کے زیبائش، آرائش، نمائش کی اشیا خریدتا رہتا ہے، لیکن ان اشیاء کی قسطیں گننے کے بعد انہیں انجوائے نہیں کر سکتا، کیونکہ وقت اور محبت کی قلت اسے نہ تو کسی چیز سے، نہ ہی کسی انسان سے رابطہ قائم کرنے دیتی ہے اور نہ ہی اس کی کے متعلق سوچنے کی مہلت فراہم کرتی ہے۔

ایٹنی محبت معاشرہ قائم کرنے میں اقلیتوں سے نفرت نبیہواہم کام کیا ہے۔ کالے، براؤن، چھٹی ناک والوں سے چونکہ محبت نہیں کی جاسکتی اس لئے ان کو آزادی دے کر اور خود ان سے گلو خلاصی کرنے کے لئے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔ مشرق معاشرے میں ابھی لوگ محبت کے پیا سے ہیں اور پریم جل کے بغیر ان کی پیاس نہیں بجھتی۔ رشتے ناٹے ابھی جذیوں میں گندھے ہیں یا وقت کو سونا بناتے ہیں۔ ہم پچھڑے لوگوں کی یادوں کو مختلف موسموں میں از سر نو تلاش کرنے میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ نغمہ، چاندنی اور چہرہ ابھی بے ربط نہیں ہوئے۔ مغرب اور مشرق اسی لئے کبھی مل نہیں سکے کہ ہماری سوچ مختلف ہے۔ امریکہ خاص طور پر اور سفید فام مغربی معاشرہ عام طور پر محبت سے پچھڑ چکا ہے۔ سفید فام لوگوں نے جان لیا ہے کہ محبت کا سفر دراصل صحرائی لوگوں کو اس آسنا ہے اسی لئے انہوں نے فرد کے لئے آزادی کا دریچہ کھول کر اسے پہنائیوں میں تنہا اڑنے کی دعوت دی ہے، بلکہ اسے تنہائی پر اکسایا اور ترغیب دلائی ہے۔ ایسے معاشرے میں انسان راضی برضا نہیں رہ سکتا، نہ مزاج یار کے تابع رہ کر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ مشرق کے سفر میں نفس کو ساقط کر کے نروان تک پہنچا جاسکتا ہے۔ مغرب میں شخص کے ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں ہار منہ میں گلوری دبا کر حواس خمسہ کی گاڑی میں بیٹھ کر لذت کا سفر کیا جاتا ہے۔ محبت کا سفر محبت کی خاطر ہو یا اللہ کے لئے اختیار کیا جائے تو اس میں آنسو، صبر اور ایشا رہی ایشا کا موسم رہتا ہے۔ یہاں شاید خوشی نہیں ملتی، لیکن شانتی اور قناعت ضرور ہر کاب رہتی ہے۔ حدود سے نکلنے کی آرزو نہیں رہتی۔ محبت کی سرشاری میں انسان حاکم نہیں محکوم

ہوتا ہے۔ دوسروں پر ضرب کاری لگانا اور ان سے آگے نکل جانا ممنوع ٹھہرتا ہے۔ آزادی کی اہمیت دوسروں سے آگے اڑنے کو اپنا طرہ امتیاز بناتی ہے۔ مسابقت کی فضاء سے اس آتی ہے، آزادی کا منطقی تقاضا ہے کہ وہ کسی ایمان، چاہت یا فعل کی نفی کرتے ہوئے احساس جرم میں مبتلا نہ ہو۔ جہاں محبت ذات کی نفی میں لگی رہتی ہے، وہاں آزادی کا مرکزی Spindle ہی ٹھہرا یا Self ہے۔ اسی کے گرد زندگی کے سارے محرکات چکر لگاتے ہیں۔

جس گزبو کا میں بار بار آپ سے ذکر کرتا ہوں، وہ دراصل لکڑی کا بنا ہوا ایک کنڈ ہے جس کا اندر لکڑی کی بنچیں ہیں۔ ایک جانب سے رستہ کھتا ہے اور اس کی چھت چوٹی ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔ اس کنڈ کی کوئی دیوار نہیں۔ یہ لکڑی کے ڈنڈوں کے سہارے کھڑا ہے اسی لئے ہر موسم میں یہ ہوا دار رہتا ہے۔ ہوائیں، بارشیں، منظر آسانی سے نظر آتے ہیں۔ اس گزبو کے نشیب میں امریکہ کا ایک گنجان جنگل ہے جس میں اونچے اونچے درخت ہری بھری جھاڑیاں، درختوں سیلپی بیلیں، سرسبز گھاس، پرندے، بے ضرر جانور آزاد پھرتے ہیں۔ آسمان کی جانب منہ کر کے دیکھیں تو کبھی کبھی سو پر سونک جہاز دھوئیں کی لمبی دم چھوڑتے بھی نظر آئیں گے، تھوڑی دیر کے لئے ذہن سائنسی ترقی پر حیران ہوتا رہتا ہے۔ اس کی برکات گنتے میں مشغول رہتا ہے، لیکن پھر قدرتی مناظر اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

پکی سڑک سے اتر کر میں اس ٹاور نما جھونپڑے میں داخل ہوتا ہوں۔ بنچیں بالکل صاف ہیں۔ دھول نما کوئی چیز نہیں۔ یہاں نیلگوں آسمان پر، پتوں کی چھنی جلد پر، سڑکوں پر مٹی نہیں ہوتی۔ مجھے لاہور کی آمدھیاں یاد آ جاتی ہیں جو مٹی کے مہینے میں ہر جگہ سے مٹی اٹھا کر لاتی ہیں۔ صبح اٹھیں تو فرشوں پر چیزوں پر مٹی کی ہلکی سی تہہ پڑی نظر آتی ہے۔ اس شفاف ماحول میں نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ کہیں سے مٹی کا گولا اڑتا آیا و گزبو کی بنچوں پر استانے کے لئے رک جائے۔ میں گولے سے

پوچھوں۔۔۔ ”یہاں کہاں بھئی، وطن سے کیوں ہجڑے؟“

وہ جواب دے ”امریکہ میں رکنے والی بجلی اور گرجنے والے طوفان سے ملنے آیا ہوں۔ سنا ہے جب یہاں سردیوں میں بجلی پورے گھن گرج سے چمکتی ہے تو چڑیا گھر کے شیر بھی بدک جاتے ہیں۔“

میں کہوں ”پر تیرا یہاں کیا کام۔۔۔ گھر چل وہاں جھاڑو بہارو پھیرنے والیوں تجھے یاد کرتی ہیں۔“

وہ بزبوں میں منہ چھپا کر کہے۔۔۔ ”اے بڑھے تجھ سے کس نے کہا یہاں مجھے یاد کرنیوالے نہیں ہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہاں بھی ایسے لوگ بستے ہیں جو اپنے شہر کی گلیاں، گلیوں میں بیٹھی مٹی، تانگوں کے نب اڑا دینے والی آندھیوں کو یاد کرتے ہیں۔“

ابھی آندھی کا بگولہ یہاں سے رخصت ہو کر تین منزلہ کوئٹہ کے پیچھے چھپا ہی تھا کہ لمبی روبینہ آگئی۔ اس عورت سے کبھی کبھی میری ملاقات اسی گزبوں میں ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک واکر میں تین سالہ بچی ہے۔ یہ بچی شکل و صورت میں لبنان سے امپورٹ کی ہوئی لگتی ہے، جبکہ روبینہ کا حسن سندھی لڑکیوں جیسا ہے۔ ستواں ناک، تراشیدہ ہونٹ، کتابی چہرہ۔۔۔ روبینہ مجھے سلام کرنے کے بعد بچی کو واکر سے آزاد کر دیتی ہے۔ میں بچی کا نام بھول چکا ہوں۔ مجھے تو روبینہ کا نام بھی یاد نہیں۔ شاید اصل نام کچھ اور ہی ہو، لیکن وہ مجھے سلام کرنے کے بعد بچہ پر میرے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔

”کیا حال ہے تمہینہ۔۔۔“ میں کہتا ہوں

”ٹھیک ہے۔۔۔ میرا نام روبینہ ہے جی۔“

”ہاں بھئی اب نام یاد نہیں رہتے“ میں شرمندہ سا ہو کر کہتا ہوں۔ کیا بتاؤں یادیں

مجھ سے کیسی آنکھ مچولی کھیلتی ہیں؟

”کوئی بات نہیں جی۔۔۔ میں ڈاکٹر حسن کی بیوی ہوں۔“

مجھ پر حسن نامی ڈاکٹر کی کوئی حالیہ یاد نہیں ابھرتی ... حال مجھ سے کچھڑ چکا۔ میرے بڑھے نیوران حالیہ یادوں کو محفوظ نہیں کر سکتے۔ میں پچھلی یادوں کی مچھلیاں پکڑنے میں دن گزارتا ہوں اور مستقبل میں میرے لئے صرف فنا ہے جس کے لئے میں تیار نہیں ہو پاتا۔

”ہم جی ... میں نے پچھلی بار آپ کو بتایا تھا کہ ہم لوگ دس سال سے یہاں ہیں۔“

مجھ پر کوئی پچھلی بار منکشف نہیں ہوتی، لیکن میں ہاں ہوں کرتا ہوں۔

”بات یہ ہے چاچا جی ... کہ دس سال سے یہاں رہنے کے بعد بھی یہاں کی سوسائٹی میں دل نہیں لگا۔ حسن تو چاہتے ہیں کہ واپس چلے جائیں، لیکن بچے رضامند نہیں ہوتے۔“

میں گھٹکھریا لے بالوں والی گوری چٹی بچی کو گراس ہو پر پکڑتے دیکھتا ہوں۔ مجھ پر اس کے دوسرے بچوں کی عمر، شکل قد کوئی بھی چیز واضح نہیں۔

”جب ہم یہاں آئے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ یہ جلا وطنی چند سال کی ہے، لیکن پھر یہاں کی زندگی دلدل بن گئی۔ روزی مانے آئے تھے۔ اب یہاں کے ہی ہو رہے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں سکتا ... کیا کریں چاچا جی۔ وطن بھوڑا نہیں اور تن آسانی واپس نہیں جانے دیتی۔“

”سمجھ کے کیا لینا ہے بی بی ... ہجرت بھی ایک سنت ہے۔ آپ اس پر عمل کر رہی ہیں خیر ہے!“

”اب تو یہی بات حسن بھی کہتے ہیں ... لیکن جی ہم تو دین کی خاطر نہیں آئے پھر یہ ... ویسی ہجرت تو نہ وہی ناں نبی ﷺ والی ...“

”ایسی ویسی نہ سوچو ... ہجرت بھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق کی جاتی ہے تم روزی کی خاطر آئی بیٹھی ہو یہی بہت کافی ہے ... یہاں رہو اچھا کھاؤ، اچھا پہنو، اچھا

معیار زندگی اپناؤ، بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤ باقی سب بھول جاؤ..... بس یہ سمجھو اصلی ہجرت نہ یہی اس کا سایہ پکڑ لیا۔“

تعلیم سے مجھے یاد آیا کہ یہاں کی رپورٹوں کے مطابق امریکہ میں ہر دس سیکنڈ کے بعد ایک بچہ سکول چھوڑ دیتا ہے۔ چھٹی جماعت میں پڑھنے والے بیس فیصد بچوں کو یہ بھی علم نہیں کہ دنیا کے نقشے پر امریکہ کہاں ہے۔ ہر سال قریباً سات لاکھ طالب علم پڑھے لکھے جاہل بن کر گریجویٹ کہلاتے ہیں۔

امریکہ میں پبلک سکول کی تعلیم روز افزوں تنزلی کی طرف مائل ہے۔ اس کا کچھ کیا جانا چاہئے، لیکن میں روبینہ کے ساتھ گفتگو کو دو ہزار یہ کی اس رپورٹ کے مطابق بتانا نہیں چاہتا۔ شاید میری باتیں سن کر وہ اور بھی الجھ جائے۔

”حسن کا زیادہ وقت تو مسجد میں گزرتا ہے۔ وہ اسلامک سنٹر کے پر جوش رکن ہیں“ روبینہ کہتی ہے۔

”آپ امریکن سوسائٹی میں مدغم نہیں ہو پائے؟“ میں پوچھتا ہوں۔

وہ تھوڑی دیر اپنے بائیں ہاتھ کے ناخنوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر کچھ اکھڑے سے لہجے میں کہتی ہے۔

”چاچا جی عجیب سی مشکل ہے، لیکن آپ سے کیا پردہ ... جب ہم پاکستان میں تھے تو ہم دونوں کچھ ایسے کپے مسلمان نہیں تھے۔ میں نے کبھی سر پر دوپٹہ نہیں لیا تھا۔ حسن صرف عیدوں پر نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے، لیکن یہاں آکر ہم نے دیکھا کہ یہاں کا بہاؤ تیز ہے۔ اگر ہم نے اپنی شناخت قائم نہ رکھی تو ہم بہہ جائیں گے، اکثریت کے ساتھ۔ ان دم چھلا بن کر۔“

”وہ تو ہے ... اکثریت چیز ہی ایسی ہے ... اس کے فطرتی بہاؤ کے کیا کہنے؟“

”یہاں چاچا جی صرف وہ مسلمان امریکنوں سے میل جول رکھ سکتے ہیں جنہیں نہ تو یہ فکر ہو کہ ذبیحہ گوشت کوئی چیز ہوتی ہے، نہ انہیں شراب پر کوئی اعتراض ہو، نہ ہی مرد

اور عورت کے باہمی زادانہ میل جول پر ہی برامانیں۔۔۔ اگر ان تین چیزوں کا کچھ بھی خیال ہے تو رابطے بن نہیں سکتے۔۔۔ جیسے برصغیر میں ہندو مسلمان صدیوں ساتھ رہے، لیکن ٹل ٹل نہ سکے۔“

”آخر ڈاکٹر حسن ہسپتال میں تو امریکنوں سے ملتے ہی ہوں گے۔ ان کا تو روز کا ساتھ ہے ان لوگوں کے ساتھ۔۔۔“

”حسن بڑے شفیق ڈاکٹر ہیں۔۔۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں Pediatrician ہیں، کیں ان پر بڑا اعتماد کرتی ہیں۔ بچوں سے حسن کا ویسے بھی رویہ بہت نرم ہے، لیکن وہ میل جول کو بڑھنے نہیں دیتے۔۔۔ ان کا خیال ہے کہ اگر آنا جانا بڑھ گیا تو پھر ہم امریکن طرز سوچ کو روک نہیں سکتے۔ حسن کو تو اصرار ہے کہ بچے گھر پر اردو بولیں، لیکن وہ بے وقوف آسان راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم اردو میں بات کرتے ہیں، وہ انگریزی میں جواب دیتے رہتے ہیں۔ باتیں ساری سمجھ لیتے ہیں، لیکن اردو کو استعمال نہیں لاتے۔۔۔“

”ہاں یہ مشکل تو ہے۔۔۔ یہاں کے بچوں کی۔“

”مشکل نہیں چا چا جی۔۔۔ بڑی مشکل ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے میرا بیٹا عارف میڈیکل میں داخل ہو گیا ہے۔ بڑی بیٹی ڈنٹسٹ بن رہی ہے۔۔۔ اب ان سے تو یہ امید بیکار ہے کہ وہ اردو پر توجہ دیں۔ یہ میری سارا بھی کچھ مہینوں میں مونٹی سوری میں چلی جائے گی۔۔۔ پھر یہ بھی فر فر انگریزی بولے گی۔ اردو تو گئی ناں ہاتھوں سے، پنجابی تو دور کی بات ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں شمینہ۔۔۔“ میں نے غلط نام سے اسے پکارا۔

”نہیں چا چا جی آپ سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔“ آپ ہمارے بڑے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل چھوٹوں کا زمانہ ہے۔ آپ کی مان کر بھی ہم وہی کچھ کریں گے جو چھوٹے کہتے ہیں۔ اس دور میں بڑوں کی مان کر بڑے پتھر پلے راستے پر چلنا

پڑتا ہے۔“

”آپ واپس نہیں جاسکتے.....“

”تین سال پہلے گئے تھے جی۔ حسن نے وہاں سیٹل ہونے کی کوشش بھی کی تھی ... پروہاں کے لوگوں نے ہمیں اپنایا نہیں۔ کچھ راستے بدل گئے ... چاچا جی ہم لوگ اس بات پر کلیئر نہیں ہیں کہ ہمیں دراصل کیا چاہیے مغرب یا مشرق ... دین یا دنیا ... ترقی یا فلاح ... جب ہم نے پاکستان بنایا تو قدامتِ اعظم پر تو یہ بات واضح تھی کہ ہم الگ ملک میں کیوں رہیں گے، لیکن ہم پر ابھی تک یہ بات نہیں کھلی کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ کیا ہمیں دنیا درکار ہے کہ آخرت؟ پتہ ہے ہم اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟ ہمارے بڑوں نے میں بتایا نہیں۔“

”میں نے بھی کبھی سوچا نہیں بیٹی.....“

”جو آدمی کسی فیصلے پر پہن جاتا ہے وہ مضطوب نہیں رہتا ... جو سوچ کر بار بار اسے دوہراتا رہتا ہے، وہ الجھنوں کو دعوت دیئے جاتا ہے ... ہم ساری اقلیتیں جو امریکہ میں رہتی ہیں، بار بار فیصلوں پر نظر ثانی کرتی ہیں، اسی لئے ہمارے مسائل ختم ہی نہیں ہوتے، نظر ثانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔“

اس وقت اترائی کی جانب سے خوبصورت ساسفید خرگوش جھاڑیوں سے نکل آیا اور چپ گڑپ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ننھی سارا نے یکدم ماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے خرگوش کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔

”یہ اقلیت بھی عجیب چیز ہوتی ہے چاچا جی ... ٹھہر جا ... ٹھہر سارا ... گھسیٹنا میں چلتی ہوں..... بابا چلتی ہوں.....“

اپنے ہی بچے کے اصرار پر روبینہ کھج گئی۔

”کیا عذاب ہیں یہ بچے بھی۔ اچھا کرتی ہیں یہ امریکن عورتیں بچہ ڈے کینز میں

... خود آزا دہم کو تو رو اتیں، رسم و رواج لے ڈوبے ... شٹ۔“

وہ بچی کے اصرار پر جنگل میں اتر گئی۔ اس کے اترنے کے چند لمحے بعد خرگوش کہیں غائب ہو گیا۔ میں نے کچھ لمحے اس کا انتظار کیا۔ پھر سڑک پر لوٹ آیا۔ وہ درختوں کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ بارش کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور میں اپنی چھتری گھر بھول آیا تھا۔ لیکن جھونپی میں سڑک تک آیا رو بینہ اپنی بچی کی انگلی تھامے سامنے سے آتی دکھائی دی۔ بارش سے پہلے ہوا ذرات تیز رفتاری سے چل رہی تھی، رو بینہ نے ہوا میں ہاتھ ہرا کر مجھے اللہ حافظ کہا، لیکن میں رک گیا۔

”میں پہلی بار نیچے گئی تھی، چا چاجی مجھے تو بڑا خوف آیا۔“ وہ قریب آ کر بولی۔

”تم مجھے کہہ دیتیں۔ میں تمہارے ساتھ چلا چلتا۔“

ہم دونوں ایک بار پھر گیزبو کی طرف چلنے لگے جہاں چھوٹی سارا کی پش چیز پڑی تھی۔

”چا چاجی پردیس میں خوف کیوں آیا ہے؟“

میں نے دماغ پر زور دے کر سوچا۔ بھلا پردیس میں کیوں خوف آتا ہے؟ ... کیا اپنے وطن میں خوف بھی حفاظت میں لپٹا ہوتا ہے۔

”نئی چیز، جگہ، واقعہ اس لئے خوف کا باعث ہوتے ہیں کہ انسان جس چیز کو نہیں جانتا جس سے اس کی واقفیت نہیں ہوتی، وہ خوف کا باعث بنتی ہے۔“

”کئی بار بہت واقفیت کے باوجود خوف کم نہیں ہوتا۔ چا چاجی سارا بکھیرا اقلیت ہونے کا ہے۔ ہم جانتے ہیں اگر کہیں غلطی سے شے میں ناواقف کے باعث ہم پھنس گئے تو پھر ہمارے بچنا نہیں ... حسن تو بالکل اپنے دادے کی طرح ہوتے جا رہے ہیں چا چاجی۔۔۔ اب تو انہوں نے داڑھی بھی رکھ دی ہے۔ میں ان سے بار بار کہتی ہوں۔ بھائی اگر یہاں رہنا ہے تو لبرل ہونا پڑے گا۔ ایسے داڑھی واڑھی رکھنی ہے تو گھر چلیں۔ کیوں چا چاجی میں ٹھیک کہتی ہوں ناں۔۔۔ داڑھی والے آدمی سے لوگ ایسے ہی بدک جاتے ہیں۔“

”بھائی ٹھیک ہی کہتی ہو۔ بنیاد پرستی اب انرام ہو گیا، پہلے یہ خوبی تھی۔“

”چا چا جی ایک بات میں سمجھ چکی ہوں۔۔۔ لیکن ڈر لگتا ہے کہتے ہوئے“

”کیوں؟۔۔۔ کیوں ڈر لگتا ہے“

”لوگ کہیں مجھے مار نہ ڈالیں“

”ایسی بھی کیا بات ہے؟“

”وہ چا چا جی۔۔۔ خود مسلمان اب چاہتے ہیں کہ اسلام میں کچھ ایسی تبدیلیاں

آجائیں جن کی وجہ سے ہم دوسری قوموں کے ساتھ سانی سے رہ سکیں۔ آج کا

ماڈرن تعلیم یافتہ مرد اسلام مک سارے رکن مانتا ہے، لیکن جہاد کے متعلق شبہات میں

گرفتار ہے۔ وہ جہاد بانفس کو تو پھر بھی مان لے گا، لیکن دوسرا جہاد۔۔۔ تلواری والا اس

کے لئے وہ ایمان کہاں سے لائے؟ وہ چاہتا ہے کہ یہ سیف والا جہاد کسی طرح لبرل

پانیوں سے دھل جائے۔ جب دنیا میں یو این او ہے، ہیگ میں انٹرنیشنل جھڑے

نپٹائے جاسکتے ہیں، ہر ملک میں اپنا قانون بھی ہے تو پھر جہاد کیسا اور کیوں؟“

”تم ٹھکی کہتی ہو شمیمہ۔“

اس نے اپنا نام درست نہ کرایا اور بولتی گئی۔ ایسے ہی چا چا جی عورت کے لئے حجاب

بڑی زحمت بنا ہوا ہے۔ وہ اسلام کی ساری باتیں مان سکتی ہے، لیکن پردہ نہیں کر سکتی۔

کبھی وہ کہتی ہے پردہ آنکھ کا ہوتا ہے، کبھی نعرہ لگاتی ہے کہ پردہ دل میں کرنا چاہئے۔

پردے کو تو میں بھی نہیں مانتی چا چا جی۔۔۔ یہاں آ کر تو کوئی بے وقوف ہی حجاب لے گی

ہے ناں۔“

”ہاں آج کے عہد میں جہاد اور پردہ مشکلات تو پیدا کرتا ہے ناں۔“

”چا چا جی اگر اپنے ملک میں ہوں تو پھر تو اور بات ہے۔ یہاں اقلیت بن کر ایسی

باتوں کا جواب دینا مشکل ہے۔ چا چا جی۔۔۔ چا چا جی۔۔۔ اقلیت ہمیشہ کٹھڑے

میں کھڑی ہو کر کیوں زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کے ہاتھ پلے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کب

تک احساس کمتری میں مبتلا اپنے ہونے کا جواز پیش کرتی رہے کب تک؟“
میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، کیونکہ میرے پاس اسے دینے کے لئے کوئی
جواب تھا ہی نہیں۔

ہم دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔
”آپ مجھے ایک ہلاک پیچھے تک چھوڑ آئیں گے چا چا جی۔ بارش سپہیلے جو ہوا چلتی
ہے مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔“

”ضرور ...“ مجھے معاوہ چھتری یاد آگئی جو میں گھر بھول آیا تھا۔ میں بھی بارش میں
بھینکنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ لمبے زکام ... دیم کا اٹیک ... کوریوزون ...
سانس کا اکھڑنا ... لمبی پکڑ ... پر کیا کرتا ہے ... وہ ڈرتی جو تھی۔

”پتہ ہے چا چا جی! ان دنوں ہم چوہر جی کے پچھواڑے رہتے تھے۔ تب وہاں
زیادہ آبادی نہیں تھی۔ ایک دوپہر کو کالی آندھی آئی ... ہم گراؤنڈ میں کھیل رہے تھے
میرا دوپٹہ ہوا میں اڑ گیا ... میں اس کے پیچھے بھاگی۔ کچھ دیر تو دوپٹہ آنکھ مچولی
کھلتا رہا۔ پھر غائب ہو گیا۔ میں آندھی میں بھاگتی رہی پھر ایک درخت تلے بیٹھ
رہی۔ کوئی گھنٹہ بھر آندھی کا زور رہا ... میں بیٹھی رہی بیٹھی رہی چا چا جی، لیکن مجھے ڈر
نہیں آیا۔۔۔۔۔ ایسا ڈر نہیں آیا جو اس ہوا سے آرہا ہے۔۔۔۔۔“

آندھی میں دوپٹہ گنوا بیٹھنے والی لڑکی کے خوف کو سمجھنے کی کوشش میں ہم دونوں
دوسرے ہلاک میں پہنچ گئے۔

والپسی پر مہا بھارت یاد آگئی۔ رانی درو پدی کے پانچھو ہرتے اور جب جکش نے
راجہ یڈھشٹر کے بھائی مارڈالے تو مہاراج ادھیراج کو بہت دکھ ہوا۔ بڑے جتن سے
جکش کو پکڑا گیا۔ جب راجہ یڈھشٹر کے سامنے جکش پیش ہوا تو راجہ نے کہا ”دیکھ جکش
تو نے بلاوجہ میرے بھائی قتل کر ڈالے۔۔۔۔۔ رانی درو پدی کے سہاگ سے کھلا کہ وہ بھی
اس کی مانگ کا سینہ دہرتے۔“

جکش بولا ... ”مہاراج یہ درست ہے کہ میں نے تیرے بھائی، رڈالے اور درو
پدی کا سہاگ اجاڑا، پر اس کی وہ وجہ نہیں جو تو سمجھتا ہے۔“
”پھر اصلی وجہ بیان کر۔“

جکش بولا ... ”اے مہاراج مجھے آج تک اپنے سوالوں کے جواب نہیں مل
پائے۔ جب یہ سوال مجھے بے چین کرتی ہیں تو میں غصے میں بھوت بن جاتا ہوں ...
نہ مجھے دھرم اچھا لگتا ہے نہ انٹی ... نہ میں سیدھا مارگ سمجھتا ہوں نہ اندر رہنے کا بھید
بھاؤ جو راستے میں آتا ہے مٹا ڈالتا ہوں۔“

”مجھ سے پوچھ جکش میں تجھے شانتی کا مارگ سمجھاؤں گا ... پھر تیرے دل سے
رابعہ بننے کی چھتا، محلوں میں جیون بسر کرنے کا لالچ اور استریوں کا لو بھ نکل جائے
گا۔“

جکش نے ہنس کر کہا ... ”اچھا پتا پھر دھرتی سے وزنی کون؟“
یدھشٹر بولا ... ”ماں۔“

جکش نے وچھا اور ”آکاش سے اونچا؟“
”باپ۔“

”ہوا سے تیز رفتار؟“ جکش نے سوال کیا۔
”من۔“

”گھاس سے زیادہ پیدا ہونے والی چیز؟“
”مکر۔“

”اور پر دیسی کا ریت کون ہے؟“ جکش نے پوچھا۔

”سلوک“ یدھشٹر نے جواب دیا۔

”گرہستی کا دوست۔“

”عمورت۔“

”اب تو پھنسے گا راجہ۔ یہ بتا کیلا پھر نے والا کون“۔ جکشن ہنسا۔
”سورج“

جکشن چند لمحے چپ رہا پھر بولا۔۔۔ ”اس دنیا میں بے فکری کیسے پراپت ہو“۔
”غصہ مارنے سے“۔

جکشن حیرانی سے گویا ہوا۔۔۔ ”جسے دنیا کی ترقی و رکاوٹ ہو اور نہ ملے، بتا اس کا دکھ
کیسے ہرن ہو۔۔۔“

یڈ ہشٹر بولا۔۔۔۔۔ ”لاج اور محبت دور کر کے۔۔۔۔۔“

جکشن نے ابرو اٹھائے اور پوچھا۔۔۔ ”یہ بتا وہ کونسا مرض ہے جو کبھی دور
نہیں ہوتا“۔ یڈ ہشٹر اس بار ہنسا ”دیکھ ادھرمی لالچ و حرص ایسا مرض ہے جو کبھی دل
سے دور نہیں ہوتا۔ یہ چولا بدل بدل کر آتا ہے“۔

”کیا دھن دولت کے لئے اس دنیا کے لئے جتن کرنا چاہئے؟“

یڈ ہشٹر نے کہا۔۔۔ ”دیکھ اپرا دھی آدمی صرف دھرم کے لئے جتن کرنے آیا ہے۔ جو
دھرم کا پلڑا پکڑتے ہیں۔ دھرم ان کی حفاظت کرتا ہے۔ ورنہ نرک میں داخل ہونا
آسان ہے۔ ہر بے دھیان کام کو دودھ، لوبھ، ہنسکار کے راستے ہی تو نرک میں قدم
رکھتا ہے۔۔۔“

جکشن نے سر جھکا کر کہا ”مہاراج تجھے اختیار ہے جو چاہے میرے ساتھ کر۔
میں اپنا آپ تیرے قدموں میں ارپن کرتا ہوں۔۔۔“

جکشن کے سوال حل ہوئے، لیکن میرے اندر ترقی اور فلاح کی تینجی سے سب کچھ کٹتا
رہا۔

ہیلکونی ٹائم میں پلاسٹک کی کرسی سے پشت لگا کر میں نے سوچا۔۔۔ شاید روبینہ کی
بات درست ہے۔ ہر اقلیت خوفزدہ رہتی ہے۔ وہ مکمل طور پر اپنی شناخت بھی گنونا
نہیں چاہتی۔ اسی لئے مور پنکھ گاکرا کشریت میں ضم ہونا بھی اس کے لئے ممکن نہیں۔

یہی دوہری خواہش اس کے خوف کو گھمبیر بنا دیتی ہے، لیکن کبھی کبھی معاملہ اس سے الٹ بھی ہو جاتا ہے۔ کمزور اکثریت کو طاقتور اقلیت سے پال پڑ جاتا ہے، برصغیر میں مسلمانوں کو اپنی شناخت قائم رکھنے کے لئے کئی بار مختلف قسم کے امتحانوں سے گزرنا پڑا۔ پارسی اقلیت معاشرتی طور پر اکثریت میں ضم نہیں ہوئی۔ جنگ آزادی کے بعد انگریز گوا اکثریت میں نہیں تھے، لیکن حاکم ہونے کے باعث اس اقلیت کا سٹیٹس، رسم و رواج، تعلیم سب قابلِ تقلید ہے۔ ہندو نے بہت جلد اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ انگریز کی بالادستی کو قبول کئے بغیر کوئی نفع کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کو تعجب محض کا سامنا تھا۔ انہیں یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ ترقی کے حق میں ووٹ دیں یا فلاح کا راستہ اختیار کریں۔ سرسید نے نئے تقاضوں کے پیش نظر علی گڑھ کالج کی شکل میں فلاح کے بجائے حصول ترقی کو ترجیح دی۔ حاکم نے بڑھتے ہوئے مدد جزیر کے نتائج سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ ڈپٹی منڈیر احمد نے ابن الوقت کا نقشہ کھینچ کر اس حالت سے ڈرانے کی کوشش کی جو اندھا دھند تقلید کے باعث فلاح کے راستے سے ہٹا دیتی ہے۔ اقبال نے بھی سائرن بجائے۔ جنگ آزادی کے وقت انگریز جو اقلیت میں موجود تھا، وہی قیام پاکستان کے بعد ناموجود ہو کر بھی فعال رہا اور بڑے شہروں میں مسلمانوں کی شناخت مغربی ہوتی چلی گئی۔ بریلوی اور دیوبندی دونوں تحریکیں اسی جداگانہ اسلامی شناخت کو قائم کرنے کی آرزو مند تھیں۔ بریلوی چاہتے تھے کہ رحمتوں پر تکیہ کر کے کشتی بچ منجھدار چھوڑ دی جائے۔ دیوبندی تحریک مسلمانوں میں مضبوطی اور خود انحصاری کو شعار بنانا چاہتی تھی۔ اس اختلاف کے باوجود خواہش دونوں کی ایک ہی تھی کہ مسلمانوں کی شناخت قائم رہے اور وہ فلاح پائیں۔ لیکن تعجب ہے قیام پاکستان کے بعد جو اقلیت امریکہ میں وارد ہوئی، اس کا مسئلہ سنگین تر تھا۔ امریکہ سڑکوں، بازاروں اور اشیاء کا معجزہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر حیرت کا بازار گر رہا ہے۔ عام انسان کے لئے یہ فراوانی کا خواب ہے۔ امریکہ حیرت کے دریا کا وہ ساحل ہے جہاں

کھڑے ہو کر پہلی بار انسان اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے اور اس کی اپنی شناخت متزلزل ہوتی ہے۔ جس قدر کوئی حیران، انگشت بدنداں ہوگا، اتنی ہی اس میں تبدیلی آئے گی۔ محیر العقول اشیاء کی سرعت سے بھرتی منڈی آپ کو دنگ کرتی ہے۔ بازار آپ کو گم کئے دیتے ہیں۔ ان کی سیر گویا ہر شہری کا جنت میں مفت داخلہ ہے۔ پھر یہاں کے نظام دنگ کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اکثریت گھیرے میں لے لیتی ہے اور نووارد حیرت زدہ پر رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ کمزور اقلیت کے پاس دکھانے سنانے، ابھارنے اور منوانے کے لئے کوئی چیز نہ ہو تو وہ اکثریت کے بہاؤ میں ایسے ہی بہنے لگتی ہے جیسے دریا کے ریتلے ساحل۔

سب سے پہلے اقلیتی ابن الوقت کا لباس بدلتا ہے۔ عموماً یہ تبدیلی سردیوں میں شروع ہوتی ہے۔ مرد تو خیر جنگ آزادی کے بعد سے پینٹ قمیض کے رسیارے لیکن نو وارد عورتیں یہ کہہ کر جینز پہننے لگتی ہیں کہ سردیوں میں ایک تو سردی سے بچاؤ بہتر ہوتا ہے اور دوسرے کام کاج میں یہ لباس زیادہ کمفر ٹیبل اور پھر ٹیلا بنا دیا ہے۔ جواز جو بھی دیا جائے اپنے عمل کو مضبوطی عطا کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ شروع میں جینز کے ساتھ لمبے بازو کی قمیض سویٹریا ونڈر بیکر استعمال میں آتا ہے۔ آہستہ آہستہ گرمیوں تک لباس وہی ٹھہرتا ہے جو مروج ہو بغیر آستین کی بنیان دیکھ کر نہ اچنچا ہوتا ہے نہ افسوس۔ امریکہ مقیم اقلیتی عورت ماڈرن لگنے ہی میں اپنے آپ کو اکثریت کا حصہ سمجھنے لگتی ہے۔

دوسری چیز جو اقلیت میں ذرا بعد میں بدلتی ہے، وہ نووارد کی زبان ہے اور زیادہ اہم ہے۔ کچھ لوگ بہت جلد امریکی لہجے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ذہن سے زیادہ ایسے لوگوں کی قوت سماعت تیز ہوتی ہے، وہ Slang سے خوب آگاہی پیدا کرتے ہیں۔ گو زبان نہیں آتی، لیکن لب و لہجہ کے زور پر پٹرول پمپ پر کام کرنے والا، ٹیکسی ڈرائیور، ڈکینز میں بچوں کی دیکھ بھال کرنیوالیاں، دوکان کی سیلر گرل، غرضیکہ جہاں بھی کام

میں لوگوں سے تال میل زیادہ ہو، سب زبان کے اتار چڑھاؤ اور لب و لہجہ کی باریکیوں کو سمجھ جاتے ہیں۔ رے کو کیسے رول کر کے ادا کرنا ہے اور لا کی آواز نکالتے وقت منہ کو کیسے گول کیا جاتا ہے یہ کچھ زیادہ وقت طلب مراحل نہیں ہوتے، جس طرح عورتیں میک اپ استعمال کرتی ہیں۔ ایسے ہی اقلیتی زبان کے لہجے میں اپنی کم علمی کو چھپا لیتا ہے۔ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے تارکین کی مشکلات دیکھ کر امریکن سکولوں میں اب اے بی سی پر زور نہیں دیا جاتا، بلکہ وازوں کی شناخت سے حروف سکھائے جاتے ہیں۔ اس طرح بول چال تو جلد درست ہوتی ہے، لیکن زبان کے رموز ہمیشہ وقت طلب ہوا کرتے ہیں اور لسانی مہارت ایک مدت کے بعد حاصل ہوتی ہے اسی لئے اقلیت میں زبان دان کم پیدا کرتے ہیں۔

یوں لباس اور زبان کے مورچکھ لگا کر کوانٹس چال کے قابل ہو جاتا ہے، لیکن اس یافت کے ساتھ ساتھ اقلیت کو بہت سی اپنی چیزیں چھوڑنے کا احساس بھی گھیر لیتا ہے۔ Exposure کے ایسے فائدے عموماً مالی شکل میں لوٹتے ہیں۔ پھر آزادی کا فروغی احساس بھی ہوتا رہتا ہے، لیکن اس ترمیم اور اضافے کے باوجود اقلیتی افراد کو ایک طرف تنہائی دوسری جانب احساس جرم کا قمار ہوتا ہے۔ اپنے لباس اور زبان سے بے وفائی کی مشکل اسے اندر ہی اندر پڑا رہتا ہے۔ تنہائی سے پان لے کر کھانے سے ہونٹ تو سرخ سرخ رہتے ہیں، لیکن اندر تارکین کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلی اصلی نہیں۔

ہولے ہولے زبان اور لباس سے فارغ ہو کر اس نئے سورج سنسار کی روشنی میں اقلیت کو اپنے منہ کی طرح کی کمی نظر آنے لگتی ہے، وہ مکمل طور پر اپنا رنگ تو بدل نہیں پاتا، لیکن عورتیں کالے سائلوے گندمی رنگ کے خلاف خوب جہاد کرتی ہیں۔ خاص طور پر بال اور رنگ پلچ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتیں۔

امریکہ میں شکل کو مغربی معیار پر ڈھالنے کے لئے بال اور رنگ بدلنے کے لئے

کریم، وشن، ہیر ڈائی کی پوری انڈسٹری اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ خوبصورتی میں کمتر ہونے کا احساس کمتری اندر سے گھونسنے مارتا رہتا ہے، لیکن اقلیت ہار نہیں مانتی۔ جب رنگ، لباس اور زبان کی تبدیلی کافی نہیں پڑتی اور کوا محسوس کرتا ہے کہ مور پتکھ پتکھے پڑ رہے ہیں تو رفتہ رفتہ وہ اپنی اقدار اور مذہب کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ جہاں پہلے نبیوں کے بتائے ہوئے فلاح کے گرزندگی کے فیصلوں پر حاوی تھے۔ وہاں اب ہیومن رائٹرز کا خیال رہتا ہے۔ اکثریت میں گم ہونے کی خواہش ہر قسم کی رکاوٹ کو ختم کرتی ہے۔ پچھلی قدریں چھوڑ کر صرف کام کی اخلاقیات باقی رہ جاتی ہیں۔ اقلیتی فرد صرف کام کے سہارے زندہ رہنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔ کام کے سامنے ہر قدر، مذہب پڑ جاتی ہے۔ اصلی قدریں جعلی دستاویزیں نظر آتی ہیں۔ رشتے ناٹے بھوسی بن جاتے ہیں۔ بوڑھے بڑھا ہاؤس میں اور بچے بے بی کینر میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں لاکر اقلیتی افراد سمجھتے ہیں کہ اب وہ اکثریتی دیگ کا حصہ بن گئے ہیں۔

لیکن اتنا سب کچھ بدلنے، چھوڑنے بے تال ہو جانے پر بھی نیکرو، پاکستانی، سری لنکن، جاپانی، چینی، سب دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ خود اقلیت کو اشتباہ نظر کا دھوکا ہوتا ہے کہ وہ اکثریت میں بدل گئے ہیں، کسی سفید فام امریکی کو یہ شبہ ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ تو اس قدر جدا گانہ نسلی امتیاز کا شعور رکھتے ہیں کہ ترکوں کو یورپ کا حصہ بننے نہیں دیتے۔ اپنے آپ کو ایرانی، ترک یا بنی سمجھنے والا پاکستانی یہ سمجھ نہیں پاتا کہ یہ اعزاز امریکی کے نزدیک کچھ ایسے فخر کی بات بھی نہیں اور جن سے ہم براؤن لوگ اپنی شناخت مستعار لے رہے ہیں ان کی چولیس بھی اکثریت میں فٹ نہیں ہو سکیں۔ ان کے لئے بھی کسی امریکی کے دل میں نرم کوٹنا نہیں۔

جب اکثریت کا بہاؤ تیز ہو تو اقلیت کے خس و خاشاک اس میں تیزی سے بہتے ہیں، لیکن جب دریا ست رفتار ہو کر میدانی علاقے میں سستی سے چلنے لگے تو پھر درختوں کے گرے ہوئے تنے، ٹوٹے پل، شہروں سے آنے والا کوڑا کرکٹ پانی کے

بہاؤ کو روکنے لگتا ہے۔ امریکہ کے مزاد میں پسند لوگوں نے جب ریڈ انڈین قالیق کو جنگلوں میں بھگا دیا تو کچھ دیر کے بعد ان کو بھی احساس جرم نے ستایا۔ ان کے خدا ترس لوگوں نے سوچا کہ یوں تو ساری دنیا میں ظلم ہم سے منسوب ہو جائے گا۔ امریکی پر سونا کو دھچکا لگے گا۔ اقلیت کو برابری کا احساس دلانا، اس کی حفاظت کرنا، اس کے کلچر اور مذہب کو اہمیت دینا جمہوری حکومت کی نیک نامی کے لئے ضروری تھا۔ اس طرح ریڈ انڈین Reserves میں دھکیلے گئے۔ اسلامک سنٹر، صوفی تحریکیں، ہندو پنٹھ، جی، تاؤ، کنفیوشس کی تعریف پر اکثریت کا ایک حصہ زور و شور سے مامرو ہو گیا۔ ہیومن رائٹز کو بروئے کار لا کر اکثریت اپنے آپ کو لبرل، انسانیت پسند، بھدر پرش پیش کرنے میں سہولت محسوس کرنے لگی۔ ادھر اس رویے سے اقلیت کا خیال ابھرا کہ وہ اکثریت میں ضم ہو رہی ہے، لیکن اکثریت اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ کسی طور بھی اقلیت کو سیاسی طاقت حاصل نہ ہو اور وہ بڑے دھارے کا حصہ نہ بنے۔

شری رجنیش نے جب اپنی سیاسی اہمیت جتاننا شروع کی، انہیں منہ کی کھانا پڑی۔ امریکی سیاسی نامہ جانتے ہیں کہ اگر کتے کو زنجیر سے باندھا جائے تو وہ زہری ہو جاتا ہے۔ پچکار کر لے پا لک بنا کر رکھا جائے، اس کی ٹریننگ پر وقت صرف کیا جائے تو وہ گھر کی رکھوالی کرتا ہے۔ اخبار لانے، ڈاک پڑانے، اجنبی کی اطلاع دینے اور سلنک بھگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اکثریت بھی اس ٹریننگ پر لگتی رہتی ہے۔ ایک سے قانونی حقوق لے چکنے کے بعد اپنی شناخت گنوا بیٹھنے کے بعد بھی یہ حقیقت نہیں بدلتی کہ اقلیت بھی اکثریت کا حصہ نہیں بن پاتی۔ وہ اکثریتی دریا پر خس و خاشاک کی طرح بہتی ہے۔ نیگرو بہر حال نیگرو رہتا م ہے۔ جاپانی، ترکی، چینی، پاکستانی بہر کیف اپنے آپ کو نئے ماحول میں، نوں اجنبی سمجھتے رہتے ہیں۔

جس طرح ایک کالی لڑکی، چھوٹے قد کے مرد، موٹے آدمی، گھنچے کو ایک گھبرا احساس کمتری رہتا ہے، ایسے ہی اقلیت کبھی بھی کمتر ہونے کے جذبات سے بچ نہیں

سکتی۔ اس کے اپنے چاہنے والے ساری عمر اس کی کمی کا ذکر برملا نہیں کرتے، لیکن دوسرے لوگوں کی زبانیں روکی نہیں جاسکتیں۔ وہ موٹو، گٹھو، کلو جیسے نام بھارتکلف استعمال کرتے ہیں۔ اب Complexed انسان کے لئے تین راستے ابھرتے ہیں۔ ... یا تو وہ اس جسمانی کمزوری کا بھرپور دنیاوی علاج کرے۔ جو بھی بشری تقاضا ہو، اسے اپنی بقاء کا راستہ بنائے یا پھر روحانی علاج کی طرف رجوع کرے اور کسی معجزے کے انتظار میں رہے۔ اگر یہ دونوں چیلنج اس کی ہمت سے زیادہ ہیں تو پھر اپنی کمتری کو مان کر برامانے اور رنجیدہ ہونے کی سٹیج سے نکل جائے اور معاشرے میں پچھلی بنچ پر بیٹھنے کی عادت ڈال لے اور اپنے آپ کو اصلی شہری کے بجائے دو نمبر کا انسان سمجھ لے۔ جتنی کریمیں، گنج کے علاج اور ورزشوں کے سنٹر انسانوں کی آرزوؤں کے باعث لکڑیوں کی طرح مارکیٹوں میں آئے ہیں۔ جن سے کروڑوں کا کاروبار چل رہا ہے، احساس کمتری میں مبتلا ان لوگوں کی جیبیں خالی کرنے کے ذرائع ہیں۔

جوں جوں انسان اپنی کمی کو زیادہ محسوس کرتا ہے، اس کا رجوع دولت کی طرف تیزی سے ہوتا ہے۔ دولت وہ زیر دست مورچکھ ہیں جس سے بچہ رہ کو انہیں بننے کے آخری خواب دیکھتا ہے۔ ... فرد کی حد تک تو دولت کا نسخہ کافی کامیاب رہتا ہے۔ کار، بنک بیلنس، کوٹھی، ہوائی سفر، ود بہ، فرعونیت اور ہم چوں ما دیگرے نیست والا Illusion قائم رہتا ہے، لیکن عموماً دولت اقلیت کا مسئلہ مجموعی طور پر حل نہیں کر سکتی۔ جب اقلیت ضم ہونے کی تمام تر ایکب استعمال کر چکتی ہے اور کامیاب نہیں ہو پاتی۔ جب چینی پانی میں اور زیادہ حل نہیں ہو سکتی تو ایک بار پھر محلول سوکھنے لگتا ہے۔ چینی علیحدہ ہو کر Crystals کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہے۔

اس وقت اقلیت مایوسی کا شکار ہو کر مراجعت کرتی ہے۔ اپنے مذہب، کچھر، زبان، لباس کی طرف۔

واپسی کا سفر ... لیکن اس کچھل لوٹنے کا ذکر میں پھر کروں گا۔ میری بیٹی گھر میں ہے اور مجھے کھانے کے لئے آوازیں دے رہی ہے۔ اس کی آواز میں سائرن بجنے کی کیفیت ہوتی ہے۔ ارجمند سر سے پاؤں تک Workaholic ہے۔ وہ چلتے پھرتے کھانا کھاتی ہے۔ بیٹھ کر ٹی وی نہیں دیکھ سکتی۔ واک مین لگا کر کپڑے استری کرتی ہے۔ کتاب پڑھتے وقت بھی کمپیوٹر لگائے رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک سب سے قیمتی چیز وقت ہے۔ وہ ہر لمحے اسے سونے میں تبدیل کرتی رہی ہے۔ کبھی وہ وقت کو گھر کے کام میں بھناتی ہے۔ کبھی اپنے جسم کی ورزش میں بدل دیتی ہے۔ ... اس کی سب سے بڑی تفریح یہ ہے کہ وہ مصروف رہے اور کام کی زیادتی کے خلاف ہر ایک سے گلہ بھی کرتی رہے۔

یہی پھوکٹ، کھوکھلا، بھوسی بنا وقت امریکہ کا اصلی ویسٹ ہے۔ جنک یا رڈز میں جو کچھ اکٹھا ہوتا رہتا ہے وہ تو Recycle کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وقت کے بھرکس سے کچھ نہیں بنتا۔ انسان خالی الذہن ہو کر ہوا میں گھورنا، ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کا فن بھول گیا ہے Meditation کے سنٹر تو ہیں، لیکن وہاں بھی گیان دھیان کو کام میں بدل کر مصروف رہنا اصل مقصد ہے۔ کاموں سے بے پرواہ، تعلقات سے بے نیاز، ندی کنارے بیٹھ کر دریا کے بہاؤ کو دیکھتے رہنے کا فن اب شہری لوگوں کو بھولتا جا رہا ہے۔ جب امریکی بریک کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو اسے بہت سے انتظامات کرنے ہوتے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کا سامان، سنیل اور مووی کیمرے، کتابیں، سلپین بیگز حتیٰ کہ کچھ لوگ تو باربی کیو کی انگوٹھی اور Marinate کیا ہوا گوشت مرغی بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہالی ڈے بذات خود کام میں بدل جاتی ہے۔ کھیتوں کو فارغ چھوڑے رکھنے سے شعایں مٹی میں داخل ہوتی ہیں اور ہوا میں سے رنے جھڑنے والا پولن بڑی روئیدگی لئے کھیتوں میں جاری ساری رہتا ہے۔ انسان جب کام کا ج چھوڑ کر ٹائلیں پھیلائے، سر کے پیچھے ہاتھوں کی کنگھی سے سہارا دے کر مندی مندی

آنکھوں سے نیلگوں آسمان کو دیکھتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے شعور اور لاشعور کا درمیانی دروازہ کھلتا ہے۔ پھر وجدان کی پریاں اشارہ پا کے اسے تحت الشعور کی دنیا میں لے جاتی ہیں۔ تخلیق کے پرندے پھڑ پھڑاتے ہیں صدیوں کی گم گشتہ آرچی ٹائپ شہی ہیں متقی ہیں۔ ماضی اور مستقبل کے اسرار و رموز سے شناسائی ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو Hyonotise کرنے کی قوت سے شناسا ہو جاتا ہے۔ تحت الشعور ہی یادوں کا سٹور ہاؤس ہے۔ ان سلیپی گھتئیوں کا پنڈورا باکس ہے۔ یہیں سے عرفان ذات کا علم ملتا ہے۔ مصروف انسان کی یہاں تک رسائی نہیں ہو پاتی۔

میں آپ سے اقلیت کی بے چارگی کے بارے میں بات کر رہا تھا، لیکن فرد کی کشمکش کی طرف کھسکتا چلا گیا۔ ... ترقی کے لشکارے تو حیرت میں ڈبو تے گئے لیکن نلاح کا دروازہ بند ہوتا چلا گیا۔

”ابو.....“ بیلکونی میں ارجمند کی آواز پھر آتی ہے۔

”آجائے مجھے ہسپتال جانا ہے۔۔۔ دیر ہو رہی ہے ابو۔“

میں خیالوں کے الجھے دھاگوں کا لچھا پلاسٹک کی کرسی پر رکھتا ہوں۔ سامنے والے گھر کی بیلکونی سے گریک بڈھا چابیوں کا گچھا نیچے سڑک پر پھینکتا ہے۔ اس کا جوان سال بیٹا ان چابیوں کو دونوں ہاتھوں میں کیچ کرتا ہے۔ جب بڈھے نے چابیوں کو نیچے گرایا تو میں نے دعا کی تھی کہ یہ چابیاں سیدھی نوجوان کے ہاتھوں میں پہنچیں، سڑک پر نہ گریں۔۔۔ مجھے وہم تھا کہ اگر چابیاں نیچے گر گئیں تو گریک نوجوان کے لئے اچھا نہ ہوگا، وہ اتنے بڑے بڑے ٹرک چلاتا ہے جن میں کاریں سامان سفر ہوتی ہیں۔ ایسے ٹرک ڈرائیور کی زندگی کے لئے مجھ جیسے بڈھے کو خوف آتا ہے۔ میں اس کے لئے صرف دعا کر کے شگون کا سہارا لے سکتا ہوں۔

ہم بڈھے لوگ حزن و ملال کے بندے ہوا کرتے ہیں۔

خوف ہمارا گائیڈ ہے۔۔۔ ہم جیسے عمر رسیدہ یہاں کے دوزخ سے نکل کر مابعد کے

جہنم میں داخل ہو جائیں گے۔ اس تسلسل کی وجہ سے ہمیں علم بھی نہ ہوگا کہ یہ کارنامہ کیسے ہوا۔ شاید اسی خوف کی وجہ سے ہم مضبوط فیصلوں کے سہارے نہیں جیتے۔ ہم شگونوں کی انگلی پکڑ کر فیصلے کرتے ہیں۔ ہمیں ہر وقت استخارے کی ضرورت رہتی ہے۔ ہم اخباروں میں دیکھتے ہیں آج کا دن کیسا گزرے گا؟ جہنم کنڈلی ہماری بنیادی کھوج ہے۔ نجومی، عامل، پیر فقیر، تعویذ گنڈا، وٹلیے و طائف ہماری اصلی زندگی ہے۔ ہم بشری تقاضوں کو پورا نہیں کر پاتے اور مذہب کی اساس جو صبر و شکر ہے، اس کو بھی مان نہیں سکتے۔ کیونکہ صبر کسی شگون کا سہارا نہیں بیٹا۔ ہم کہیں خواب و خواہش کے درمیان، اصل و نقل کے مابین، حقیقت اور خواب سے ملا جلا ایک ملغوبہ تیار کرتے ہیں اور اسی معجون مرکب کو چاٹ چاٹ لا حاصل زندگی بسر کرتے ہیں۔

آواز پھر آتی ہے۔ ”ابو جی آجائیں پلیز۔“

”آ رہا ہوں، آ رہا ہوں۔ آ گیا بس۔“

ایک بار میں نے گھر کے آگے ڈھیر اخبار رسالوں میں سے ایک ٹیلو نکالا۔ اس میں وڈرج تھا۔ ”نچلا گیا رہبرس کی تھی، لیکن ایک لمبی بیماری کے دوران اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ والدین نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن ”نچلا“ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوئی۔ ہارکرا سے سان فرانسسکو کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

”نچلا“ میں ایک خوبی تھی۔ وہ معذوری کے باوجود پر امید رہا کرتی۔ کوئی لمحہ ایسا نہ آتا جب وہ اپنے اللہ سے مایوس ہوئی ہو۔ جب کبھی کوئی نرس یا ڈاکٹر اس سے تسلی آمیز بات کرتا تو وہ کہتی۔۔۔۔۔ ”پ کیوں مایوس ہوتے ہیں، مجھے اشارہ آچکا ہے۔ میں چلوں گی اور سکول میں پڑھوں گی۔“

ایک رات اچانک اس کا پٹنگ چلنے لگا۔ وہ چلائی دیکھو دیکھو معجزہ ہو گیا۔ میں چل سکتی ہوں۔۔۔ فوراً اس نے پٹنگ سے چھانگ لگائی اور چلنے لگی۔۔۔۔۔ ”نچلا“ سکول جانے لگی اور کھیلوں میں حصہ لینے کے قابل ہو گئی۔۔۔۔۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، اس کی شدید

آرزو نے یہ معجزہ کیا۔۔۔ کچھ دین داروں کا خیال تھا کہ اسے تو پہلے سے اشارہ آچکا تھا۔ اسی شگون نے اس کا ایمان مضبوط کیا اور وہ معجزے کے قابل ہوئی۔

کچھ تحقیقی لوگوں نے اظہار کیا۔ پلنگ کا چلنا معجزہ نہ تھا۔ اس رات سان فرانسسکو میں زلزلہ آیا۔ اسی ہسپتال میں ایک پورا بلک گر گیا۔ یہ اب انسان کی استعداد یا مرضی پر منحصر ہے کہ وہ آنجنلا کے چلنے کو زلزلے سے منسوب کرے یا معجزے سے۔ وہ شگون کی راہ چلے یہ حقیقت کی لاشی ہنکائے۔ خیال اور حقیقت یہ متضاد راستے دونوں سچے ہیں۔ صرف فیصلہ آپ کا اپنا ہے۔۔۔ کبھی کبھی ایک بڑی سے اتر کر دوسری پر چل نکلنا بھی اتفاق اور اتفاقہ ہوتا ہے۔۔۔ مشکل یہ ہے کہ بوڑھا آدمی جدھر بھی چل نکلے، دوسرے اس کی جان نہیں چھوڑتے۔ خوف اس کا مستقل ساتھی ہے۔

شام کو پھر میں میلکوئی میں بیٹھ کر ارجنند کا انتظار کرتا ہوں۔ لاہور میں میری بہت سی مشکلات تھیں جن کا تعلق پیسے سے نہیں، فعل ہونے سے تھا۔ بجلی کا بل، ٹیلی فون کی ادائیگی، اپنی ڈاک خود پوسٹ کرنے جانا پڑتا تھا۔ عموماً کسی پلمبر، الیکٹریشن، گٹر کھولنے والے کے ساتھ مغز پچی کا مرحلہ پیش آتا۔ بڑے گھر کا میک اپ بڑی فعالیت چاہتا اور اب مجھ میں نگرانی کرنے والے کام کروائیکی ہمت نہ تھی۔ یہاں مجھے کوئی اہم کام نہیں ہے، بلکہ یوں سمجھئے کہ اپنے لئے مانیکر اوون میں کھانا گرم کرنے کے سوائے مجھ پر کوئی بھاری ڈیوٹی نہیں۔ راحتیں قریب قریب مکمل ہیں، لیکن اب دن بہت لمبا ہو گیا ہے۔ لاہور میں نظریاتی اختلافات کے ہاتھوں دوستوں میں بول چال بند ہو جایا کرتی تھی۔ لیگ اور پیپلز پارٹی نے خاندانوں کو دو پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ڈرائنگ روم کی فضا میں ورہل ڈائیریا کے ہاتھوں بدبودار تھیں۔ قیمتیں فلک بوس ہو رہی تھیں۔ ڈالر کی قیمت بڑھ جانے کے باعث کئی گھروں میں مالی استحکام ناممکن تھا اور لوگ ان مشکلوں کے ہاتھوں حیرت زدہ مرنے مارنے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن۔۔۔ ان ہی مشکلات کے ہاتھوں اکثریت زندہ بھی تھی۔ پوریت کا وقت نہ تھا۔ سوچنے

اور تفکر کرنے کی مہلت نہ تھی۔ ارجمند کے صاف ستھرے گھر میں مجھے بار بار گھڑی دیکھ کر، یوں لوٹا پڑتا منٹ سالوں میں کتنا۔ مشکلات میں گھرا انسان تیز سوچتا اور تیز ترین دوڑتا ہے۔ اس کے لئے وقت ہمیشہ کم اور وسائل کم تر ہوتے ہیں۔ وہ جدوجہد کی سان پر چڑھا رہتا ہے، لیکن اس کا وجود اسے ٹک نہیں کرتا۔ جونہی وافر وقت حاضر مال بن کر آجائے، اپنے وجود کے ساتھ وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر نفسیاتی بیماریاں تنہائی کی بے معنویت ستانے لگتی ہے۔ عرفان ذات حاصل کئے بغیر اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ ذکر کے بغیر کسی طور بھی انسان مجتمع نہیں ہو پاتا۔ کیا کیا جائے اطمینان نہ وہاں تھا نہ یہاں، ایک اس کی ذات سے بندھے رہنے میں فلاح کی پھوار پڑتی رہتی تھی۔

پلاسٹک کی کرسی کو میں نے دسویں مرتبہ نشو سے صاف کیا۔ کرسی پر کہیں ایک ذرہ بھر مٹی نہ تھی، لیکن میرے پاس وقت ہی وقت تھا اور میں ہر بوڑھے آدمی کی طرح تذبذب کے ہاتھوں اس ایک درست مصرف سے نا آشنا تھا۔ مجھے خالی سیڑھیوں پر چل کر تخت اشعور تک پہنچنا نہ آتا تھا۔ نہ ہی بعد تک کوئی ہوائی جہاز جاتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ انسان اپنے ماضی سے بہت کم سیکھتا ہے۔ تجربہ انسان کا بدترین استاد ہے۔ یہ علم عطا کرنے سے بہت پہلے ہاتھ میں امتحانی پرچہ پکڑا دیتا ہے۔ مال اتار کر نے اپنے تجربات سے سیکھنا اور سکھانا چاہا۔ وہ اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے فلاح کی تلاش میں تھا۔ اس نے وی ٹی وی اتاری اور ہیٹ کو اپنایا۔ ترکی زبان کا رسم الخط بدل کر زبان کو رومن تحریر کے تابع کیا۔ مولوی کو معاشرے کا دین سمجھ کر اسے قرار واقعی سزا دی اور مذہب میں بشرط استواری کو ایمان کی کمزوری جانا۔ عورتوں کو آزادی کی راہ بچھا کر منزل کا سراغ نہ دیا۔ تجربے پر تجربہ کیا، امتحان سے پہلے نرا اور نتائج بعد ازاں نکلے۔

افسوس اتار کر کے سوچ کے وہ نتائج نہ نکلے جن کی اتار کر کو امید تھی۔ تجربہ نئی

سمت میں ضرور لے گیا۔ تبدیلی کا حامل بھی تھا۔ پر کہیں خواب دیکھنے والے مال اتار کر نے ادھورا تجربہ کیا اور منہ پختہ خواب دیکھے، اسی لئے آج تک ترکی یورپ کا حصہ نہ بن سکا۔ وہ یورو کے لئے ترس رہا ہے اور یورپ پرے پرے کہتا نظر آتا ہے۔ اکثریت میں مدغم ہونے کی خواہش اتنی شدید ہے کہ ابھی تک ترکی اپنی راہ متعین نہیں کر پایا۔ ایشیا کا حصہ وہ کہلانا نہیں چاہتا اور یورپ اسے اپنانا نہیں چاہتا۔

دوسرا تجربہ ایران کے شہنشاہ نے کیا۔ اس نے ہر طور مغربی کلچر میں ضم ہونے کی کوشش کی۔ جوں جوں تیل کی فراوانی کے ہاتھوں ایرانی خوشحال ہوئے، ویسے ہی وہ شناخت کے طور پر پامال بھی ہو گئے۔ پھر امام خمینی نے ایرانی لوگوں کے بکھرے تسبیح دانوں کو ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کی۔ یہ تجربہ بھی دو ہزار سنی کے قریب آ کر دم توڑتا نظر آتا ہے۔ ایک تجربہ اسپین میں بھی ہوا تھا۔ طارق بن زیاد کشتیاں جلا کر اسپین پہنچا۔ نو سو سال حکومت کرنے کے بعد اپنے گھروں کی چابیاں لے کر خالی ہاتھ فاتح موٹ گئے۔ کچھ امریکہ سدھارے، باقی وطن موٹ گئے۔ اسپین کی اکثریت نے اس مضبوط اقلیت کے مذہب کو نہ اپنایا۔ شاید یہ رنگ کا کرشمہ ہے کہ سفید فام قومیں سیاہ لوگوں کا مسلک نہیں اپن سکتیں یا پھر اسپین کے لوگ عیسائیت میں اس قدر راسخ العقیدہ تھے کہ انہوں نے سیاہ فام لوگوں کے عقیدہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ایسے ہی ذلتیں بہتے ”رفیق رفیق“ کی صداؤں پر بھاگتے جب پاکستانی لوگوں کا سعودی عرب میں دم پھولنے لگتا ہے تو وہ سوچنے لگتے ہیں کیا وطن لوٹ جائیں اور ناداری، مفلسی اور بے راتگی کی زندگی اپنائیں یا پھر مورچہ پٹھ اتار کر دھڑے سے کوئے کی زندگی بسر کریں، جسے نہ تو پردیس میں پوری توقیر ملتی ہے نہ اپنوں میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ امریکہ میں احساس تنہائی سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ اکثریت میں مدغم ہونے کی خوشی اور خواہش اور اپنی شناخت قائم کرنے اور رکھنے کی آرزو مسلسل رس کشی کی صورت اختیار کئے رکھتی ہے۔ جب اقلیت کے مورچہ پٹھ کافی نہیں ہوتے تو ایسے بھی کلاس سٹیزن

جنہیں ہیومن رائٹرز تو ملتے ہیں، لیکن وہ مساوات نہیں ملتی جو صرف نبیوں کی میراث ہے۔ ایسے میں اقلیت کبھی کبھی اقلیتی گروہوں کی شکل میں بٹ جاتی ہے۔ ایسے گروہ اپنے مذہب اور کلچرل کی پاسبانی کے لئے اٹھتے ہیں۔ عورتوں کے سروں پر حجاب آجاتے ہیں۔ مرد مسجدوں میں نماز ادا کرنے لگتے ہیں۔ گھروں میں میلاد، مجلسیں، روزہ کھلائی کی محفلیں، آئین اور شادی کی رسومات وطن کی طرف لوٹ جانے کا خواب ہوتی ہے۔ ڈرگنز، جنسی بے راہ روی، آزادی سے حاصل کردہ جرائم سے خوفزدہ ہو کر مسلمان تارکین ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے سفید لوگ انہیں فنڈ امنگس کہتے ہیں۔ اکثریت اس انداز زیست سے خوفزدہ ہو کر ایسے مسلمان گروہوں کو دہشت گرد گردانتی ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ بے بہاؤ پر بہنے والے خس و خاشاک یکدم زہریلے بریئے نظر آنے لگتے ہیں اور اکثریت یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ یہ اقلیتی گروہ نا احسان فراموش لوگ ہیں جنہیں پناہ، راحت، آرام ملا اور اس کے بدلے انہوں نے اپنی شناخت کی ڈھال پہن کی۔

اقلیت کا اکثریت میں ڈھلنے کی کوشش اور پھر اپنی جداگانہ شناخت کے لئے کوشش ہو جانا۔ بہر کیف یہ قوموں کے پنڈیولم کا سفر ہے، تضاد کا چلن ہے۔ اقلیت شاید ہی کسی اکثریت کا حصہ بن پاتی ہے۔ عمل اور رد عمل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کبھی اقلیت خوفزدہ رہتی ہے، کبھی اکثریت تمام تر طاقت کے باوجود اندر سے ہل جاتی ہے اور متزلزل ہونے کے بعد اس کا رویہ رد عمل کی طور پر انصاف پر مبنی نہیں رہتا۔ یہ نہیں کہ اکثریت انصاف کرنا یا دینا نہیں چاہتی بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ جیسے کسی کمرے میں ایک اچھلتا کودتا بند آجائے، پھر گھر کے جملہ افراد کبھی بندر کو باہر نکالنے اور کبھی رام کرنے کے پلان بنانے لگیں۔ بندر غیر محفوظ ہو کر کبھی پنکھے پر چڑھے، کبھی نہیں خیس کر کے گھر والوں پر لپکے، کبھی پردوں میں چھپ کر اپنی جان چھپائے، کبھی کرسی اٹھ کر آپ کی جان کا لاگو ہو۔ یہی حال اقلیت کا ہوا کرتا ہے۔ وہ یہ اچھل کود راصل اپنی جان

بچانے کے لئے کیا کرتی ہے۔

جب اکثریت کا بہاد تیز ہو تو اقلیت کے خس و خاشاک بڑی تیزی سے جتے ہیں، لیکن جب کبھی سامنے کوئی روک آجائے۔ درخت کا گرا ہوا تنا، وہ ہے کا جھٹلا، ٹوٹا ہوا پل کوئی بھی رکاوٹ اس تیز بہاد کو ست کر دے تو پانی نچی سطح پر تو رواں رہیں، لیکن روئے دریا پر جھاڑ جھنکار، پلاسٹک کے لفافے، ٹین ڈبے، بیکرا شیا، معدوم دریا کی روانی کے ساتھ نہیں بہہ سکتیں اور رکنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب اقلیتی گروہ روٹھے بچوں کی طرح احتجاج پر آمادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب اقلیت کے لئے مستعار مورچے کے ساتھ اپنی عزت نفس برقرار رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ اسے اپنے خام خیالوں کی دنیا سے نکل کر شعوری اور لاشعوری طور پر سوچنا پڑتا ہے کہ جو راستہ اس نے ترقی کی خاطر چنا، اس میں کیا کچھ کھویا اور کس قدر پیا۔ فلاح کا راستہ جو ترقی ہی کی شاہراہ ہے بہر طور پر کچھ اور تھا۔ اس کو چھوڑ کر اس کی زندگی کون سی سیڑھیاں اترتی چلی گئی، اسے آہستہ آہستہ پہ چلتا، یکے مذہب ک احکامات ہر صورت میں ہیومن رائٹرز سے بہتر تھے۔ دین الہی ہزار بار لبرل ہو اور وہ مہاراج ادھیراج اکبر کے سنگھاسن کو راجپوت اور مرہٹہ طاقت سے بچانے کے لئے اعلیٰ نئے پر کوئی دین دار تا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ ترقی کے لئے اپنی شناخت چھوڑی نہیں جاسکتی۔ مذہب کا پرچم اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ اب ایک بار پھر اقلیت رجعت کا سفر اختیار کرتی ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا کہ سفر یہاں بھی لباس، زبان، رہن سہن، کلچر، وطنیت سے ہی شروع ہوتا ہے۔ امداعظم فرانس کے سلسے سوٹ اتار کر اچکن شلوار اور جناح کیپ کو اختیار کرتے ہیں۔ افریقہ کا خوش پوش گاندھی دھوتی اور کھدی کی چادر کو اپنی شناخت بنا لیتا ہے۔ فرانس میں سکول کی ٹریاں حجاب پہننے پر اصرار کرنے لگتی ہیں۔ امریکہ جیسے ملک میں ایران کی عورتیں چادر عرب والیاں عبا کیں اور پاکستانی خواتین کے سروں پر دوپٹے آجاتے ہیں۔

لباس کی یہ تبدیلیاں اس بار کسی اکثریت میں ضم ہونے کے بجائے اپنی شناخت کو علیحدہ رکھنے کیلئے کی جاتی ہے۔ ایک مدت امریکی ماحول میں رہنے کے باعث اردو سینا بلدی بچوں کو اپنی زبان بولنے پر اکسایا جاتا ہے۔ قرآن پڑھنے پر اصرار اور نماز روزے کی پابندی سکھائی جاتی ہے۔ اپنے کلچر کی حفاظت ناگزیر لگتی ہے۔ آخر میں اقلیت کو اپنے مسلک، اقدار، کلچر اور دین کیسے سوائے اپنی شناخت کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ جب اقلیتی گروہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اکثریت سے کٹ کر عزت نفس کی خاطر مدافعت پر آمادہ ہوتا ہے تو یکدم اکثریت اس قدر خائف ہو جاتی ہے کہ پھر مسلمانوں کو خاص طور پر فنڈ امنڈلتے اور دقتیں گروہ کی مہذب گالی دی جاتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جس قدر حیرت زدہ اقلیت امریکی بہاؤ میں ضم ہونے کی جلدی کرتی ہے۔ اسی جذبے کے ساتھ ناراض اقلیت اپنی شناخت کو پانے کے لئے تیز رفتار، مضبوط اور باہمت ہو جاتی ہے اپنے وجود کی علیحدگی کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے کوئی چھوٹی سچھوٹی یا بڑی سے بڑی تبدیلی کافی نہیں ہوتی۔ تحریکیں، احتجاج جلسے، Walks، پتھراؤ، خودکش دتے، ڈنڈے، کلشنکوف سارے منفی اور مثبت اظہار بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ نہ تو پانی میں کود جانے کے وقت اقلیت کو انسانی حدود خیال آتا ہے، نہ ہی پانی سے باہر نکلنے وقت اپنی برہنگی کو تو لے کر لپٹنے کا فن اس کے بس کی بات ہے۔

اقلیتوں کا مسئلہ وہاں شدید تر ہوتا ہے۔ جہاں اکثریت امریکنوں کی طرح جسمانی ساخت اور رنگ کی بدولت سیاہ براؤن، چینی، جاپانی لوگوں کو اپنے میں ضم نہیں کر سکتی۔ یہ مسئلہ ہندوستان میں بھی تکلیف دہ حد تک ناقابل حل تھا۔ یہاں تقسیم مذہب کی بناء پر ہوئی، کیونکہ ساری سوسائٹی مذہبی اعتقادات کی بناء پر ویدوں کے زمانے سے مذہبی طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ برہمن جاتی شوروں کو دھرم کی بناء پر اپنے میں سمو نہیں سکتی تھی۔ امریکہ میں رنگت کی تقسیم نے بنیادی مساوات قائم نہ ہونے دی۔

ہندوستان میں مذہب کی یکجہتی کی فضاء پیدا کرنے میں مزاہم ہوا۔ نہ رنگت انسان کے بس میں ہے اور نہ ہی کوئی شور اپنے آپ کو براہمن **Declare** کر نیکا اہل ہے۔ ہندوستان میں ساری اقلیتیں بالآخر اپنے اپنی گروہوں میں جکڑی گئیں۔ پارسی، اینگلو انڈین، سکھ اور مسلمان اس بات کے شاہد ہیں کہ ہندوستان میں ان کی شناخت بی کلاس سٹیزن کی رہی ہے۔

سکھوں اور مسلمانوں کی حالت ہندوستان میں دوسری اقلیتوں سے مختلف تھی۔ وہ برصغیر میں بادشاہت کے مزے لوٹ چکے تھے۔ مغل بادشاہوں نے ذمیوں کے حقوق کا اس درجہ خیال رکھا تھا کہ راجپوت اور مرہٹے مغل راج میں بڑی طاقتیں بن گئے۔ مسلمان کسی اقلیت کو جبراً اپنے میں ضم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اقلیت کی حفاظت کے لئے ضرور جزیہ کی شکل میں ٹیکس لگایا جاتا رہا، لیکن جذبہ اقلیت کی حفاظت کے لئے اکٹھا کیا جاتا تھا۔ سکھوں نے ہندوؤں میں ضم ہونے کی خاطر ہندوؤں میں شادیوں تک کیں۔ توحید پرست ہونے کے باوجود گورو نانک جی کی تصویروں، بتوں کو ماتھا ٹیکا اور رسومات میں ہندوؤں کی پیروی کی، لیکن مسئلہ ان کا بھی حل نہ ہو سکا۔ بابری مسجد کا منہدم ہونا اور امرتسر کے گردوارے کی بے حرمتی اس بات کی شاہد ذہ ہے کہ ابھی تک ہندو جاتی کا غصہ فرو نہیں ہوا۔ حیلہ جوئی یا زبردستی سے کسی فرد یا گروہ کو اپنے میں ضم کرنے کی کوشش اسلام کے لئے ایک مذموم فعل ہے۔ استقامت سے مثالی زندگی پیش کرتے رہنا سب سے زیادہ محیر العقول معجزہ ہے، جس کے سحر سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ یہی راستہ صوفیا کا رہا جس سے ہندوستان کے اکثریتی لوگ اسلام میں ضم ہوئے۔ افسوس کہ سفید فام امریکی ایسا کوئی حل پیش نہ کر سکا، کیونکہ وہ کسی ایسے اقلیتی گروہ کو اپنے میں ضم کرنا ہی نہ چاہتا تھا جو اس سے مختلف تھا۔ وہاں صرف **Human Rights** کا نعرہ بلند ہوا جس نے جمہوری نظام کو تو مضبوط کیا، لیکن فرد کے احساس شکست کو کم نہ کر سکا۔ امریکہ میں کریچن ہلٹ میں بسنے والے لوگوں کا خیال ہے کہ

امریکہ کے زوال کی وجہ نیگرو اور ریڈ انڈین کی بددعا ہے جو نسل در نسل ان کے دلوں سے نکلتی ہے اور جس کے باعث امریکی سوسائٹی سطح پر پر امن، لیکن اندر سے پھرتی چلی جاتی ہے۔ میں اپنی لہر در لہر بار بار لوٹ آنے والی سوچ میں یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک بار پھر ارجمند کی آوازیں شروع ہو گئیں۔ میری زندگی میں بلاوے کم ہیں، اس لئے میں ان پر لبیک کہتا ہوں۔

میں اس نیگرو کا نام سمجھ نہیں پایا۔ کیونکہ اس کے تلفظ میں ڈبلیو اور زیڈ کی بڑی زیادتی ہے اور وہ عجیب طرح سے حروف کو مخفف کرنے کا بھی عادی ہے، پھر اس کا لب و لہجہ عام امریکن زبان سے مختلف ہے۔ میں اسے انکل ریمس بلاتا ہوں اور وہ خوش دلی سے اس نام پر جواب دیتا ہے۔ سپر مارکیٹ میں وال مارٹ سے کچھ آگے ہاڈربک شاپ ہے، جہاں بارڈھیروں کتابیں قارئین کے مطالعے کے لئے پڑی رہتی ہیں۔ اسی جگہ ایک پلاسٹک کی کرسی پر کبھی کبھی انکل ریمس مجھے بیٹھا نظر آتا ہے۔ اس کی بیٹی یا بہو گروسریز کرنے جاتی ہے اور وہ یہاں بیٹھ کر کبھی کبھی کاغذی گلاس میں کافی پیتا نظر آتا ہے۔

اس روز وہ سیاہ مجسمہ مجھے دیکھ کر مسکرایا، میں اس کے قریب ہو گیا۔
 ”گڈ مارننگ“ انکل ریمس بولا۔

”گڈ مارننگ انکل ریمس۔ کیا آپ کافی پینا پسند کریں گے؟“
 ”آئی ڈونما سٹڈ بڈی۔۔۔ ون مورکپ۔“

ہم دونوں کافی شاپ کے سامنے لگی گول میزوں کی طرف چل دیئے۔ جب ہم قریب پہنچے تو ایک لمبی دم واں کالی کوئل ہمارے قریب ہی میز پر بیٹھ گئی۔ انکل ریمس نے کہا۔

”گاڈ ایسے چاہتا تھا۔۔۔“

”کیا چاہتا تھا؟۔۔۔“

”کہ انسان کبھی کسی کو خوفزدہ نہ کرے۔۔۔“

”ہاں لیکن بد قسمتی سے ہم دوسروں سے خوفزدہ ہوتے رہتے ہیں اور دوسروں کو خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔۔۔“

انکل ریمس عموماً مجھے نوک و زڈم کی کہانیاں سناتا ہے۔ وہ کچھ سوچتا گنگنا تا مسکراتا ہوا بولا۔

”سنو۔۔۔ جہاں سے میں آیا ہوں وہاں مجھے احساس نہیں تھا کہ میں نیگرو ہوں۔۔۔ کیونکہ وہاں سب کالے تھے۔۔۔“

میں کچھ شرمندہ ہو گیا، حالانکہ میں بھی سفید فام نہ تھا۔

”ہاں کچھ ایسے ہی ہے۔۔۔“

”تم جانتے ہو۔۔۔ جب آدمی احساس کمتری میں مبتلا ہو تو وہ چڑچڑا کر اکیڈ اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔“

”ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔“

”معلوم ہے یہ احساس کمتری کب پیدا ہوتا ہے؟“

”میں نے کبھی سوچا نہیں انکل ریمس“

کالی کوئل ڈبل روٹی کا بھورا منہ میں ڈال کر اڑ گئی، جاتے ہوئے وہ جیسے گالی گئی۔
کون می پینا کوئلہ

سرینا

یونا نا گولا

وائی پی ماری دیتو

سرینا

ان پی جپا

”سوچا کرو براور، سوچا کرو تمہارے مذہب میں تو سوچنے کا بڑا حکم ہے۔ یہ کوئل

کیوں وفردہ نہیں اور ہم کیوں ڈرتے رہتے ہیں۔ جب تک میں کونگو کے طاس میں تھا، مجھے کوئی احساس کمتری نہ تھا۔ جب تک مقابلہ نہ ہو۔۔۔ تم سے بہتر یا کمتر موجود نہ ہوا، احساس کمتری پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ جب نیگرو اپنے جیسوں میں تھا تو وہ ش کی نہیں تھا۔ غریب آدمی غریبی میں خوش رہتا ہے، جب تک اسے کسی امیر سے پالا نہیں پڑتا۔ میری پوتی ایملیا نے سکول چھوڑ دیا ہے۔۔۔ وہ ملاٹو۔۔۔ ہے جانتے ہو مولا کو کون ہوتے ہیں۔۔۔؟“

”نہیں۔“

”وہ لوگ جن میں سفید لوگوں کا خون بھی ہوتا ہے۔ جھونا مکمل طور پر نہ سیاہ ہوتے ہیں نہ سفید۔۔۔ میری پوتی ایملیا اب سکول نہیں جاتی۔ وہ برگرنگ میں فٹس اینڈ چپس بیچتی ہے۔۔۔“

”لیکن اس نیکول کیوں چھوڑ دیا انکل ریمس۔“

انکل ریمس کے پاس باتوں کا سٹور ہاؤس ہے۔ وہ کبھی کبھی بات کرنے سے پہلے ایک لمبی تان آئی آئی لگاتا ہے پھر ایک آدھ مصرع گا کر مخاطب کرتا ہے۔ کون فی پنیاکولم میں نے پہلی بار اسی سے سنا تھا۔ میں اس سے اس کے معنی نہ پوچھ پایا۔

”ایملیا کہتی ہے۔۔۔ سکول میں بہت سی ذہین لڑکیاں ہیں۔ گرینڈ پاوہ اتنا چمکتی ہیں کہ ان کے سامنے ایملیا چمک نہیں سکتی۔ میں تو پہلے ہی اپنی جلد پلچ کر کر کے تھک گئی ہوں۔ اب میں اور احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی۔“

”کبھی کبھی سوچتا ہوں اللہ نے یہ اتنی اونچ نیچ کیوں رکھتی ہے۔۔۔“ میں نے شکستگی سے پوچھا۔

”اس لئے بردر کہ ارتقاء ہو، تبدیلی آئے۔ انسان اپنی کوشش سے بہتر ہوتا چلا جائے۔۔۔ انسان قیامت تک پہنچ پائے۔ تمہیں پتہ ہے سب سے پہلے انسان کا گلو کے طاس میں آیا۔ اس وقت ساری دنیا میں صرف کالے تھے۔ کہیں نفرت نہ تھی، سب مل جل کر

رہتے تھے اور کوئی کسی سے کمتر نہ تھا۔ سب طرف محبت تھی اور تبدیلی کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر ایک دن ایک سیاہ جھنڈی چلتا چلتا ایک غار میں جا پہنچا۔ وہاں جھاڑیوں میں چھپا چھوٹا سا چشمہ گیزر کی طرح چل رہا تھا۔ غار میں روشنی کم تھی، لیکن کالا انسان پیاسا تھا۔ اس نے چشمے سے منہ دھویا اور سیر ہو کر پانی پی لیا۔ جب وہ غار سے باہر نکلا تو اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی۔ دیکھتا کیا ہے کہ اس کی رنگ بالکل سفید ہو چکی تھی۔ اب وہ کالے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ ایک اور نس پیدا ہو گئی تھی۔“

یکدم وہ گانے لگا۔۔۔

”آئی سنورا اینڈوائی؟“

میں ہوانا میں پیدا ہوتا ہوا

اسے ڈونگو کہتے تھے

میں کالا سیاہ تھا

اور بد قسمت بھی تھا

کیونکہ میرے والدین نہیں تھے۔۔۔

جو مجھے سیاہ ہونے کا مطلب سمجھاتے!

تھوڑی دیر ٹالالاکرتا وہ گاتا رہا پھر خود ہی کہانی کی طرف وٹ آیا۔

”سنو برور سفید آدمی کو اس کے گھر والوں نے جب دیکھا تو اسے پہچاننے سے انکار

کر دیا، اب آہستہ آہستہ سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ یا کو کے چشمے کا پانی جسم پر

ملنے سے انسان سفید ہو جاتا ہے۔۔۔ ہو لے ہو لے لوگ کھسکنے لگے۔۔۔ اور اپنے رنگ

تبدیل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اللہ کئی طریقوں سے تبدیلی لایا کرتا ہے بڑی۔۔۔

جو نہی کسی کا رنگ بدل جاتا، وہ گاؤں سے کھسک جاتا، کیونکہ اسے کالوں سے خود بخود

نفرت پیدا ہو جاتی۔۔۔“

آئی آئی آئی

یا کایا کا ... یا کایا کا

سفید فام لوگوں نے جنگلوں کے اندر کہیں اپنی بستی بسالی اور بوکیف بم ... بوکیٹ ٹم

ایک نیا Ethnic گروپ وجود میں آیا۔ یہاں سے Races پیدا ہوئیں، لیکن پھر چشمہ سوکھ گیا۔ گاڈلارڈ کی مرضی ... وہ عجیب طریقوں سے تبدیلی لاتا ہے۔ انسان کو پتہ نہیں چلتا، لیکن ہر موڑ پر تبدیلی ہے، لیکن ہماری مرضی سے نہیں گاڈلارڈ کی مرضی سے ... ہم سمجھ نہیں سکتے۔

میں بھی انکل ریمس کو ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ وہ ہنستا ہے تو چھاتی سے آرگن کے سر نکلتے ہیں۔

”سنو ایشیائی انڈر ڈوگ ... اللہ اور عورت کو سمجھنے کی کوشش کبھی نہ کرنا، مارکھا جاؤ گے۔ یہ دونوں سمجھنے کی چیزیں نہیں ہیں ... ان دونوں کا تعلق Superstition سے ہے۔ اگر تم انہیں مان لو تو فائدہ دیں گے نہ مانو ... تو تمہیں توڑ پھوڑ دیں گے۔ یہ شگون ہیں ... فل ہیں۔ مزدہ ہیں ان کے بغیر مرد کبھی راستے تلاش نہیں کر سکتا!

یہ دادی کے مرنے سپہلے کی بات ہے۔ دادی ٹمپل روڈ والے گھر میں ہم سے بچھڑی۔ اس کے سارے بال سفید، دانت پان زدہ کیسری رنگ، ہونٹے جسم مڑاڑا، آواز میں خرخر اور چال میں اب گری کہ اب گری والی کیفیت تھی، لیکن وہنی طور پر دادی چوکس تھی، اسے ہر وقت علم رہتا کہ کون کدھر ہے اور کیا کرتا ہے؟ کون سی چیز مذہب سے وابستہ ہے اور کون سی رسم و رواج سے۔ وہ الو کی سی دانائی اور بلی کی چوکس نظروں سے سارے گھر کو دیکھا کرتی، خاص کر اسے اماں سے ہمیشہ خدشہ رہتا کہ وہ کہیں پونے پوتیوں کو خراب نہ کر دے۔ اپنی خاندانی روایات سے علیحدہ کوئی نئی پیروی نہ لگا دے۔

دادی اپنی چار پائی ہمیشہ گیلری میں بچھاتی اور رات بھی وہیں کاٹتی۔ اسے خوب پتہ

تھا کون رات کو کس وقت گھر آتا ہے، لڑکیاں کب سوتی ہیں اور بہو کا دروازہ کس وقت بند ہوتا ہے؟ دن کے وقت وہ چارپائی اٹھ دیتی، پھر گیلری میں چوکی پر بسیرا کرتی۔ اس چوکی پر جائے نماز بچھا رہتا جس کا ایک کونہ تہہ کرکیداوی ابلیس کو جائے نماز پر نماز پڑھنے سے روکتی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ میں دادی کی چوکی پر بیٹھا ان سے شیخ سعدی کے نوشیران بادشاہ کی کہانی سن رہا تھا۔ ظفر بے سمجھ تھا۔ وہ گیٹ کے پاس کھیل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی چھڑی تھی۔ وہ اچکتا پھر چھڑی زور سے زمین پر مارتا۔ رکتا اور کہتا۔۔۔ ”اب آیا مزہ۔۔۔ آیا مزہ۔۔۔ بھر دیگی مجھے اڑنگی۔“

پھر دو چار قدم جلدی سیکھتا ہوا میں زقند لگاتا اور پورے زور سے زمین پر چھڑی مار کر وہی جملہ دوہراتا۔۔۔ ”اب آیا مزہ۔۔۔“

دادی نے کہانی درمیان میں چھوڑ دی اور ظفر کی راہ دیکھنے لگی۔ ظفر چھڑی سمیت گیلری کی طرف لپکا۔ اسے گیٹ سے گیلری تک آتے کچھ دیر لگی، لیکن دادی منتظر رہی۔

”ظفر ادھر آؤ۔۔۔“

ظفر بادل نخواستہ چلا آیا۔

”ماں کا اثر ہو گیا ہے نالائق نہ دادی کو سلام نہ بھائی کو۔“

”السلام علیکم۔۔۔“ منہ تھتھا کر ظفر بولا۔

”ادھر بیٹھو۔۔۔“

ظفر میں ابھی اتنی جرات نہ تھی کہ وہ بیٹھنے سے انکار کرتا۔ دادی نے اس کے ہاتھ کی

طرف اشارہ کر کے پوچھا۔۔۔ ”یہ ہاتھ میں کیا ہے؟“

”چھڑی ہے جی شہوت کی۔۔۔“

”اور تو اس چھڑی سے زمین کو کیوں مار رہا ہے۔۔۔“

”ظفر چپ رہا

”تو نے دھرتی کو کیوں پیانا لائق ...“

ظفر نے کسمسا کر کہا..... ”بس ایسے ہی جی“

”سن رہا ہے ہمایوں ... ایسے ہی ہوا میں بڑک بڑک کر زمین کو پینتا ہے کوئی جب

تک بات نہ ہو ...“

”ابھی اس نے مجھے گرایا تھا دادی جی۔“

”اس نے کیسے گرایا تجھے۔ اچھل کر آگئی تیرے سامنے بولتا؟ ہاتھ پاؤں ہیں

اس دھرتی کے کہ ٹھوکریں لگاتی پھرے تجھے“

”اونچ نیچ تھی جی مجھے نظر نہ آئی ... یہ دیکھئے میری کہنی چھل گئی ہے ساری ظفر

بول۔“

”یہ کہناں ... یہ بتا کہ چہرے پر آنکھیں ہونے کے باوجود تو اندھوں کی طرح

چلتا ہے اور پیٹ رہا ہے زمین کو ساری عمر کیا ایسے ہی بے انصاف رہنے کا ارادہ

ہے ... قصور اپنا ہوگا اور سزا دوسروں کو دے گا؟ ... لگا اس کے دو تھپڑ ہمایوں ... لگا

... لگا۔“

میں نے دادی کو جھپی ڈال کر کہا ”چلتے معاف کر دیجئے دادی ...“ مجھے ظفر کی

آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ نظر آئی۔

”معاف کر دیجئے! ... کتنا معاف کروں تم سب کو ... تمہارا دادا زندہ ہوتا تو

ساروں کو سدھ کر دیتا ... وہ رفعت کی بچی مدھو بالابنی پھرتی ہے ... الو کے پٹھے شاہد

کو نہ پڑھائی کا فکر نہ روزی مانے کا، شاعر بن رہا ہے کم بخت ... اور یہ شیطان کی

ٹوٹی اور سنو بچو اسی زمین میں دھنستا ہے آخر کو ... اس پر تو پاؤں بھی پولا پولا دھرنا

چاہئے۔ جو یہ پھل فروٹ کھاتے پھرتے ہوناں ... یہ اسی دھرتی ماں نے بھیجے ہیں۔

پرتم کو پروا ... ماں سارا دن انا رکلی میں گھسی پھرتی ہے، دیکھتی پھرتی ہے نت نئی چیزیں

... باپ کو سیکرٹریٹ ہو گیا ... تربیت کون کرے؟ نیک و بد کون سمجھائے ان بلوگٹروں کو ...؟ کون بتائے انسان کیوں آیا ہے یہاں، کیا ذمہ داری ہے اس کی؟“۔
 دادی دیر تک بستی رہی۔ میں اور ظفر گردن جھکائے پاس بیٹھے رہے۔ اٹھ جانے کی ہمت ابھی ہم میں نہیں تھی۔ دادی نے ظفر کا بازو کھینچ کر پوچھا ... ”وکھا چوٹ کہاں لگی ...“

ظفر نے چھلی ہوئی کہنی اور بازو پیش کر دیا جس سے اب ہولے ہولے لہو رسنے لگا تھا۔

”ہائے ہائے میرے حل کو تو بڑی چوٹ آگئی۔ جاہایوں روئی لے کر آ ...“
 ”ٹھیک ہے دادی ... آپ ٹھیک ہو جائے گا“ ظفر منمنایا۔
 ”ماروں“ کی چپکا بیٹھارہ۔

دادی نے زخم پر بوسہ دیا تو اس کے ہونٹوں پر تھوڑا سا لہو لگ گیا۔ پھر پتہ نہیں کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ... چوٹ لگ جائے تو روتے نہیں ظفر بیٹا ...
 ابھی تو کشمیر میں جہاد کے لئے جانا ہے ... مسلمان کا کیا کام رونے دھونے سے ...
 ہم تو جہاد والے ہیں۔ ظلم کے خلاف، نفس کے خلاف ... اللہ رسول ﷺ کے سپاہی ہیں ہم لوگ۔ ہمارا رونے سے کیا کام؟ آنسو بہانے والے کسی کا سہارا نہیں بن سکتے۔ نہ اپنا نہ کسی اور کا ... مرد ہو کر رویا نہ کر بیٹے۔“

”لیکن آپ بھی تو رو رہی ہیں دادی ...“

”میں اب روتی ہوں بچو، کمزور پڑ گئی ہوں اندر باہر ... اب مجھ سے لہو برداشت نہیں ہوتا ... پہلے ایسے نہیں تھا ... بڑا بڑا لہو بہتا دیکھا ہے میں نے قافلوں میں ...
 جا کر کر روئی لاہایوں کیا آلہسی بچے ہیں کہا مانتے ہی نہیں۔ بالکل اپنی ماں پر گئے ہیں“
 دادی نے آنسو دوپٹے میں جذب کر لئے۔

دادی کے پاس قدروں کی وراثت تھی۔ وہ اقدار، رسم و رواج، مسلک روزمرہ کی

کامن سنس کا خزانہ تھی۔ وہ اپنی وراثت تیسری پود کو منتقل کرنے کی خواہاں بھی تھی۔ مشرق میں یہ رواج عام رہا کہ ماں باپ بچوں کی پرورش میں مشغول نہیں رہتے تھے۔ ماں کو گھربا و رچی خانہ، کپڑا الٹا، صفائی ستھرائی مشغول رکھتی، باپ کفالت کی نذر رہو جاتا، لیکن گھر کے بزرگ بچوں پر کڑی نظر رکھتے۔ وہی روایت کو بچوں تک پہنچانے کے ضامن بھی تھے اور بڑا اوقات جہالت بھی ان ہی کے وساطت سے پوتے پوتیوں کو اسے نو اسیوں تک پہنچتی تھی، لیکن ان کا رعب و دبدبہ احسان اس قدر تھا کہ کوئی ان کے آگے بول نہ سنا تھا۔۔۔ یہ عجیب قسم کا چکر تھا۔ پہلے بیس سال مشرقی بچہ تعصب کو اپنے بزرگوں سے اخذ کرتا رہتا۔ یہ تعصب عموماً رسم و رواج سے مستعار لئے جاتے۔ پھر اگلے بیس سال ان تعصبات کو تجربات کی روشنی میں دیکھ، چکھ، پرکھ کر چھان پھنک کر اپنے سے علیحدہ کرنے میں بسر ہوتے۔ ان سے اگلے بیس سال نئے تعصبات تیسری پود میں منتقل کرنے کا عہد ہوتا۔ ان تعصبات کے ہمراہ پیشتر وقت وہ اقدار جو رسم و رواج پر مبنی نہ ہوتیں، بلکہ جن کی اثاث مذہب ہوتا، ان پر عملدرآمد ہوتا یا نہ ہوتا ان پر اتنا کڑا ایمان بھی نہ ہوتا، لیکن دادے کی یہ وراثت بھی آسانی سے اگلی نسل تک پہنچ جاتی۔ دادا خود ریڈ لائیٹ کا رسیا، شراب کا عاشق جوئے کا دلدادہ ہوتا، لیکن اپنے پوتے کو ان برائیوں سے روکنے کا خود کو نہ صرف مجاز ہی سمجھتا، بلکہ اصرار بھی کئے جاتا کہ من کنم شامہذ رکنید۔ یہی تربیتی ادارہ اس قدر مضبوط تھا کہ کچھ نہ کچھ چھت سے رسنے والا پانی بنیادوں میں ایمان صورت بیٹھ ہی جاتا تھا۔

بیلکونی میں بیٹھ کر دیر تک میں دادی کو یاد کرتا رہا۔ دادی کی یاد کو بھی میں کسی کے ساتھ شیشیز نہیں کر سکتا۔

میری عادت ہے میں نہ تو اپنی خوشی میں کسی کو شامل کر سکتا ہوں، نہ ہی کسی دوسرے کی رسانی میرے غم تک ہو سکتی ہے۔ اندرون صحن دل میں کسی کو تاکنے جھانکنے کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔ اس تھکائی پسندی، پوشیدگی کا میں عاشق ہوں۔ میں لیمن

ڈراپ کی طرح اندر ہی اندر خوشی کو چوستا رہتا ہوں اور غم کی چیونٹک گم کو چباتے رہنا بھی میرا محبوب مشغلہ ہے۔ دادی جب تک زندہ رہی، گیلری میں اس وجود بے معنی تھا۔ جس روز اس کی چار پائی گیلری سے اٹھا دی گئی اور وہ میز بھی غائب ہو گیا جس پر ان گنت معجون، چورن، دوائیاں پڑی رہتی تھیں، اسی دن سے دادی سارے گھر میں سرایت کر گئی۔ اماں نے سب سے زیادہ دادی کو ہتھیالیا اور آہستہ آہستہ ان ہی کا روپ دھارتی گئی، جس دادی سے ماں نے ساری عمر نفرت کی، اسی دادی کی وہ کاربن کا پی بن گئی حتیٰ کہ ان کی شکلوں میں بھی مشابہت پیدا ہو گئی ایسے کیوں ہوتا ہے۔ جس سے نفرت شدید ہو، انسان وہی کچھ بن جاتا ہے۔ دراصل انسان کا کچھ ٹھیک نہیں۔ دماغ تحقیق کی طرف لے جاتا ہے اور قلب وجدان کی طرف اور ایک تیسری سمت ایسی بھی ہے جس کا نہ تحقیق سے تعلق ہے نہ وجدان سے۔

لال بھٹک کو کی کہانی یونیورسل ہے۔۔۔ مجھے ایک مرتبہ گرمز فیری نیل میں بھی اسے پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ کہانی کچھ اس طور پر تھی۔

کسی گاؤں میں ایک سادہ لوح کسان رہتا تھا۔ اس کی غریبی کا یہ عالم تھا کہ بارہا فاقوں پر گزر بسر ہوتی۔ تھک ہار کر اس نے اپنے درخت کا ٹٹا شروع کر دیئے۔ انکی لکڑی اپنے ریڑھ سے لاد لیتا اور شہر میں صدائیں لگاتا۔ ایک گلی میں ڈاکٹر ”سب جانوں“ کا کلینک تھا پیسے کی ریلی پیل تھی۔ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ایک روز کسان بینڈے کا ادھر سے گزر ہوا۔ آواز لگائی۔۔۔ ”لکڑی لے لو جی گیلی بھی جلے، سوکھی تو جلے ہی جلے۔۔۔“ ڈاکٹر کا اصلی نام تو شاید کسی کو معلوم نہ تھا۔ سبھی اسے جانوں پکارتے تھے۔ ڈاکٹر نے صداسنی تو پکارا۔۔۔ ”اوئے بینڈے ادھر آ۔۔۔“ جو تانتا راکر بینڈا اندر پہنچا۔ اتفاق سے یہ وقت مریضوں کا نہ تھا۔ ڈاکٹر سب جانوں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ باتوں کا شوقین تھا۔ بینڈے کو بھی دسترخوان پر دعوت دی اور گاؤں کے حالات پوچھنے لگا۔ بینڈے کو بھی دسترخوان پر دعوت دی اور گاؤں کے حالات پوچھنے

گا۔ بینڈے نے بھانت بھانت کے اخوان نعمت سجے دیکھے تو سوچنے لگا کیا میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا؟

پیٹ بھر ٹھونسنے کے بعد بینڈے نے ڈاکٹر سب جانوں سے پوچھا۔۔۔ ”کیا میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔۔۔۔۔“

”لو یہ کیا مشکل ہے۔۔۔ فوراً بن سکتے ہو؟“ سب جانوں بولا۔
”کیسے؟“

”ایسے کرو اپنا ریڈ ہاسٹو بیچ دو۔ اچھے کپڑے سلاؤ میرے جیسے۔۔۔ پھر ایک بورڈ پر ڈاکٹر لال بھکھو لکھو او اور یہ تختی گھر کے سامنے لٹا دو۔۔۔“

ابھی بینڈے کو ڈاکٹر بنے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی وہ گاؤں کے زمین دار کے گھر چوری ہو گئی۔ کس نے رائے دی کہ آپ ڈاکٹر لال بھکھو سے مشورہ کر لیں۔ وہ بلا کا سیانا ہے۔ فیڈول لارڈ بگھی میں سوار بینڈے پاس پہنچا اور سوال کیا۔۔۔ ”کیوں بھی کیا تم ہی ڈاکٹر لال بھکھو ہو۔۔۔۔۔“
”بالکل“ ڈاکٹر بولا۔

”تو میرے ساتھ چلو اور مخبری کرو کہ اصلی چور کونہ ہے۔۔۔۔۔“
”ضرور چلوں گا، لیکن میری بیوی بھی ساتھ چلے گی۔ میں رجموں کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔“

اب یہ تینوں حویلی میں پہنچے۔ اتفاق سے اس وقت دسترخوان بچھا تھا، خدمت گار مامور تھے۔ زمین دار بولا۔۔۔ ”کھانا لاؤ دیکھتے نہیں مہمان آئے ہیں۔“

جب پہلا خدمت گار بھنے ہوئے بیڑے لے کر آیا تو ڈاکٹر لال بھکھو نے اپنی بیوی سے کہا۔۔۔۔۔ ”یہ پہلا ہے۔۔۔۔۔“

ملازم خوفزدہ ہو گیا، کیونکہ ہی پہلا چور تھا۔ اب نے اس اندر جانے سے گریز کیا اور دوسرے نوکر کو تنگے کباب پکڑا کر اندر روانہ کیا۔

”لو یہ دوسرا ہوا.....“ ڈاکٹر نے جموں سے کہا۔

جب تیسرا تندوری روٹیاں لے کر وارد ہوا تو ڈاکٹر نیر از داری سے کہا ...
”یہ تیرا ہوا ...“ سردار صاحب کو شبہ ہوا کہ ڈاکٹر جھکوسب جانتا ہے۔

خدمت گار نے اشرے سے ڈاکٹر کو باہر بلایا اور تینوں ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولے ... ”سردار اب تو آپ جان ہی گئے ہیں کہ ہم تینوں نے مال چرا یا ہے۔ بس کچھ ایسا کریں کہ ہماری جان بخشی ہو جائے ... ہم آپ کو خوش کر دیں گے۔“

ڈاکٹر نے کہا ... ”اگر بتا دو کہ مال کہاں ہے تو میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ انہوں نے وہ تندور دکھایا جس میں سونے کی اشرفیاں چھپا رکھی تھیں۔ واپس آ کر ڈاکٹر لال جھکوس نے اپنا قاعدہ کھولا جسے وہ ابھی پڑھنا سیکھ رہا تھا۔ اسے کھول کر پڑھنے لگا ... ”اب باہر آ جا ... کچھ نہ سوچ باہر آ جا ...“

چوتھا چور پردے کے پیچھے تھا۔ ہاتھ باندھ کر ڈاکٹر کے قدموں میں گر گیا ... ”آقا آپ اترا یا می ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ ہمیں معافی دلوائیں دیں ...“

ڈاکٹر نے اس شرط پر مال واپس کیا کہ خدمت گاروں کو کچھ نہ کہا جائے گا۔ سنا ہے جب زمین دار کو تندور سے اپنی دولت مل گئی تو اس نے خوش ہو کر ڈاکٹر جھکوس کو مال مال کر دیا۔ ادھر خدمت گاروں نے بھی حسب وعدہ بینڈے کی خدمت کی اور اس طرح جناب بینڈا صاحب گاؤں کے امیر ترین وی آئی پی بن گئے ...

اصغری کے ساتھ میں نے لال جھکوس جیسی زندگی بسر کی۔ اس کے ساتھ میری ہراٹھی سیدھی پڑتی رہی۔ وہ مجھے ہر معاملے میں درست ہی سمجھتی تھی۔ میری بیوی اصغری اچھی عورت تھی، اچھائی عورت کا سب سے بڑا وصف ہوا کرتا تھا۔ اس کی عادتیں، سوچ، رہنا سہنا، مذہب سے وابستگی سب مڈل کلاس ہوا کرتی تھیں۔ اس نے کبھی چاچا صمد کی طرح کسی کو شک کرنے کے متعلق نہ سوچا تھا۔ شادی ہی ایک ایسا خواب تھا، جو اسے

گڑیاں کھیلتے ہوئے ملا اور یہی ایک خواب تھا، جس نے اس کی سائیکی پر کوئی بوجھ نہ ڈالا۔ آپ اسے زندگی سے جی ایک ہی پگڈنڈی کا بدرنگ مسافر کہہ سکتے ہیں۔ میں اسے ایک آرام دہ ساتھی سمجھتا تھا۔ مجھے خود علم نہیں ہوسکا کہ محبت نہ ہو سکنے کے باوجود ہم دونوں کتنی سہولت سے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ اس نے اپنی فکروں کا بوجھ مجھ پر کبھی نہ ڈالا۔ میں کیا سوچتا رہتا تھا۔ اس کا بار میں نے اس کے جھکے جھکے کندھوں پر نہیں رکھا۔ اصغری میری چچا زاد بہن تھی، پھر وہ میری بیوی منگنی آخر کو وہ میرے دونوں بچوں کی صرف ماں رہ گئی۔ ہم میں عام میاں بیوی جیسے جھڑے، جھج جھج نہیں تھی۔ نہ ہی ہم حاسد عاشقوں کی طرح رقیبوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اسے شاید اقبال والے قصے کا علم تھا، لیکن اس نے مجھ سے کبھی اس معاشقے کی تفصیلات نہ پوچھیں۔ میں جانتا تھا کہ مجھ سے پہلے اس کی منگنی شجاع بھائی سے ہوئی تھی اور یہ منگنی پورے چار سال رہ کر سکتی سکتی ٹوٹی تھی۔

میں دل میں اپنے ماموں زاد شجاع بھائی کو پسند کرتا تھا اور جب یہ منگنی ہوئی تھی تو میرا خیال تھا کہ اس خوبصورت گریک دیوتا کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ حسین و جمیل ایکٹر نما شجاع بھائی کے لئے اصغری جیسی لڑکی ناکافی، ناموزوں اور ماں باپ کی نالائق کا ثبوت تھا بہر کیف شجاع بھائی ہمارے گھر آتے رہے، میں نے کبھی اصغری کو ان میں دلچسپی لیتے نہ دیکھا۔ یہ بھی طرفہ تماشہ ہے کہ شجاع بھائی کو دیکھ کر نہ مجھ میں حسد جاگا، نہ ہی اصغری کے لئے کسی قسم کے شک نے میرے دل میں جگہ پائی۔ اصغری اتنی اہم نہیں تھی کہ میں اس کے ماضی سے بھی حسد کرتا رہتا۔ اصغری سانبان سی عورت تھی۔ ہر وقت سایہ کرنے، دینے، ہونے کے مرحلوں میں رہتی۔ گھر پہنچ کر میں بھی بچوں کی طرح آزاد ہو جاتا، آرام دہ بیوی مجھے اسیری کا محتاج بنا دیتی، میں اسی محتاجی کا دی ہو گیا جو اچھی عورت پیدا کر دیا کرتی ہے۔ جب کبھی لمبی پارٹنر شپ چلانی ہو تو خود انحصاری کام نہیں آتی، بلکہ آپ کا انحصار ساتھی پر ہوا کرتا ہے۔ وہی

ایسے رشتے کو آگے چلاتا ہے۔ جب بھی آپ کسی شخص پر مالی، جذباتی، ذہنی رفاقت جیسی چیزوں کے لئے دست نگر ہوتے ہیں ایک اچھے رابطے میں ضرور بھرپور پنپتی آ جاتی ہے۔ مغرب میں خود انحصاری کے حصول نیا آزادی کی طلب نے شادی جیسے مضبوط نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ اب جنس، روزی، تفریح، رفاقت ذاتی مسئلہ ہے۔ کسی ایک کنوئیں سیپانی پینے کا عمل نہیں اور اتنی خود مختاری حاصل ہونے کے بعد کسی ایک شخص سے بندھے رہنا دست نگر ہونا بہت بڑا وبال بن جاتا ہے۔۔۔ اصغری اور مجھ میں کئی ضرورتیں سانجھی تھیں۔ میں بری طرح اس سایہ دار درخت کی چھاؤں کا عادی تھا۔ وہ اور اس کے بچے میری کثالت کے بغیر بہت ساری مشکلوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔۔۔ اسی لئے زیادہ اڑچنوں کے بغیر ہماری پارٹنرشپ نبھ گئی ہم ایک دوسرے کی ضرورت بنے رہے۔

ایک رات اس یعشاء کی نماز پڑھی۔ دو تین مرتبہ غسل خانے آئی گئی پھر گویا وہ اپنے کوچ کے متعلق یقین کی حد کو پہنچ گئی۔ میں حیران رہ گیا۔
 ”کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ طبیعت بہت خراب ہے تو ہسپتال چلتے ہیں۔“
 ”نہیں اس کا وقت نہیں ہے۔ آپ اگر پڑھنا چاہیں تو سورہ یسین پڑھیں بیٹھ کر۔۔۔“

میں نے ہسپتال جانے کی تیاری شروع کر دی۔
 ”وقت نہیں ہے جی۔ آپ مہربانی کر کے سورہ یسین پڑھیں۔۔۔“
 اس کے بعد اس نے جہانگیر کی پرورش کے متعلق وصیت کی، ارجمند کے متعلق شاید اسے یقین تھا کہ اس کی تربیت وہ کر چکی ہے اور اب باپ اس کے کام نہیں آ سکتا۔
 میں نے اصغری کا سوگ کم اور اپنی آرام دہ روٹین کے ٹوٹ جانے کا غم زیادہ کیا۔
 مجھ پر جلد ہی یہ بات کھلی کہ اصغری زندگی تھی، اس کا بہاؤ مسلسل تھا اور اقبال تازہ موسموں کی مانند تھی کہ بدلتے رہے، آتے جاتے رہے، لیکن کبھی بھولے نہیں۔۔۔ ان

کے سحر سے میں کبھی آزاد نہ ہو سکا ... میں نے اپنی سوچ پر اصغری کا کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ وہ اللہ کی نعمتوں میں سے تھی جیسے میں نے اللہ کی اور کسی نعمت کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا، ایسے ہی اصغری کا شکریہ ادا کئے بغیر اسے بھی دفنا دیا۔ اس ہیلکونی میں پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ کر سامنے گرید بڑھے کو سگریٹ پیتے دیکھتا ہوا سوچتا ہوں۔ میں اس دنیا میں کسی کام کے لئے آیا تھا؟ کیا میں اپنی معنویت سے بے خبر ہی چلا جاؤں گا؟

کیا میں ناکر وہ حسرتوں اور گنہوں پر آنسو بہانے کے لئے اتنے سال یہاں رکا رہا؟ کیا واقعی بابا آدم کے اولین گناہ کی پاداش میں میری زندگی پر انصاف میں گزرنی چاہئے؟ کیا کہیں اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود میں ادھورا ہوں اور اقبال کی تلاش اصل میں اسی ادھورے پن کو مکمل کرنے کی کوشش ہے حقیقت کے ہوئے خیال کی تلاش؟

کیا انسان اس ادھورے پن کے احساس سے کیوں اور کیسے میں بدل جاتا ہے؟ کیا یہ ادھورا پن بیرونی ہے یا اندر سے انسان خالی محسوس کرتا ہے، تڑپتا ہے، مضطرب ہوتا ہے، پھر بھی مکمل نہیں ہو پاتا۔ جس طرح چھپکلی کی دم کٹ کر تڑپتی رہتی ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بے قراری کیوں ہے؟

کیا خوشی کی تلاش سراب کا سفر تو نہیں؟ اصلی خوشی انسان کے لئے عنقا ہی نہ ہو؟ سوچتا ہوں جب تک انسان غریب ہوتا ہے، اسے جسمانی دکھ چھٹے رہتے ہیں۔ ناداری کا حملہ جسم پر ہوتا ہے، لیکن جونہی وہ دولت مند ہو کر مام ما حولیاتی سہولتیں حاصل کر لیتا ہے، جسم آسودگی کے ایسے لیول پر آ جاتا ہے جہاں اسے اس کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کسی قسم کی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ ایسے میں جب جسم کی تمام ضرورتیں پور ہو چکتی ہیں، روح انگڑانی لے کر بیدار ہوتی ہے اور اپنے مطالبات پیش کر دیتی ہے، اب غیر مرئی ضرورتیں، نظریات، ذہنی نفسیاتی اڑچنیس، سوال و رسوال،

خیال درخیال، سوچ کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے، یہ وہ وقت ہوا کرتا ہے جب جسم اور اس کی ضروریات عموماً شانت ہوا کرتی ہیں، لیکن روح کی بیزاریاں بڑھنے لگتی ایسے میں اصلی مشکلیں کم اور خیالی مسائل زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اب ٹینشن، فرسٹریشن، Anxiety کا دور شروع ہوتا ہے۔ انسان کی روح، نفسیات، ذہن بے تاب رہنے لگتا ہے۔ اب پراگندگی کا حملہ باہر سے نہیں ہوتا، اندر سیٹھم نصیب انسان آرام وہ زندگی بسر کرتا ہوا مثل آنسو سد اُگرنے پر آمادہ رہتا ہے۔

جب قیام پاکستان کے بعد ہم لاہور پہنچے تو ہمارے جیتے جاگتے مسائل تھے۔ روٹی پانی رہائش کا جھگڑا تھا۔ بچوں کی تعلیم، شادی، روزمرہ کے اخراجات ہر کمرے میں مسئلہ ڈگدگی بجاتے پھرتے تھے۔ لیکن اماں، ابا، دادی، دادا اندر سے شانت تھے۔ ان کے بھیتر ٹھنڈے نوارے چلتے تھے۔ وہ خوش تھے کہ انہوں نے پاکستان پالیا۔

پھر آہستہ آہستہ وہ مسائل ختم ہوتے چلے گئے۔ لکشمی دیوی نے میں اپنا پجاری بنالیا۔ اس کی سینا نے باہر کے تمام محاصرہ داروں کو مار بھگایا، لیکن پھر اندر کہیں سے ٹروجن ہارس آموجود ہوا۔ اس میں سے ایک اور طرح کی فوج نے سر نکالا اور ہم سب کو آہوں، سسکیوں، یادوں اور نا کردہ حسرتوں کے حوالے کر دیا۔ اب ہم ناداری کے ہاتھوں نہیں پڑ رہے تھے، بلکہ سب کچھ پا پھنسنے کے بعد کھولے پن کا شکار تھے۔ ہولے ہولے منفی جذباتوں کی گرفت میں آکر ہم غم آشنا ہو گئے۔ حسد، نفرت، حرص، نمائش، مقابله، ان گنت مشکلات کا اندر ہی سے سامنا تھا۔ قعر دریا میں طوفان موجزن تھا۔ روئے دریا بالکل ساکن تھا۔ میں نے بھی ذاتی اذیت کے سنے اقبال کے خواب کو بڑے رنگ دیئے تھے۔ اسی خود ساختہ مسئلے نے مجھے خوب نچوڑا تھا، حالانکہ حقیقت میں مسئلہ موجود تک نہ تھا۔

سو چتا رہتا ہوں کہ اس دارالمجن سے نکل کر ہمیں کہاں جانا ہے اور غم کی کون سی نئی شکل سے نبرد آزما ہونا ہے؟ کیا خوشی کے لئے سرگرداں رہنا ہی بنی نوع انسان کی اصل

یہی وہ دنیا میں قدم دھرتا ہے تو روتا ہے، جب وہ رخصت چاہتا ہے تو لوگ روتے ہیں ان دو وقفوں کے درمیان اسی رونے سے گریزاں وہ عرصہ حیات کو لغو اور بے معنی خوشی کی تلاش میں گزار دیتا ہے۔ کیا غم سے لڑنے بھڑنے، نبرد آزمائی کرنے یا غم سے خوشی اور خوشی سے غم کی جانب شٹل کاک کی طرح مارے جانے کا نام زندگی ہے؟ کبھی غم اس قدر دیدہ ہوتا ہے کہ انسان لرزے کے بخار میں جکڑا جاتا ہے۔ کبھی حزن و ملال شدید نہیں ہوتا، بلکہ نناوے ڈگری کی حرارت بن کر انسان اس میں پھنکتا رہتا ہے۔ اسے لگتا ہے زندگی کا علاج سوائے مرگ ناگہانی کے اور چھ نہیں۔ غم آنسو میں ڈوبا ہو کہ سسکی صورت لبوں پر رہے، کپڑے پھاڑ کر نکل جانے کو جی چاہے یا جائے نماز پر سجدے سے اٹھتے نہ بنے۔ غم کو بہر صورت جس زاویے، رخ، سمت سے دیکھو، انسان کی مجبوری کا نام ہے۔ حقیقی غریبی اسے جنم دے یا تمول کید باؤ سے مرزہ پیدا ہو۔ انسان غم کی گرفت سے کبھی نہیں نکلتا۔۔۔ خوشی محض تکان اتارنے کا وقفہ ہے اور ماندگی کے اس وقفے سے تازہ دم ہو کر انسان پھر غم کی تلاش میں بگولا بن کر کہیں گرتا کہیں گھومتا کہیں سرپٹ بھاگتا زندگی گزارتا رہتا ہے۔

آج کے انسان نے دفاع غم کے لئے ان گنت خوشیاں بنالی ہیں۔ جس طرح وہ صحت کے لئے ادویات ایجاد کرتا چلا جاتا ہے، ایسے ہی وہ غم سے نپٹنے کے لئے میڈیا، بازار، ہوٹل، سفر کو استعمال کر رہا ہے۔ خوشیوں کا بازار پھیلا ہے، وہ ان میں اپنے مطلب کی خوشی تلاش کرتا رہتا ہے، لیکن پھر بھی خوشی دیر پا نہیں ہوتی۔۔۔ اسے بھی رنگ برنگی ایلو پیٹھک گولیوں کی طرح بار بار استعمال کرنا پڑتا ہے۔ آنسوؤں کا رنگ کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ حادثہ، واقعہ، حالات بدل جائیں، لیکن اندر عموماً برسات یک رنگ ہوتی ہے۔ غریبی کے دکھ، محرومی اور عزت نفس کی کمی کے باعث بے دم کرتے ہیں۔ امیری کے اپنے پرسوز مراحل ہیں۔ ہجر کا غم اور طور کا ہے اور وصل میں موج محیط

آب والا معاملہ پیش آتا ہے۔ کچھ خواب پریشان بن کر اقبال کی طرح ستاتے ہیں۔ کچھ اصفری کی طرح جالے بن کر جا بجا لٹک جاتے ہیں۔ شاید مشیت چاہتی ہے کہ انسان چوٹی سے گرے اور کوئے دار پتھر کی طرح رگڑ کھاتا ہوا نیچے پہنچے، اڑھکتا جائے۔ اس کے ساریکونے چوٹیاں گھس جائیں اور وہ ایک خوبصورت، چمکدار مدور پتھر میں بدل جائے جو ساحلوں پر چمکتی دھوپ میں پرسکون ابدی لہروں کا گیت سنا کرتے ہیں۔

زندگی تو دروپدی کی ساڑھی ہے۔

دروپدی پانچ پاؤں اور اجاؤں کی واحد پتی تھی۔ یدھشٹر، ارجن، بھیم، نکل سہدیو کی پیاری راج دلاری۔۔۔ جب مہاراج ادھیراج یدھشٹر نے جوئے میں دوشاشن کے ساتھ بازی لگائی اور دروپدی کو ہار دیا، تو سارا دربار چپ ہو گیا کہ جانے اب کیا ماجرا ہو۔ دکھئے دوشاشن کی جیت کیا رنگ لائے؟ دوشاشن سنگھاسن سے اترا۔ دروپدی مارے شرم کے سر جھکائے بازوؤں کے ساتھ سینہ ڈھانپے تصویرِ ندامت بچ دربار کھڑی تھی۔ دوشاشن میں سو ہاتھیوں کا کس بل تھا۔ تکبر سے اینٹھ کر آگے بڑھا اور چاہا کہ سر دربار دروپدی کی ساڑھی اتار دے۔۔۔۔۔

اب تو دروپدی چوائی۔۔۔ ”کہاں ہو یدھشٹر، ارجن، بھیم، نکل سہدیو۔ میں لاج کی ماری پکارتی ہوں۔ تم سن کر جواب نہیں دیتے؟“

ادھر دوشاشن نیپلو کھینچا تو دروپدی چیخنی۔۔۔ ”اے بھگوان میں ان دشت لوگوں کی اتنی چاری سے پریشان نہیں۔ دکھ تو اس بات پر ہے کہ میرے تو پانچ پتی ایسے ہیں کہ جن سے موت بھی بھاگتی ہے۔ وہ میری لاج جاتے دیکھ رہے ہیں اور چپ، ہیں۔۔۔

بھیشم تپامہ سمیت سارے بزرگ راجہ دھرتراشٹ جیسے سر نے بھی مون سادھ لی

۔۔۔ اب مہاراج کرشن مرلی دھر آپ ہی لاج بچائیے۔۔۔“

سننے ہیں اسی وقت دروپدی کے تن سے رنگ برنگی ساڑھی کا کپڑا نکلتا چلا آیا۔ لال،

نیلہ، پیلا سرکاسنی سارا دربار ساڑھی کے کپڑے سے بھر گیا۔ دو شاشن کے ہاتھ شکل ہو گئے، لیکن مہاراج کرشن نے دروپدی کی بنتی سن لی اور اسے بے حیائی کے حوالے نہ کیا ایسے ہی سچے پکارنے والے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹے۔ ابدی سکون کو چاہنے والے یہاں وہاں ہر مقام پر اسے حاصل کر ہی جیتے ہیں۔ انہیں زندگی میں ہی نروان، سکون، فلاح حاصل ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں ایسے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں۔

ہم دونوں ناشتہ کرنے ڈائیننگ ٹیبل پر بیٹھے ہیں۔ ابھی ابھی ڈش واشر بند ہوا ہے اور یکدم کمرے میں خاموشی چھا گئی ہے۔ سامنیوالے بڈاک میں پھر سے آگ کے خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ شاید باورچی خانے میں پراٹھے پک رہے ہوں یا کوئی ہانڈی جل گئی ہو۔ کبھی کبھی خطرے کی گھنٹی اسی طرح لوگوں کو محتاط کرتی رہتی ہے۔ اس لئے بھی لوگ گھر سے باہر ہی سگریٹ نوشی کرتے ہیں، کیونکہ زیادہ تر گھر لکڑی سے بنے ہیں۔

ارجمند نے سیاہ جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔ جب بھی گردن موڑتی یا کچھ اٹھاتی ہے اس کی پونی ٹیل ہلتی رہتی ہے۔ اس کے سامنے بغیر دودھ والی Espresso کافی کی پیالی اور بیگل ہے۔ امریکن عام طور پر اس سخت بند کانا ناشتہ پسند کرتے ہیں یہ لوگ دن میں کئی مرتبہ بیگل اور Cereals کھاتے ہیں۔ ان دونوں کی تیاری میں وقت نہیں لگتا۔ بچے بھی کارن فلیکس ہینی فلیکس اور قسم قسم کے Cereals کو چباتے پھرتے ہیں۔ فاسٹ فوڈز پر امریکی زندہ رہتے ہیں۔ میکڈونلڈ، کے ایف سی، کنگ برگر اور ایسی ہی کئی فوڈ Chains آپ کو جگہ جگہ نظر آئیں گی۔ جو ہر لمحہ ورک اوہولک کو رجھانے اور موٹا بنانے کا کام کرتی ہیں۔ کام کرنے والے کے پاس پکانے کا وقت نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ فاسٹ کھانے ہی کھا سکتا ہے۔

امریکہ بھی ہر ملک کی طرح ہر انسان کی مانند تضادات کا گھر ہے۔ ہاں آرام بھی بہت اور کمفٹیں بھی ان گنت۔ مونا پا بھی ہاتھی جیسا اور دبے پن کی خواہش میں بھٹکنے والے بھی ان گنت۔ جو کنگ کرنے والے Eating Disorders کے کلینکوں پر جانے والے، سلمنگ پاررز میں دھکے کھانے والے بھی بے شمار۔ ادھر سگریٹ کو سرجن جنرل منع کرنے میں شیر، ادھر سگریٹ انڈسٹری کے اشتہار بے شمار، ہر موڑ پر تضاد۔۔۔ اندر باہر تضادات اور تضاد میں گھرا ہوا لحوہ گھلتا گھلاتا انسان۔

”ابو آج میں نے آپ کے سنے شامی کباب بنا کر فریز کر دیئے ہیں بالکل امی کی طرح سبز مرچ اور پیار سے بھر کر“۔۔۔ امی کا نام لے کر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ کچھ ناموں پر موت نے خاموشی کا حجاب ڈال دیا ہے۔ سوچتا ہوں، ماضی کے لوگ، واقعات، یادیں، ماضی کی پراسرار گلیاں ہیں۔ ہم انہیں بھولنا بھی چاہیں۔ سرد آہیں، مندی آنکھیں، رکی رندھی آواز، روکے ہوئے آنسوؤں سے بندھ بھی باندھیں، لیکن یہ یادیں ہمیشہ ہمارے تعاقب میں ہو لیتی ہیں۔ جیسے اندھیرے میں چور کے پیچھے کوئی پولیس چل رہا ہو۔ مجھے ایک اور راجہ مندی ماضی میں مجبور کھڑی نظر آتی ہے۔ خود امریکہ کے ہاتھوں فیصلے کرنے والی اور مجھ پر اپنی مجبوری سے دباؤ ڈالنے والی۔

شاید میں کسی کو سمجھا نہیں سکتا کہ باپ کے لئے بیٹی کیا چیز ہے۔ وہ اس رشتے میں کس درجہ مجبور ہوتا ہے۔ بیٹی کی تمام مشکلات باپ کے لئے کسی محدب شیشہ سے گزر کر اتنی بڑی ہو جاتی ہیں کہ پھر باپ ان سے مقابلہ تو کرتا رہتا ہے، لیکن ہمیشہ بیٹی کے لئے خوفزدہ ہی رہتا ہے۔ بیٹی گھر سے وداع کر کے ماں باپ کبھی اس کے وجود سے خاں نہیں ہوتے۔ بیٹا ساتھ بھی رہے، ایک گھر میں ایک ہی دروازے سے آتا جاتا رہے، شادی کے بعد ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے پچھڑ جاتا ہے۔ جب ارجمند نے سر جھکا کر کہا تھا۔۔۔ ”آپ کو معلوم نہیں اب۔ میری زندگی امریکہ میں کتنی مشکل ہے۔ میرا شوہر مجھے نہیں سمجھتا۔ میں پوری کوشش کرتی ہوں، لیکن وہ مجھ میں۔۔۔ میرے وجود

میں ... میری ذات میں رتی بھر دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہمارے گھروں میں مرد کو گھریلو کاموں میں دلچسپی لینا سکھایا ہی نہیں جاتا ... وہاں ... بڑی مشکل ہے ابا جی۔ بدل کو میری مدد کرنی چاہئے، لیکن نہیں کرتا ... میں ماؤں بھی اور گھر بھی رکھوں ... بچے بھی پالوں ... ارجمند کیا کیا کرے ابا جی ... کیا کچھ کرے؟“

میں آپ کو کسی تسلسل یا توازن سے کوئی کہانی سنانا نہیں چاہتا ... بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی جھکیں ہیں جو وقت بے وقت مجھے ستایا کرتی ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ جہانگیر کے ساتھ میں امریکہ نہیں گیا۔ ہوستا ہے اس میں ساری زندگی کے باوجود کمبیں اندر ہی اندر خوف بھی ہو۔ شاہدہ Feminist تھی۔ وہ عورتوں کی آزادی کی اس حد تک متمنی تھی کہ اس کے دل سے وائے اپنے ہر کس و نا کس کی زندگی، عزت اور خوشی محو ہو چکی تھی۔

میری بیٹی ارجمند بھی آزادی نسواں کی ویسی ہی غلبہ دار تھی ... وہ بھی جب مجھے گھر سے اکھڑنے اور امریکہ میری پیوند لگانے کے درپے ہوئی تو اس کی ساری منطق شاہدہ جیسی تھی۔ وہ اپنے ڈاکٹر شوہر کے خلاف ویسے ہی پٹ سیاپا میں مبتلا تھی جیسا شاہدہ نے اپنے گھر والوں میں جہانگیر کے خلاف کیا ہوگا، لیکن بیٹی کے لئے باپ کا دل مختلف ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ فرد اور قوم جب کچھ مان لیتی ہے تو پھر اس کے رد عمل انصاف پر مبنی نہیں رہتے۔ وہ اپنے نظریے اور عمل کے لئے ایسے ایسے جواز ایجاد کرتی ہے جو سرے سے بے انصافی پر مبنی ہوتے ہیں۔ ارجمند کے معاملے میں میری ہمدردی، محبت اور مدد کی خواہش سرخ تھی۔ تلچٹ میں کیا تھا، اس کی مجھے خبر نہ تھی۔

”آپ کو معلوم نہیں ابا جی! ڈاکٹر صاحب کتنے پتھر دل ہیں۔ ان کے پاس تو میرے لئے کوئی وقت ہی نہیں ہوتا۔ ہسپتال سے آکر سیدھا ٹیلی ویژن فٹ بال، فٹ بال، فٹ بال ... پھر کھانا پینا اور کھٹ بسرا ... صبح شام وہی روٹین ... میرا تو وہ

لوش ہی نہیں لیتے سرے سے۔“

”تیلی ویژن پر کیا دیکھتا ہے۔“

”فٹ بال میچ، پہلو بازی کے ونگل اور سائنس فکشن“

”تم بھی پاس بیٹھ کر تیلی ویژن دیکھ لیا کرو۔“

”مجھے ایسے پروگراموں میں کوئی دلچسپی نہیں آتا۔۔۔ مجھے کشتی دیکھ کر تے آتی ہے“

”اور فٹ بال میچ۔۔۔؟“

”اس میں کیا پڑا ہے، پھر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا اب کچھ ہاؤس ورک کرنا

ہوتا ہے۔ بچوں کو ہوم ورک کرانا پڑتا ہے۔ ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں کام کر کر کر کے۔“

”تمہارے شو ہر کی معقول آمدنی ہے، نوکری چھوڑ دو اور گھر بیٹھو آرام سے“

”اور سارا دن کیا کروں کھیاں ماروں۔۔۔ انتظار کروں شو ہر کا۔۔۔ بچوں کا“

میں نے کہنا چاہا کہ یہ دونوں مشغلے ہڈیاں تڑوانے سے بہتر ہیں۔ پھر کام کارڈی

رونا بھی ختم ہو جائے گا ہاؤس ورک سے دل لگا رہے ہوگا، لیکن بیٹی کے معاملے میں

باپ انصاف کی طرف نہیں بیٹی کی محبت کا طرف دار ہوتا ہے۔ اس نے دو چار بار اپنے

شو ہر کے خلاف محاذ آرائی کی۔ میں نے ٹکٹ بنوایا اور امریکہ چلا آیا۔

اس کے بہت بعد مجھے علم ہوا کہ ڈاکٹر کی داستان بھی جہانگیر سے کچھ کم ناخوش گوار

نہیں تھی اور ارجمند بھی اپنی طرز کی شاہدہ ہی تھی، لیکن اس گاہی کے باوجود میرا دل

ارجمند ہی کے سنے پریشان رہتا۔ مجھے شاہدہ پر کبھی ترس نہ آیا۔ میرے دل میں

ڈاکٹر بیٹے کے لئے کئی ہمدردی نہ جاگی۔۔۔

شاید اسی لئے تفکر کا حکم آیا، جذبات کی رو میں بہہ کر تو میں اور افراد کبھی انصاف نہیں

کر پاتیں، ان کی سوچ ہمیشہ نیڑھ اور تعصب سے بھری ہوتی ہے۔

فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ ہنگل رکھ کر فون سنتی ہے۔ پھر لوٹ کر کہتی ہے۔۔۔

”یہ تو حال ہے بال کا۔“

میں ناشتہ کر رہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے۔ میرے نواسے جمشید اور قیصر بڑے شوق سے بیگل کھاتے ہیں۔ وہ حلوہ پوری، پرائٹھا انڈہ کھانے کی لذت سے نا آشنا ہیں۔

”کیوں کیا ہوا بلال کو۔۔۔“

”جہاں کار پارک کی تھی۔ وہاں سے ہسپتال تک جاتے جاتے سارے بھیگ گئے۔“

”بیچارہ۔۔۔“

”بیچارہ نہیں ایڈیٹ۔۔۔ انسان کو اتنا تو پتہ ہونا چاہئے کہ صبح کام پر جاتے وقت چھتری ساتھ رکھنی ہے۔۔۔ بے دھیانے اس قدر ہیں کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا۔ امریکہ کا موسم کدھر جا رہا ہے۔ اتنے سال یہاں رہنے کے باوجود ابھی تک نہیں جانتا کہ Valentine Day کس طرح منایا جاتا ہے۔ گرومز لینے جائے گا تو ایسی ایسی چیزیں اٹھالائے گا جن کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ سب کچھ بھول جائے گا جن کی فہرست بنا کر دی تھی۔ کبھی ہماری شادی کی Anniversary یاد نہیں رہتی۔ پاگل پرانے مریضوں کو پپی کرسمس کے کارڈ بھیجنا کبھی نہیں بھولا اور گھر والوں کا پتہ ہی نہیں کہ ان کی برتھ ڈے کب ہوتی ہے۔۔۔ پوچھیں ابو۔ پوچھیں کبھی بلال سے جمشید پرپ میں ہے کہ کلاس ون میں۔ بتا نہیں سکیں گے آپ کو۔ میری سالگرہ کو تو چو لہے میں پھینکیں کبھی یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ بچوں کا جنم دن کون سا ہے۔۔۔“

ارجمند بولتی چلی گئی اور میں بیگل پر مکھن جیم لگاتا رہا۔

ارجمند جس طرح بول رہی تھی لگتا تھا کہ وہ اور بلال ازلی دشمن ہیں۔

میں نے توے پر ٹھنڈے چھینے پھینکنے کے انداز میں پوچھا۔۔۔ ”کیوں بھی بدل

اچھا ڈاکٹر ہے۔۔۔ ہناں“

کچھ دیر وہ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔۔۔ ”ہاں ہے شاید۔۔۔ ہسپتال والے تعریف

کرتے ہیں“

”پھر تمہارے لئے کیا یہ کافی نہیں؟ ... وہ تمہاری کُنالت میں پورا اترتا ہے ...

ہے ناں؟“

”نہیں ... وقت بدل چکا ہے ابو۔ ابو مرد کو اور جہتوں پر بھی لڑنا پڑتا ہے۔ اسے گھر

پر بھی پوری مدد کرنی چاہئے“

”وہ کیوں؟ ... کیا وہ کافی پیسے نہیں دیتا“

”پیسے کی بات نہیں ہے ابو۔ پیسے تو کافی ہیں، لیکن میں سارا دن کیا کروں۔

مجھے بھی تو اپنی شناخت چاہئے۔ بدل ابھی ابھی آپ کے زمانے میں رہ رہا ہے، بلکہ

دادا جی کے وقتوں میں زندہ ہے۔ اب عورت پاؤں کی جوتی نہیں، مرد نہاتا دھوتا گھوڑا

انہیں ہوا کرتا آج کل۔ عورت کا اب سسرال سے جنازہ ہی نہیں اٹھتا۔ وہ اپنی مرضی

سے واک آؤٹ بھی کر سکتی ہے ... وہ بڑبڑاتی چلی جاتی ہے۔ گھر پر کوئی موجود نہیں۔

میں ناشتہ کرنا چھوڑ دیتا ہوں۔

شاید دادی اگر زندہ ہوتی تو مختلف قسم کا نظریہ رکھتی، اس کے نزدیک اگر مرد مانے

جوگا ہو تو پھر اس سے کچھ بھی اور مانگ نہیں سکتے۔ اس کی کُنالت ہی اس کی سب سے

بڑی خوبی ٹھہرتی ہے۔

ہمارے زمانے تک عورت اپنے خدا داد Goal سے بندھی تھی۔ بچہ عورت کا

مستقبل تھا۔ اس کی پرورش اس کا نیچرل فنکشن اور بچہ اس کی زندگی تھا۔ اگر چہ بوجہ

زندگی میں فیل ہو جاتا تو پھر عورت کے لئے کوئی بھی کامیابی باقی نہ رہتی، لیکن اب

عورت نے بچے کو پس پشت ڈال کر اپنا مستقبل بنانے، اپنی شناخت تلاش کرنے کا

عزم کر لیا ہے۔ قدرتی فطرتی حیاتیاتی گول ختم ہو جانے کے بعد عورت اب مرد کی

طرح کھوکھلی ہو رہی تھی۔ مرد کو ہمیشہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی

منزل تلاش کرنا پڑتی ہے۔ کبھی وہ عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ کبھی شراب جوئے

کے لئے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ شاعر، ادیب، مصور، فنکار اس بات کے شاہد ہیں کہ مرد کو اپنی شناخت کے لئے تخلیق میں شناوری کی بھی ضرورت رہتی ہے، وہ اپنے آپ کو منوانے کے لئے بڑے جتن کرتا اور پاؤں پھلتا ہے۔ جب ایک بار انا کا کوہِ آپ کے پیچھے لگ جاتا ہے تو پھر اس سے جان بچانا مشکل ہے، لیکن عورت بچے کے سہارے اس کی پرورش کی چوار پڑ کر اس کے مسائل میں کھوئی اپنی ذات سے نجات پالیتی ہے، چونکہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ عورت کو بھی وہ ساری Depression، Frustration تنہائی، ٹوٹ پھوٹ کی ضرورت ہے جو پہلے صرف مرد کا مقدر تھا۔ پہلے عورت یک لئے دردِ زہ کافی تھا۔ اب اس نے دردل اور غم روزگار بھی پالیا ہے اور غزل کے شعر کی طرح اپنی چھوٹی سی کائنات میں طوفان اٹھائے پھرتی ہے۔ میں نے ارجمند کو سمجھانے کی کوشش نہ کی۔ بھلا کوئی باپ بیٹی کو سمجھا پایا ہے کبھی؟ وہ تو صرف بیٹی کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔

ارجمند کے چلے جانے کے بعد سوچتا ہوں کہ مرد اور عورت ہمیشہ محبت کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ دولت بھی کئی بار اسی توجہ کو حاصل کرنے کے لئے جمع کی جاتی ہے۔ عزت نفس، توقیر ذات، خودی کا تصور بھی اسی محبت کے شاخسانے ہیں۔ محبت کی تلاش میں مرد اور عورت کا طریقہ واردات ان کی جسمانی ساخت کی مانند مختلف ہوتا ہے۔ عورت نئی محبت کے ساتھ ساتھ پھر اپنی تصویر بھی دل میں نگہی رہنے دیتی ہے۔ پرانی محبت نو یافت محبت سے مزاحم نہیں ہوتی۔

لیکن مرد کے لئے مکان خالی کرنے کی شرط ہے۔ وہ اللہ کی محبت پالنا چاہے کسی عورت کا مفتون ہو، اسے قلب خالی کرنا پڑے گا۔ مرد کی یہ بد نصیبی ہے کہ اس کا محبوب اس کے دل پر نمبروں والا تالا لگا کر صبر کرتا ہے۔ شادی کے بعد ماں کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ نئی نویلی دہن ماں کی تصویر کو دیوار پر بھی برداشت نہیں کر سکتی، چہ جائیکہ اس کی جگہ دو لہا کے دل میں ہو۔ مرد عورت کے دل سے اس کے مائیکہ گھر کی

یادیں محو نہیں کرتا۔۔۔ کبھی بیوی کی ماں کو اپنا رقیب نہیں سمجھتا، لیکن عورت سے دوئی برداشت نہیں ہوتی۔

اگر عورت بچہ جنے تو اس سے مرد یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ صرف پہلوٹھی کے بچے کی ماں ہو۔ ہر بچہ پچھلے بچے سمیت اپنی ماں کا حق دار ہوتا ہے اور مرد تو یہاں تک فراخ دل ہے کہ سوتیلی ماں لانے کے بعد اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ کم از کم میری بیوی سب سے محبت کر سکتی ہے اس لئے سوتیلے کو بھی گود میں لے کر پال دے گی۔ بچے ایک معاملے میں مرد عموماً بد نصیب ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی بچے کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اس کا کفیل بن سکتا ہے، لیکن دروازے پر کھڑا صرف اندر آنے کی اجازت مانگتا رہتا ہے۔ اجازت کبھی نہیں ملتی۔

عورت شادی سے پہلے یا بعد میں محبوب رکھنا چاہے تو چپ چاپ اس کی مورتی پوجا کر سکتی۔ مرد ایک وقت میں دو محبوب رکھنا چاہے تو طوفاں آجاتا ہے۔ دوئی سے نکلے بغیر اسے محبت مل نہیں سکتی۔ عورت اللہ میں ڈوبنا چاہے تو سارے پیاروں سمیت اس میں غرق ہو سکتی ہے، لیکن مرد کے لئے حکم دہرا ہے۔ اللہ کے سنے مکان خالی کرنے کی شرط ہے، سارے رشتے، بت نکال کر پھینکنا پڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ مرشد کی شبیہ بھی خارج از خیال کر کے ایکسانی سے رجوع کرنا ہوتا ہے۔ مرد کا سفر تنہائی کا سفر ہے۔ عورت کا سفر میلے میں گھومنے پھرنے، سیر کا علم ہے۔ دونوں اپنے اپنے ظرف بھر قیمت ادا کرتے ملے جاتے ہیں۔

میں ارجمند سے گزر کر اپنے ماضی میں ڈبکیاں لگانے لگتا ہوں۔ بوڑھا آدمی آسانی سے یہی بائی سیکوپ دیکھ سکتا ہے۔ بچے اور ارجمند قریبی بازار سے گروہریز خریدنے چے جاتے ہیں۔ میں دوسری منزل کی میلکونی سے ہاتھ ملا کر انہیں اللہ حافظ کرتا ہوں۔ جمشید اور قیصر امریکن زندگی میں اوپرے نہیں۔ انہوں نے تیرنا ہی ان پانیوں میں سیکھا، لیکن بال اور ارجمند جب بھی بولتے ہیں، ان کے لہجے میں پاکستانی

پن ہوتا ہے۔ جمشید اور قیصر کی آوازیں، الفاظ ان کی اونٹنگی میں امریکن لب ولہجہ کا دبدبہ اور کھنک ہے۔ وہ ابھی احساس کمتری سے آشنا نہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ امریکہ میں وہ ہمیشہ سکیئنڈ ریٹ سٹیزن رہیں گے۔ خیال میں ہال روڈ کی دوکان ابھرتی ہے۔ تب آپا کی دوستی اقبال سے زور شور پر تھی، نہ ملنے کی صورت میں خط آتے۔ کبھی کبھی میں ان خطوں کی ٹوہ میں آپا کے کمرے میں چلا جاتا۔ پتہ نہیں کسی انسان کو جاننے کی خواہش میں اس کی خوشبو، تحریر، لباس عادات کا کیوں تعاقب کرنا پڑتا ہے، ابھی محبت نیلی فون سے محفوظ تھی۔ آواز کے سہارے جد قریب آ کر بہت دور چلے جانے کی رسم عام نہ ہونی تھی، ہمارے عہد میں محبت دیر تک گونگی رہتی، پھر آنکھ مچولی میں بدلتی، کبھی سپاہی چور کو پکڑ نہ پاتا اور کبھی کبھی چور خود تھانے میں حاضر ہو جاتا، لیکن اے ایس مائی موجود نہ ہوتا اور ایف آئی آر نہ لکھی جاسکتی۔ کچھ معاشرے کے عطا کردہ حجاب تھے، کچھ اقدار کی تربیت کا حاصل تھا۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی پہلی کو برسوں تک حل نہ کر پاتے اور محبت اندر ہی اندر شہد کا چھتہ تیار کرتی رہتی، کبھی کبھی اسی پھیر والا پھر ولی میں ساری عمر بیت جاتی اور دھاگے کا سرا تک نہ ملتا، گنجلیں تو کیا کھلتیں۔

میں اقبال کی تلاش میں آپا کے کمرے میں پہنچا۔ آپا پلنگ کے نیچے بیٹھی تھی اور اقبال اس کے لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ ابھی ہیرڈ ریسر، بیوٹر پارلر، سملنگ سیلون لڑکیوں کی زندگی میں در نہیں آئے تھے اور سہیلیاں ایک دوسرے کے بالوں میں کنگھی پھیر کر خط اٹھاتی تھیں۔ کبھی جھوڑا، کبھی دو چوٹیاں اور کبھی کھجوری چٹیا بنا کر خوش ہوا کرتیں۔

”میں آجاؤں آپا۔۔۔“

شادی کی تیاریوں نے آپا کو بھرپور دھونس والی بہن بنا دیا تھا۔

”آ کر پوچھتے ہیں؟“

اقبال نے اپنا گھٹنا آپا کی کمر میں ٹھوک کر کہا۔ ”کیسے بولتی ہیں۔ اتنے بڑے شاعر

سے ...“

میری انا کو تھکی ملی۔ میں مسکرا کر اندر داخل ہو گیا، بید کی کرسی پر ایسے بیٹھا کہ میرا سینہ کرسی کی پشت سے لگا تھا اور دونوں ٹانگیں سیٹ کے ادھر ادھر تھیں۔ ایسے عموماً سرکس کے جوکر بیٹھا کرتے تھے۔ میں کسی طرح اقبال کو ہنسانے کے موڈ میں تھا۔ نہ جانے کیوں مردوں میں یہ خواہش عام ہوتی ہے کہ عورتیں ان کی بات سن کر ہنس دیں۔ ہنسی کی گرین لائٹ انہیں آگے بڑھنے کا سگنل دیتی ہے۔ کافی دیر خاموشی رہی آپا کو جیسے میرا آنا ناگوار گزرا۔ وہ نظریں جھکا کر نگلکھی کرواتی رہی۔ اقبال کے ہاتھ بڑی شفقت سے بالوں کی گرہیں کھولتے رہے۔ پتہ نہیں کیوں اور کیسے یہ شفیق لمس مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد اقبال بولی۔ ”تمہارے بال بہت نرم ہیں رفعت آپ۔“

”ساری آنولہ ریٹھا کی مہربانی ہے۔ میں نے کبھی شیمپو استعمال نہیں کیا“

پلکوں کی بھاری چلمن اٹھ کر لحظ بھر کر اقبال نے میری جانب دیکھا۔ میں آج تک اس نظر کے معنی نہیں سمجھ پایا۔ کیا یہ سوال نظر تھی؟ کیا اس نظر میں تو صیغہ و محبت تھی۔ کیا یہ نظر تنبیہ کرنا چاہتی تھی اور مجھے کانٹے دار جھاڑیوں میں گھسنے سے منع کر رہی تھی؟ کیا اس نظر میں اعتراف شکست تھا یا وہ فتح مندی کے احساس کے ساتھ جھنڈا لہرانے کی تھی۔ اس چھوٹی سی نظر کے سہارے میں نے کئی دن گزارے، سونے سے پہلے، صبح جاگنے کے بعد میرا سارا وجود ہمک کر اس نظر سے لپٹ جاتا اور اسی نگاہ کو سیڑھی بنا کر اس کی روح میں اتر جانے پر بھند رہتا۔ مجھے ڈائری لکھنے کی مادت تو نہ تھی، لیکن میں سونے سے پہلے اقبال سے ہونے والی ساری ملاقاتوں کو ذہن میں الٹا پلٹا، دیکھتا پیچھنتا۔ ہم دونوں جب بھی ملتے گھر کا کوئی دوسرا فرد عموماً موجود ہوتا، لیکن جوالم میں نے اپنے اندر بنا رکھی تھی، اس میں صرف اقبال کی تصویریں تھیں۔ میں سونے سے پہلے بڑی دیر تک ان تصویروں کو دیکھتا رہتا۔ ایسے میں مجھے ان گنت ایسے جملے بھی

سنائی دیتے جو اقبال کی زبان سے ادا نہ ہوئے تھے۔ میں خود کئی ایسی باتیں کہتا جن کے کہہ دینے کا کوئی جواز موجود نہ تھا اور جو ہرگز ہرگز کہی نہ جاسکتی تھیں۔ ہمارے عہد میں محبت عمل میں کم اور خیال میں زیادہ ہوتی تھی۔

ایسے ہی گوگلی بہری انجان سی محبت نے میرے اندر ایک پوری کائنات پھیلا رکھی تھی جس کے واقعات فرضی ڈانیا لگ من گھڑت، لمس اچھوتے، اظہار منہ بند اور واقفیت کے لمحے قریب قریب مفقود تھے۔ اس کے باوجود سرکس میں رسی پر چلنے والے شعبدہ باز کی طرح اس محبت کا کرشمہ کبھی دل سے محو نہ ہوا۔ آج کے عہد میں جب ایک ہی شام میں ریسٹورانٹ میں سینڈوچ کھانے اور کافی پینے سے لے کر بیڈ روم تک کے سارے معاملات بھی طے پا جاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اقبال اور میرے درمیان زیادہ سے زیادہ کچھ نہ تھا اور پھر بھی ایک روز میں نے اس کے دوپٹے کو ذرا سا گرفت میں لے کر کھینچا تھا۔ میری آرزو تھی کہ وہ ذرا پیچھے ہو جائے اور میرے گھر کے باقی ہجوم سے ہٹ کر ہم دونوں میں کوئی بات سب سے علیحدہ ان کہی ان بوجھی بھی طے پا جائے۔

اس روز ہم سب شالا مار میں پکنک منانے گئے تھے۔ شاہد بھائی بھی بال روڈ کی دکان بند کر کے ساتھ چلے آئے تھے۔ امی ابو، ہم پانچوں بہن بھائی کے علاوہ چاچا صد بھی ہمراہ تھے۔ آہٹا ہمیشہ کی طرح سہیلیوں کے جھرمٹ میں تھی۔ چاچا صد اقبال سے ایسی بے تکلفی سے پیش آتے گویا ایک زمانے سے اسے جانتے ہوں۔ اس روز ہم سب نے بڑے مزے دار قیے کے پرائے باغ میں کھائے۔ پہلے دو پیٹیاں آم کی اوپر تلے رکھی تھیں۔ پھر وہ دو ڈھیر چھلکوں کے بن گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس روز بارش ہوئی تھی اور ہوائیں باغ میں دوپٹہ بدل سہیلیوں کی طرح جھول جھول کر چل رہی تھی۔ اندرون شہر کے گھبرائے ہوئے متوسط طبقہ کے لوگ ہماری طرح پکنک منانے آئے تھے۔ ایئر کنڈیشنر کا کرشمہ ابھی عام نہ ہوا تھا۔

پھر ہم سب نے کوئلہ چھپا کی کھیلنا شروع کر دیا۔ یہ شرارت چاچا صد کی تھی۔ امی ابو تو بزرگی جتانے کے بہانے کھیل سے باہر رہنا چاہتے تھے، لیکن چاچا صد میں بڑی قوت تھی۔ وہ جب کچھ ٹھان لیتا تو پھر کسی روک کو نہ مانتا۔ کچھ چوں چڑا اقبال نے بھی کی۔ وہ غالباً سب کے سامنے بھاگنے سے شرماتی تھی اور کالج میں پڑھنے کے باوجود شرمیلی تھی۔

اس کھیل کے دوران جب چاچا صد کوڑا اٹھاتے دائرے میں بھاگتی اقبال کے پیچھے پھنکارتے بھاگے تو اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ مجھ پر گری۔۔۔۔۔ اسی وقت بجلی چمکی اور کڑا کے کا شور ہوا۔ یہی ایک لمس میرے اندر یادگار پاکستان بن گیا۔ مجھے اقبال کے ساتھ اصلی محبت کا کوئی تجربہ نہ ہوا۔ میرے پاس نہ خطوط تھے نہ گل بیوں کی یادیں تھیں۔ نہ شکوے شکایت کے رجسٹر تھے، نہ ہی انتظار کی کوئی داستان تھی۔ ہم دونوں ہم قدم، ہم زبان، ہم مکتب بھی نہ تھے۔ وہ جب بھی میری جانب دیکھتی، میں یہی سمجھتا یہ نظر آب حیات برسا رہی ہے۔ اتنی کم سمیڑا اظہار سے تمہی محبت کا اتنے برسوں میرے حاقب میں چلے آنا میرے لئے اب بھی عجیب سی بات ہے۔

مجھے یاد ہے جس روز شاہد بھائی کی شادی تھی، وہ اس صبح دیر تک میرے کمرے میں بیٹھے رہے۔ پہلے انہوں نے دو تین بار چائے پی، پھر ماسی جی کی لانی ہوئی اندرون شہر کی بالوشاہیاں کھائیں۔ زروں ہو کر دو تین پان چبا گئے۔ شاہد بھائی کا کچھ عجیب سا موڈ تھا۔ وہ ہاتھوں اور پیروں کی مہندی کے باعث اوپر سے لگ رہے تھے۔ شاہد بھائی نے بڑے ہونے کے ناطے کئی ادھوری پوری قربانیاں دی تھیں۔ انہیں پڑھانی کا شوق تھا، لیکن ابو کی آمدنی کم تھی اور ہم لوگ فضول خرچ نہ ہوتے ہوئے بھی کئی بنیادی ضرورتوں سے محروم رہ جاتے تھے۔ فوراً تھ ایئر کے امتحان سے کچھ پہلے ہی شاہد بھائی نے اوری اینٹل کالج جانا چھوڑ دیا۔ انہوں نے ہال روڈ میں ایک چھوٹی سی دکان الاٹ کرائی تھی یا شاید تالا توڑ کر دکان کو ہتھیا لیا تھا۔ اب وہ اپنی دکان پر بجلی کا سامان

مرمت کرتے تھے اور دکان پر چھوڑے ہوئے سامان کو اوانے پونے بیچ کر ابو کی مدد بھی کرتے تھے۔ شام کو عموماً وہ کافی ہاؤس چلے جاتے، جہاں انہیں اپنی شاعری سنانے کا موقع تو کم ملتا، لیکن جہاں شاعر ادیبوں سے بہت سستے دامنوں ملاقاتیں ہوتی رہتیں ساندھے سے ٹہل روڈ تک کا فاصلہ چند سالوں میں طے ہو گیا اور شاہد بھائی نہ جانے کیوں کافی ہاؤس بھی جانا چھوڑ گئے۔ وہ اب میری غزلیں نظمیں سن کر بڑے کھلے دل سے داد دیتے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ میں مشاعروں میں حصہ لوں، خاص کر ریڈیو پاکستان کا کوئی مشاعرہ ایسا ہو جس میں میری شرکت لازمی سمجھی جائے۔

”یار تم شاعری کی طرف سے غفلت برت رہے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ایسا ذہن رسا عام نہیں ہوتا۔۔۔۔“

”آپ نے شاعری کیوں چھوڑ دی شاہد بھائی؟“

وہ دیر تک سوچتے رہے جیسے درست جواب تلاش کر رہے ہوں۔

”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں ہمایوں کہ میں مستری ہوں شاعر نہیں ہوں۔۔۔“

”یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟۔۔۔“

”اندازہ نہیں یقین ہے میرا۔۔۔ میں قافیہ سامنے رکھ کر جوڑ توڑ کیا کرتا تھا۔ مجھے

آمد نہیں ہوتی۔۔۔ آمد اور طرح کی اصلی شاعری ہوتی ہے۔“

مجھے یقین نہ آیا، کیونکہ میں نے کبھی انہیں ڈکشنری دیکھنے یا قافیہ جمع کرتے نہ پایا،

لیکن شاید اصلی وجہ وہ مجھے بتانا نہ چاہتے تھے۔ ان کی خواہش کو میں بھانپ چکا تھا۔

”کیا محبت میں قربانی ضروری چیز ہے؟۔۔۔“ اچانک میرے منہ سے نکلا۔

”تم کیوں پوچھتے ہو ہمایوں؟“

”کیونکہ میں جانتا ہوں، آپ نے شاعری میری وجہ سے چھوڑی۔۔۔ آپ چاہتے

ہیں کہ میرے نام کا ڈنکا بجے۔۔۔ آپ بادشاہ گر ہیں۔ آپ بادشاہ بننے سے کتراتے

ہیں، آپ کا مزاج چھوڑنے کا ہے، پکڑنے کا نہیں۔“

”شاید ...“

”بادشاہ کی ذمہ داری سے وزیر گھبراتا ہے۔ وزیر کی تدبیر بادشاہ کے لئے مشکل ہے۔ آپ شرع ہونے کی ذمہ داری سے بدک گئے ہیں شاہد بھائی“

”شاید ... شاید ... میں سمجھتا ہوں وہ تمہیں زیادہ پسند کرتی ہے ...“

اچانک شاہد بھائی کے منہ سے بہت بڑی بات نکل گئی۔ اب وہ پرندہ واپس پنجرے میں قید نہیں کر سکتے تھے۔

”میرا تو خیال تھا کہ وہ آپ کی طرف مائل ہے ...“

”اب کیا فرق پڑتا ہے، میرا پیہ تو کٹ گیا۔ تمہیں اب اس کی توجہ مبارک ہو۔“

شاہد بھائی اٹھ کھڑے ہوئے پھر انہوں نے اپنا مستریوں والا مضبوط ہاتھ میر یکنندھے پر رکھ دیا۔ اس ہاتھ میں گرمائی، پذیرائی، حوصلہ افزائی اتنا بہت کچھ تھا۔

”یاد رہتا وقت انسان خیال کو اصل جانکر ضائع کرتا ہے کاش اتنا وقت حقیقت کے حاقب میں بسر کیا کرے تو بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔ انسان کو خیال نے ہمیشہ ریگستان میں اکیلا چھوڑا ہے“

وہ ایک ٹھنڈی آہ بن کر کمرے سے نکل گیا۔

میں سوچتا رہا کہ انسان کو وقت گزارنے کے لئے اصل ضرورت خیال کی ہوتی ہے یا حقیقت کی؟ وہ وقت کے بوجھ تلے اسی خیال کی مدد سے فرار ہوتا ہے؟ کہ حقیقت اسے باہر نکالتی ہے۔ ایک چھوٹی سی کرکٹ کی گیند کے پیچھے ایک دنیا دیوانی ہوئی۔ کرکٹ گیند حقیقت نہیں ہے، اس سے وابستہ ہارجیت ایک تصور ہے، دیکھ لیجئے کتنی خلقت اس گیند کے لئے دیوانہ وار ناظرین کا انبوہ بن جاتی ہے۔ جوا یہ گیند کھلاتی ہے، ملکوں کی دشمنی اور دوستی تک اسی ایک نتھی سی گیند سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اصل کچھ نہیں، ساری دیوانگی اس خیال کی پیدا کردہ ہوتی ہے جو اس کرکٹ کی گیند سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔

اقبال بھی ایسے ہی ایک تصور تھا جس نے میری زندگی کے سرے سے وہ سال ایک خیال سفر میں بدل دیئے۔۔۔ میں بھی اس تصور کی گیند کے پیچھے بھاگتا بھاگتا نہ جانے کتنی مدتوں اندر ہی اندر آوارہ رہا۔ شہد بھائی ٹھیک کہتے تھے۔ خیال ریگستاں کا سفر ہے۔

جب سے ترقی نے انسان کو حقیقت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور کیا ہے، شعور کو لاشعور سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ انسان اب لاشعور میں بسنے والے خیال کے بجائے شعوری حقیقت کے درپے ہیں۔ وہ اندر کے امکانات، ممکنات کو پس پشت ڈال کر ایسی اشیاء کے تعاقب میں بھاگا پھرتا ہے، جن کو ہم اپنے حواس خمسہ سے پہچان سکیں۔ خیال، سوچ، وسوسہ، وہم، مسلک سب لاشعور کے اہال ہیں۔ اب تخلیق عمل بھی لاشعور کی کرامت نہیں رہا، بلکہ شعور سے لیبارٹری میں انگو اکر کے لے گیا ہے۔

امریکہ کی ترقی کا راز اس کے مسئلوں میں ہے۔ وہ پہلے شعوری طور پر مسئلہ اختراع کرتا ہے، پھر اس کی ساری جدوجہد، سعی، کوششیں ان ہی ماحولیاتی غموں کے ریچھ کو گھری دہلیز سے بھگانے میں صرف ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ لاشعور کی توڑ پھوڑ کسی لیبارٹری میں لے جانے کا نہ تو امریکہ نے ابھی پکا عزم کیا ہے اور نہ ہی اندر کے خیال کے لئے کوئی بھرپور پلاننگ ہو سکی ہے۔

امریکہ مسئلے پر جیتا ہے۔ وہ شعوری کوشش سے مسئلے پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور اسی مسئلے سے جینے کی طاقت حاصل کرتا ہے۔ اگر ایک مسئلے کا سلجھاؤ ہو تو کوئی دوسرا مسئلہ اس کی جگہ لے گا۔ اس موذی مسئلہ کی پیروی کبھی ختم نہیں ہوتی۔

امریکہ نے اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اگر غم کو مسئلے کی شکل میں تبدیل کر لیا جائے تو اس کا علاج ممکن ہے، اگر مسئلہ موجود نہ ہو تو انہیں زندگی روکھی پھینکی لگتی ہے۔ وہ خود مسئلہ ایجاد کرتے ہیں۔ ساری ریسرچ اس بات کی مرہون منت ہے، وہ غم کو مسئلہ بنا کر، سلجھاؤ کی طرف قدم اٹھانے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ جو نبی آنسو جنم

لے وہ مسئلے کو سمجھ کر اس کے حل کی طرف چل نکلتے ہیں۔ انہوں نے ان گنت مسائل کو لیبارٹری کی طرف دھکیل دیا ہے۔ آج کی ریسرچ کا سچ کل کے تجربات سے جھوٹ ثابت ہو سکتا ہے۔ جب نیوٹن کی تھیوری بنتی ہے، تو وہی تھیوری آئین ٹائپکے لئے درد سر بن جاتی ہے اور وہ اسے چیلنج بھی کر سکتا ہے۔ ساری انڈسٹری، ٹیکنالوجی غموں کا مداوا ہیں۔ مختلف قسم کے مسائل کو سلجھانے کے لئے اتنا بڑا مارکیٹ تیار ہو چکا ہے کہ اب سمجھ نہیں آ سکتی کہ یہ سارا بازاری نظام علاج ہے کہ مسئلہ کا ایجاد کرنا؟ وگوں کے دکھوں کو رفع کرنے کے لئے بازار بھرے چلے جا رہے ہیں۔ ایک چکر ہے، شے پہلے ہے کہ حصول زر؟ مسئلہ ضروری ہے کہ اس کا حل؟

عورتوں کی آزادی کا مسئلہ ہو، بوڑھے لوگوں کو در بدری اور بے عزتی سے بچانے کی مہم ہو، ملازمت میں مشغول ماؤں کے بچوں کی نگہداشت کا مسئلہ ہو، غریب ملکوں کو قرضے اور عطیات پہنچانے کا سوال ہو۔ سفید فام لوگ مسئلہ کو شطرنج کا کھیل بنا کر کھیلتے ہیں اور نڈھال نہیں ہوتے۔ سائنس کے گرویدہ انسانی دکھوں کے خلاف پلاننگ میں مشغول رہتے ہیں، لیکن کسی فرد یا معاشرے سے غم کا سیاہ پرندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں ہوتا۔ ملازمت کرنے والی عورتوں کو احساس جرم ستانے لگتا ہے۔ جب ملیشیا اور ٹائیفاڈ کا علاج نکل آئے تو ایڈز، کینسر، الزائمر مسئلہ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب گھروں سے بچے، بوڑھے دوست رشتہ دار رخصت کر دیئے جاتے ہیں تو تنہائی کا رچھ گھر میں بسیرا کر لیتا ہے۔ جب ادویات اور ٹائمز کے استعمال سے عمر لمبی ہو جاتی ہے تو بوڑھوں کی ایسی کھیپ معاشرے کا بوجھ بن جاتی ہے، جن کے لئے نہ مرنے کی دعا کی جاسکتی ہے نہ جینے کی۔۔۔ لیکن امریکی معاشرہ مسائل کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔ وہاں زندگی اور ترقی کا راز ان ہی شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مشرق میں اندر کی فلاح کے لئے جو ڈیرے، مٹھ، سن ڈے سکول، زاویے، مراء، مرشد تھے ان کے علم کو نطنی سمجھ کر مشرقی اکثریت انہیں چھوڑتی چلی جا رہی ہے۔

فلاح کی راہ پر چلنے والے غم سے نپٹنے کے لئے صبر کی ڈھال استعمال کرتے ہیں۔
 جہد بالنفس کے معاملے میں اور کوئی منتر ٹوٹا کام میں نہیں لاتے۔ صبر کا دارو پینے
 والے شرم و حیا کے ساتھ اپنی تکلیفوں کو راز رکھنے کا طریقہ سیکھ کر غم کے دہکتے کونکلوں کو
 دم پخت کرنے کا فن سیکھ جاتے ہیں۔ یہاں غم کی بوٹی کو گھاس سے چھنے کا رواج نہیں،
 بلکہ بغیر کسی بھی دوائے غم کو مار ڈالنے کا ہنر سکھایا جاتا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ ان گنت تلواریں، ڈھالیں جو ترقی کی دیوی نے ایجاد کی ہیں اور
 جہاں جہاں یہ ٹیل ہو جاتی ہے، وہاں فلاح کا دیوتا ایک صبر کی ڈھال آپ کو پکڑا کر
 اٹے کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ صابریں کا کہیں نہ کہیں سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، پھر اسی تعلق
 کی برکت سے بات سننے والے، مدد کرنے والے آپ کے غم میں جھلنے والے کی
 موجودگی میں غم کی کاٹ نہیں رہتی۔ یہ تعلق کسی سربیکا لوجسٹ، سائیکی ایٹرسٹ
 سے اس لئے بھی بڑا ہوتا ہے کہ یہ ہر وقت شرگ کے ساتھ رہتا ہے اور انسان آہستہ
 آہستہ اپنا سارا بوجھ اس پر ڈالنے کا عزم کرنے کے بعد نچوٹ ہو جاتا ہے۔۔۔ مسائل
 پیدا ہوتے ہیں ہوتے رہتے ہیں، لیکن علاج عموماً ایک ہی رہتا ہے۔۔۔ تعلق!

میں اپنی شرگ والے سے کبھی تعلق پیدا نہ کر سکی۔ نہ ہی میں اقبال کے تعلق کا ذکر
 کسی سے کر سکا، لیکن مجھے لگتا ہے کہ اقبال نے وہی نہ تو مجھے صبر کی ڈھال ہمیشہ پہننے
 دی اور نہ ہی کسی بڑے آفاقی شرگ والے دوست کی تلاش کے لئے فارغ کیا۔

تھری چیر زفار خیال غم

تھری چیر زفار صبر کی ڈھال

تھری چیر زفار شرگ

تھری چیر زفار شاہِ رگ میں بسنے والا

تھری چیر زفار اقبال

خیال ہی خیال ...

میں دروازہ کھولتا ہوں۔

یہ دروازہ چوروں کے ڈر سے دو تین الٹ پھيروں سے کھلتا ہے۔ آخر میں دروازے کی زنجیر اتار کر لٹکانی پڑتی ہے۔ اس دوران گھنٹی دواک مرتبہ مزید بجتی ہے۔ ریڈوڈ کا خوبصورت دروازہ کھل کر دھوپ کا ایک لمبا تختہ اندر سفید قالین پر بچھا جاتا ہے۔ میں کمرے سے نکل کر دو سیڑھیاں نیچے اتر کر دیکھتا ہوں۔ سامنے دو انگریز صورت امریکن کھڑے ہیں۔ لگتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد بوٹن ٹی پارٹی میں شریک ہوئے ہوں گے۔ عورت اور مرد دونوں خوبصورت دراز قد تھوڑے سے بھلے بھلے بڑے خوشگوار چہروں سے مجھے صبح بخیر کہتے ہیں۔ میں جواباً خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔

”جی ہم اندر نہیں آنا چاہتے ... صرف کھڑے کھڑے آپ سے چند باتیں کرنا تھیں۔“

وہ عام امریکنوں کی طرح کالے آدمی سے تھوڑے سے خائف بھی ہیں اور اسی لئے اندر آنا نہیں چاہتے۔ ڈل کلاس امریکن تارکین کی مشکلات تو سمجھتا ہے اور انسانی حقوق کے پیش نظر ان تارکین کے لئے سہولتوں کا بھی خواہش مند ہے، لیکن وہ ایشیائی اور افریقی لوگوں سے خوفزدہ بھی ہے، کیونکہ وہ نہیں سمجھ پاتا کہ مشرقی لوگ جلد کے میلے ہونے کے ساتھ ساتھ دل کے اجلے بھی ہیں یا نہیں۔ جب انسان فرق کو سمجھ نہیں پاتا تو خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس اجنبی مرد اور عورت کا بھی تھا۔

”ہم لوگ واج ٹاور کی طرف سے آئے ہیں اور آپ کی توجہ چاہتے ہیں۔“

مجھے تھوڑی سی معلومات واج ٹاور کی ہیں، جن کی بناء پر میں ان کو پہچانتا ہوں۔ یہ لوگ عیسائی مشنری ہیں اور عیسائیت کا پرچار کرنے کی خاطر گھر گھر پھرتے ہیں۔

”آپ اندر آجائیں ...“ میں اصرار سے کہتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ مہمان

نوازی کے منافی ہے کہ میں ان سے گھر کے باہر شارع عام پر باتیں کروں۔

”جی نہیں شکریہ۔ ہم اندر نہیں آسکتے۔ ہمارے پاس تھوڑا وقت ہے۔ کیا آپ

قیامت پر یقین رکھتے ہیں؟“ عورت پوچھتی ہے۔

”جی ہم مسلمان کا ایمان ہے کہ روز جزا ہے۔ ہم ایمان بالغیب پر پورا یقین رکھتے

ہیں۔“

”آپ جانتے ہیں کہ اللہ کی بادشاہت آنے والی ہے۔“

”جی ضرور۔“

لڑکی نما عورت کے دانت سگریٹ کی وجہ سے دھواں سے ہیں، لیکن اس کی نیلی

آنکھیں بہت شفاف ہیں۔

”ہم اپنے اعتقادات کو پھیلانے کی خاطر کچھ لٹریچر لائے ہیں۔“

میں ایسے شکنجوں میں اپنے آپ کو پھنسانا نہیں چاہتا۔ میں بقول مولانا اشرف علی

تھانوی اس بات کا قائل ہوں کہ اپنا مسلک چھوڑو، نہیں کسی اور کا مسلک چھیڑو نہیں۔

میں ایک اور طرح سے Secular آدمی ہوں۔ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر لمبا مرد اپنی

مسکراہٹ کے ساتھ کچھ تبلیغی لٹریچر میری جانب بڑھاتا ہے۔

”یہ بالکل مفت ہے۔ ہم واج ٹاور والے اسے لوگوں کی فلاح کے لئے بانٹتے ہیں۔

دیکھئے آج کا انسان ایمانگی کی کے باعث بربادی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ میں چند

سال پہلے Gay تھا۔ شاید آپ کو علم ہو کہ اس سال Gays کی ایک بہت بڑی ریلی

... ٹورنٹو میں ہوئی ہے۔ میں قوم لوط کا بندہ تھا، لیکن ہر ایک دن میرے ہاتھ یہ واج

ٹاور کا رسالہ آگیا اور جیسے مجھے اللہ کے بیٹے یسوع مسیح نے خود آواز دے کر لاسٹ سپر

میں شامل کر لیا۔ میرا ہتھمہ کیا اور مجھے ایسے کر دیا جیسے نوزائیدہ بچہ۔ آپ؟ ...“

وہ ہچکچا گیا اور نہ پوچھ سکا کہ میرا مذہب کیا ہے؟

”میں مسلمان ہوں اور میرا اعتقاد ہے کہ روح اللہ ایسے معجزے کر سکتے ہیں۔ میرا یہ

بھی اعتقاد ہے کہ حضرت مسیح کو صلیب پر نہیں چڑھایا گیا، بلکہ انہیں زندہ اٹھایا گیا اور وہی مسیح موعود بن کر دوبار آئیں گے اور شریعت محمدی ﷺ کو نافذ کریں گے۔ وہ معجزے سے پیدا ہوئے اور معجزے میں ہی ان کی تکمیل ہوگی، لیکن آپ کے اعتقاد کے مطابق میں انہیں اللہ کا بیٹا نہیں سمجھ سکتا، کیونکہ میرا ایمان ہے اللہ واحد ہیہ۔ نہ وہ کسی سے پیدا ہوا نہ اس سے کوئی جنا۔۔۔ باقی میرے نزدیک روح اللہ کی قدر منزلت میں بصورتی نہ کسی قسم کی کمی ہے نہ شک کی گنجائش۔۔۔“

وہ دونوں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ میں چونکہ بنیاد پرست ہوں، اس لئے عین ممکن ہے کہ میں دہشت گرد بھی ہوں۔

”میں آپ کو حضرت مسیح کی طرف دعوت دینے آئی ہوں۔۔۔ میں کئی سال شملر میں رہی ہوں۔ میرا شوہر شراب پی کر مجھے پیتا تھا۔ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دیتا تھا میں گھر سے بھاگ کر شملر میں چلی گئی۔ جہاں ایک روز میری کھڑکی میں اتنا اجالا ہو گیا کہ کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ میں گھٹنوں کے بل ہو گئی۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔۔۔ آواز آئی تم میری بھینٹ ہو، گلے میں واپس آ جاؤ۔۔۔ میں نے۔۔۔ صبح ہی اپنے شوہر کو فون کیا کہ میں نے اسے معاف کر دیا ہے، کیونکہ یسوع مسیح نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ پھر مجھے رابرٹ مل گیا“ اس نے لمبے مرد کی طرف محبت سے دیکھا۔ میں نے مسکرا کر دونوں کا شکریہ ادا کیا اور لٹریچر کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے پمفلٹ پکڑ لئے۔

”یہ ایک کاپی رسالے کی بھی میں آپ کو دے رہی ہوں۔ اگر آپ اسے مفید سمجھیں تو آپ ہمیں فون کر دیں۔ ہم باقاعدگی سے اسے بھی آپ کو بھجوا سکتے ہیں۔“

میں نے رسالہ پکڑ کر پوچھنا چاہا کہ ان دونوں کا اب باہم کیا رشتہ ہے، لیکن میں چپ رہا۔ دیہی اور شہری آبادی میں ایک بڑا واضح فرق یہ بھی ہے کہ دیہی علاقوں کے لوگ رابطے کی زبان جانتے ہیں۔ راہ چلتے وہ ایک دوسرے کے متعلق ساری انفرمیشن

حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ لوک ریت کے سہارے قریب آ جاتے ہیں، لیکن شہری آدمی کو تھکنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ وقت کو درست استعمال میں لانا چاہتا ہے۔ اس کے سنے کام اہم ہے، رابطہ اہم نہیں۔ جس عہد میں انگریز کی حکومت اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ اس کی مملکت پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا تھا، اس زمانے میں انگریز کی قوت اس بات میں مضمر تھی کہ وہ بغیر تحارف کے کسی سے گفتگو نہ کرتا۔ ٹرین، بس، پارک ایسی جگہوں میں جہاں لوگ ہوتے وہ اخبار یا کتب کی سکرین کے پیچھے چلے جانے کا فن جانتا تھا اور فاصلوں کو قائم رکھ کر ڈسپلن کا ہوا قائم کر لیتا ہے۔

میں نے ان سے نہ پوچھا کہ کیا انکے بچے تھے۔ پیچھے سے وہ اٹالوی تھے کہ مرش۔ کیا ان کا تعلق ناروے کے Vikings کے ساتھ تھا کہ وہ فرانس کے تہذیب یافتہ لوگوں میں سے تھے۔ بغیر کسی قسم کی انفرمیشن حاصل کئے ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ میں سوچتا رہ گیا کہ کیا معلومات کے بغیر رابطے قائم کئے جاسکتے ہیں؟ میرے دل کے شیطان نے میرے کان میں کہا، شاید انکی شادی نہیں ہوئی۔ اس معاشرے میں شادی کے بغیر اکٹھے رہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ پھر میرے نفس نے سوال کیا، کیا بغیر شادی کئے اکٹھے رہنے کے ساتھ ساتھ انسان مشنری بھی ہو سکتا ہے؟ انسان کب تک نیکی کے اندر بدی اور بدی کے بہتر نیکی کا حج اٹھائے پھرے گا۔ اسے اپنے اندر چھپے ہوئے تضادات سے کب چھٹی ہوگی؟ انسان کیا اپنی روئی سے رہائی پاسکتا ہے؟

تضادات میں سب سے اہم اور صدیوں پرانا انسانی پنڈولیم کو متاثر کرنے والا تضاد مذہب اور جنس ہے۔۔۔ یہاں سفر تیزی سے بھی ہوتا ہے یکنخت بھی، Matamorphosis بھی ہو سکتا ہے اور کبھی کبھی مذہب سے جنس تک انسان ایک عمر میں پہنچتا ہے۔ جب کبھی اللہ والا اندر سے پوری آگاہی، ارادے اور شعوری

کوشش سے اپنے آپ پر جنس کا دروازہ بند کرتا ہے، چوری چھپے کی مٹھائی کو اپنے لئے کسی معقول یا نامعقول وجہ سے حرام سمجھ لیتا ہے تو پنڈولم مذہب کی جانب سفر کرنے لگتا ہے۔ جب عیسائی دنیا میں مذہب کا دور دورہ تھا اور جنس پر واضح اور غیر واضح پابندیوں تھیں۔ مذہب کی لطافتیں آرٹ، لٹریچر، رسم و رواج غرضیکہ زندگی کے تمام Ritual میں ابورنگ بھرتی تھیں۔ جو انہی مغربی دنیا نے معاشی ضروریات کے تحت، ترقی کی خاطر، پنڈولم پوری آزادی، رفتار اور پیچھے نکلے ساتھ جنس کی طرف موڑا۔ سبھی آرٹ، لٹریچر غرضیکہ تمام فنون لطیفہ اس بات کے عینی شہد ہیں کہ آرٹ کی روح رواں بھی اچانک جنس بن گئی۔ پوری آزادی اور بھگدڑ کے ہمراہ جنس کو پوجنے اور آخری مسیحا سمجھنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا گیا، لیکن آج کا مغربی انسان یہ بھولتا ہے کہ انسانی تضادات کے درمیان دونوں Poles کبھی بھی غیر اہم نہیں ہو سکتے۔ سفر جاری رہتا ہے۔ ایک قطب سے دوسرے قطب کی جانب کشش لازمی ہے بہت کم لوگ ایسے ہوا کرتے ہیں جو اپنے پنڈولیم کو وسط میں روک سکیں یا روک رکھیں۔ یہ سفر ازلی ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ مذہب سے جنگی جانب ... اور جنس سے مذہب کی طرف۔

کبھی میں گھوڑے کی نعل جیسے سپر مارکیٹ میں چھا جاتا ہوں۔ پہلے پہلے یہاں کے سپر سٹور میری دلچسپی کا باعث تھے۔ میں ضروری اور غیر ضروری اشیاء کی چھان پھٹک میں لگا رہتا تھا۔ مفت کوپن جمع کرتا رہا۔ ان لوگوں کے مارکیٹنگ Tactics کا شکار ہو جاتا، لیکن اب مجھے علم ہو چکا ہے کہ بازار ایسی چیزوں کی اشتہا بڑھاتے ہیں، جن کی نہ گھر پر جگہ ہوتی ہے نہ ضرورت، تھوڑے دن گھر پر مہمان رہ کر ان چیزوں کو یا تو جنگ یارڈ میں پھینکنا پڑتا ہے یا کسی کو تحفہ دے کر جان چھڑانا پڑتی ہے۔ لوگ ٹرولیاں لے کر ایک ڈپارٹمنٹ سے دوسرے تک چکر پر چکر لگاتے ہیں۔ عام طور پر انہیں معمولی سودا سلف خریدنا ہوتا ہے، لیکن جلد ہی ان کی ٹوکری اتنی بھر جاتی ہے کہ سامان

لڑھکے لگتا ہے۔ امریکی لوگ تو پھر بھی ضرورت بھر خرید کر رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن ایشیائی، مڈل ایسٹ اور چینی جاپانی کے لوگ بڑے تجسس سے سامان دیکھتے، بوہ پھروالتے اور لمبے پھندے جاتے ہیں۔

میں عموماً دو چار معمولی چیزیں خریدنے کے بعد بازار کے باہر بے برآمدے میں ایک کافی شاپ میں جا بیٹھتا ہوں۔ کافی شاپ والوں نے برآمدے میں بھی گول میزوں کے گرد کرسیاں لگا رکھی ہیں، جہاں بیٹھ کر کافی شاپس گاہک کافی بھی پیتے ہیں اور بازار کا جائزہ بھی لیتے رہتے ہیں۔

میں کافی کے ساتھ چیز برگر کھانے میں مشغول تھا۔ جب میری نظر کا پارک سے آگے چھوٹے سے لان پر پڑی، وہ پھر سر کو سینے میں پیوست کئے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ چاچا صمد سے مشابہ تھا، لیکن چہرے پر ویسی بٹا شت نہ تھی۔ نہ جانے کیوں نے کافی ختم کرنے کے بعد اس کی طرف رخ کیا۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں“

ایرو اٹھا کر اس نے میرا جائزہ لیا، جیسے میں اس کی آزادی میں مغل ہوں۔

”بیٹھے ...“ وہ خشکی سے بولا۔

پہلی Sweat Shirt اور نیلی جینز کے اوپر اس نے ڈھیلی ڈھالی جیکٹ پہن رکھی تھی، جس کی جیب پر میرا ڈونا فٹ بال پلیئر کی تصویر تھی۔ بال ان دھوے، دانت میلے اور شیو بڑھی ہوئی، ہاتھوں کے ناخنوں میں چکٹ تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا نہ جانے یہ نوجوان کون سا نشہ کرتا ہے۔ ایل ایس ڈی کہ مری جوانا ... شراب کہ ہیروئن ... اس کے بھرے چہرے پر نشی آدمی کی مایوسی تھی۔ کچھ دیر ہم خاموش رہے۔ میں اس کی سوچ میں مغل نہ ہونا چاہتا تھا، لیکن جونہی وہ اٹھا، میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی جیکٹ پکڑ لی۔

”میں تمہارا ہم وطن ہوں، کیا مجھ سے بات نہیں کرو گے؟“

”اب باتیں ختم ہو گئی ہیں چا چا جی۔۔۔ باتوں کا اسی وقت ہوتا ہے۔“
جب امید ختم ہو جائے تو پھر باتوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ انسان اپنے اندر جو گارہ جاتا ہے۔

میں اس کے حالات سے ناواقف تھا۔ اسی بازار میں لان پر چلتا چلتا جو رز جینز اور بنیان میں ملبوس وہ کبھی کبھی مجھے ملتا اور سلام کرے آگے نکل جاتا۔ شاید وہ کسی پرانے گیراج میں کسی Basement میں غیر قانونی طور پر رہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے غریبی کا ستایا ہوا اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر یہاں پہنچا ہو۔ شاید جوان بہنوں کی شادی، بیکار باپ کی مدد، بیمار، کے علاج نے اسے دیس نکالا دیا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے ضبط و نظم اور ذمہ داریوں نے اسے فرار کی یہ راہ سمجھائی ہو۔ اب یہاں وہ برسوں سے کسی چینی، ہندی، پاکستانی ترکی سٹور پر سامان ڈھوتے ڈھوتے تنہائی کاٹتے کاٹتے اس اداسی تک آپہنچا تھا جو اس کے چہرے پر کھنڈی تھی۔

شاید وہ بھی سوچتا رہتا ہو کہ وہ امریکہ میں کیوں ہے۔ اس سوال کے جواب میں اس کے سر میں سٹارٹ نہ ہونے والی کار کی طرح گھیس گھیس بھاں بھاں کی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں۔ کئی یادیں غلیل کا پتھر بن کر اس کے ماتھے سے ٹکراتی ہوں اور اس میں اتنی ہمت بھی باقی نہ رہی ہو کہ وہ اپنا بچو کر لے۔ شاید وہ شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی کا شکار ہو۔

میں نے اس کے کندھے پر پولو سا ہاتھ رکھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے قبول کر لے گا۔۔۔۔۔

”چلو میں باتیں نہیں کروں گا۔ صرف تمہارے پاس بیٹھا ہوں گا جیسے پلیٹ فارم پر دو سواریاں دیر تک ایک بچہ پر بیٹھتی رہتی ہیں۔“

اس کے چہرے پر اداس کے ساتھ ساتھ بڑی شرافت، بردباری اور حیا پھیلی ہوئی تھی۔

”اگر کوئی کام ہو تو مجھے بتادیں میں کروں گا چا چا جی ...“

”بلکہ اگر تمہیں کوئی چیز درکار ہو تو بلا تکلف مجھے بتاؤ۔ میں کوشش کروں گا تمہاری مدد

کی ...“ میں نے خوف کے باوجود اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے مدافعت نہیں کی۔

اسے نیند کا جھوٹا آیا اور وہ کسی نشئی کی طرح جھول کھا گیا۔ پھر اپنے آپ کو قابو

کرتے ہوئے بولا ”آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں نشہ کرتا ہوں ...؟“

”میں نے تو ایسے نہیں سوچا“ میں نے جھوٹ کہا۔

”میں ڈیپریشن کا شکار ہوں ... یہ بیماری نہیں ہے اللہ کا ایک عذاب ہے ... کبھی

وقت ہوتا ہے، کبھی بار بار لوٹتا ہے، کبھی ہمہ وقتی ساتھی بن جاتا ہے۔ لوگوں پر تو اسی کبھی

کبھی نازل ہوتی ہے۔ اسی اچھی چیز ہے چا چا جی ... اس انسان کی شخصیت میں

مٹھاس بھرتی ہے، لیکن ڈیپریشن انسان کو اپنی بے مائیکسی، ناکارہ پن اور غیر اہم ہونے

کا ایسا یقین دلاتا ہے کہ پھر اس کے لئے زندگی میں دلچسپی لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اس آدمی احساس کمتری نہیں جاگتا اور ڈیپریشن میں سوائے احساس کمتری کے اور

کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ یہ فرق ہے ... میں سوچتا ہوں جب“ میں اس قدر

Worth Less ہوں تو جینے کا فائدہ ... میں مرنا چاہتا ہوں، لیکن ابھی تک زندہ

ہوں۔ غصہ اور نفرت میرے اندر مسلسل کھوتے رہتے ہیں ...“

”حوصلہ کرو حوصلہ کرو بھائی میرے۔ یہ ان پردیس کی تنہائیوں کا اثر ہے“

”نہیں چا چا جی! ایسے نہیں ہے۔ میں اپنے دیس کے حالات سے بھاگ کر یہاں

نہیں آیا ... بلکہ اس ڈیپریشن سے بچنے کے لئے میں نے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ بچپن

میں اپنے گھر میں جزیرے کی طرح رہتا تھا۔ ہمارے گھر میں سب کچھ تھا، لیکن جذباتی

ہم آہنگی نہیں تھی ... بچپن میں ہر وقت نقصان کا احساس رہتا تھا، لیکن جذباتی ہم آہنگی

نہیں تھی ... بچپن میں ہر وقت نقصان کا احساس رہتا تھا، لیکن میں اس خسارے کے

احساس کو کبھی زبان نہ دے سکا۔ ایک دن ہنسنا دوسرے دن رونا ... میرے موڈ

پنڈولیم کی طرح تھے۔ لیکن جوانی کے آغاز میں یہ ہنسنا بھی رونے کا ہی روپ دھار گیا۔“

”میں جانتا ہوں۔ ڈیپریشن کیا ہے۔ Hippocrates نے سب سے پہلے Melancholia کا نام لے کر ڈیپریشن کی تشریح کی تھی۔ کبھی نیند نہ آنا، کبھی نشہ کی طرح سوئے ہی رہنا۔ کبھی بہت کھانا بالکل چھوڑ دینا“ میں انسان کی بدترین عادت سے نہ بچ سکا اور اس پر یہ ظاہر کرنے لگا کہ میں اس سے بہتر جانتا ہوں۔

شکر ہے اس نے میری بات کا ٹوس نہ لیا۔ ”چاچا جی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میں کسی چیز میں زیادہ عرصے تک دلچسپی نہیں لے سکتا۔ یہاں۔۔۔ کر میں نے کوئی دس بارہ Odd Jobs کئے ہیں۔ پہلے چند دن تو میں بڑا جوش و خروش ظاہر کرتا ہوں۔ پھر متنفر ہو جانا میری عادت ہے۔۔۔ چلو جی کام تک تو ٹھیک ہے، لیکن میں زیادہ دیر تک کسی سے محبت بھی نہیں کر سکتا۔ میرے اندر محبت اور نفرت کا عمل چکر میں چلتا ہے۔ میں جس قدر احساس کمتری کے تحت اپنے سے نفرت کرتا ہوں، اتنا ہی میں اپنے محبوب سے بھی اپنی ذات کی نفرت کے تحت ظلم کرتا ہوں۔۔۔ میں نے اپنے ماں باپ کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔ چاچا جی سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ان ہی کی بدولت میری تعلیم ادھوری رہی۔ وہی مجھے ڈسپلن نہ کر سکے۔ ان کی بدولت مجھے فوکس ہونے کا موقع نہ ملا۔ میں اپنی عادات میں منظم نہ ہو سکا۔ میں ذہنی طور پر اتنا ڈیپریشن کا شکار ہو گیا۔ چاچا جی۔۔۔ کہ مجھے اپنے سوائے نہ کسی کا خیال رہا، نہ میں اپنے احساس کمتری کے باعث کسی اور کا خیال رکھ سکا۔۔۔“

”ڈیپریشن بیماری نہیں ہے حالت ہے۔۔۔ یہ کبھی کبھی راتوں رات غائب جاتی ہے۔ کبھی سائیکو تھیرپی Bsychoanalysis اور ڈرگز سے بھی کچھ فائدہ نہیں۔۔۔“

”اس لئے کہ یہ بیماری نہیں چاچا عذاب ہے۔۔۔ عذاب الہی، آپ کو معلوم ہے کہ

یہ بیماری کیوں ہوتی ہے۔“

”کہتے ہیں کہ بچپن میں سن بلوغت میں اگر جذباتی ہم آہنگی میسر نہ آئے تو ڈپریشن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس عمر میں احساس نہیں ہوتا، لیکن بیماری کا بیج بویا جا چکا ہوتا ہے۔“

”یہ وجہ ڈاکٹر لوگ بیان کرتے ہیں، لیکن ایک وجہ مجھے اور بھی معلوم ہو گئی ہے چاچا جی وقت کے ساتھ... تجربے کے ساتھ... ڈپریشن ناشکرگزار کی قلبی بیماری ہے... کچھ لوغم سے سمجھوتہ کہتے ہیں۔ ڈپریشن والا اپنے آپ کو غم کے سیاہ گھوڑے پر سوار نہیں ہونے دیتا۔ اس کا پاؤں رکاب میں پھنسا رہتا ہے اور وہ گھسٹتا چلا جاتا ہے، رگیدا جاتا ہے... اور سوار اس لئے نہیں ہو پاتا کہ وہ غم کے سیاہ گھوڑے کا کبھی شکرگزار نہیں ہو پاتا۔ اسے کبھی علم ہی نہیں ہو سکتا کہ غم اس کے امکانات کو ابھارنے، اسے بہتر انسان بنانے کے لئے آیا تھا... میری ماں تو جلد فوٹ ہو گئی تھی، لیکن میں نے اپنے باپ کو بڑے دکھ دیئے چاچا جی... اولاد کو جو آزمائش کہا گیا ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ وہ والدین کی شکرگزاری نہیں ہوتی... وہ والدین کی ساری محنتوں، قربانیوں، انتظاروں کا صلہ ناشکرگزار ہو کر دیتی ہے۔“

”چلو چل کر کافی پیتے ہیں آؤ چلو... یوں اپنے دل پر بوجھ ڈالنے سے حاصل؟ کبھی ماضی کو پھروالتے رہنے سے بھی کچھ ملا۔“

”شاید مل جائے کوئی سبق... کوئی راستہ... چاچا جی میرے باپ نے بڑی محنت کر کے فیروز پور روڈ پر ایک پلازہ بنایا تھا۔ ہم لوگ اچھرہ میں رہتے تھے۔ میرے باپ کا اتنا بڑا دل تھا کہ ہمارا گھر شہد کے چھتے کی طرح بھنھناتا رہتا۔ گاؤں سے مقدمے لڑنے والے دیہاتی رشتہ دار... بیوہ غریب عورتیں... تعلیم کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے نوجوان، شادی کی تیاری کر نیوالی شاپنگ شاپنگ پکارنے والی لڑکیاں... اقرباء کا ایک ہجوم پلتا تھا ہمارے تین منزلہ مکان میں... جب دوسری

باربی اے میں میری کپارٹ آئی تو میں ڈیپریشن کے شدید دور سے گزرا۔ کئی مرتبہ تو میں اپنے مستقبل، اپنی ذات، اپنے حالات سے اس درجہ مایوس ہو جاتا کہ مجھے اپنی زندگی مکمل طور پر بیکار تھی۔ میں سنجیدگی کے ساتھ خودکشی کے متعلق سوچتا رہتا۔ کبھی ٹرین کے نیچے آنے کا منصوبہ، کبھی زہر کھالینے کا تصور۔۔۔ کبھی مینار پاکستان سے چھلانگ لگانے کی خواہش سوچتے جاگتے میرا تعاقب کرتی۔۔۔ چاچا جی جانتے ہیں روز ازل اللہ اور ابلیس کے درمیان کیا معاہدہ ہوا تھا۔۔۔ اللہ نے ابلیس کو قیامت تک کس چیز کی مہلت دی تھی۔۔۔“

مجھے اس نوجوان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ وہ بڑا ذہین، جان دار اور سوچنے والا جوان تھا جو اپنے متعدد سوالوں کے بدلے صرف ایک شافی جواب کی تلاش میں تھا۔
 ”میں وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے بیٹے۔۔۔ بانی دیوے تمہارا نام کیا ہے۔۔۔“
 ”میرے جیسے روندے ہوئے پامال لوگوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ ہم عمارتوں کا ملبہ ہوتے ہیں۔ نہروں میں نیچے بیٹھ رہنے والا گارا ہوتے ہیں۔ ہم سڑکوں پر اڑنے والے پلاسٹک کے وہ لفافے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور جو کوئی چیز سنبھالنے کے کام نہیں آتے۔۔۔ آپ مجھے مسٹر جنک پکار لیا کریں چاچا جی۔۔۔“
 ”تم تو کارنیشن کا پھول ہو بھائی میاں۔۔۔ خوبصورت اور خوشبو دار۔ میں تمہیں مسٹر جنک کیسے پکار سکتا ہوں؟“

”جو شخص اللہ کی رحمت سے مایوس ہو وہ بیکار نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں انسان کو مایوس کون کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے۔۔۔“

”ماں بھائی میرے ایسی گہری باتیں نہیں سوچا کرتا میں۔۔۔“
 مسٹر جنک نے کہا۔۔۔ ”سینے چاچا جی! جب ابلیس نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو ابلیس نے دعویٰ کیا کہ وہ انسان کو بہکائے گا اور اسے اللہ کی رحمت سے مایوس کرے گا۔ باری تعالیٰ نے ابلیس کو روز قیامت تک مہلت دی۔۔۔ ابلیس نے

دعویٰ کیا کہ وہ انسان کو اغواء کرنے میں کامیاب ہوگا۔۔۔“

میں نے ہنس کر کہا۔۔۔ ”بھائی میرے اللہ کے سامنے کیسا دعویٰ۔ یہ تو بھول تھی ابلیس کی۔

”آپ جانتے ہیں چاچا جی! ابلیس کا دعویٰ بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ اماں حوا کو بہکانے میں کامیاب رہا۔۔۔ پتہ ہے ابلیس کیا کرتا ہے۔۔۔ اس کی کارروائی کا کیا طریقہ ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”چاچا جی! ابلیس انسا کے نفس سے ساز باز کرتا ہے۔ نفس میں امنگ، خواہش، ضرورت کو جگاتا ہے۔ جس قدر خواہش ناممکن ہوگی، اسی قدر ابلیس اسے عین ممکن کر کے دکھائے گا۔ نفس اس قدر غائب آجائے گا کہ وہ پورے انسان کو بڑے کنویں جھٹکوائے گا۔ کبھی پیروں، فقیروں کے پیچھے، کبھی مزاروں کے طواف، کبھی اللہ کی حضوری میں انسان اپنی خواہش کی عرضی ڈالے گا، جوں جوں خواہش کے پورا ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں، انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا جائے گا۔۔۔ دولت کی ہوس، نام و نمود کی خواہش، عورت کا آزاد، ایک کارخانہ کھلا ہے نفس کے اندر۔۔۔ وہ امید دلا دلا کر۔۔۔ کوشش پر آمادہ کر کے خواہش کے جال میں جکڑ کر انسان کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرتا ہے۔ اور جو نبی انسان اللہ سے مایوس ہونے لگتا ہے۔ ابلیس اغواء کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں انسان کے قلب پر کیا گزرتی ہے ایسے میں۔“

”بھائی تو مجھ سے بڑی پڑھی لکھی باتیں کر رہا ہے۔۔۔ میں ٹوٹا پھوٹا شاعر ضرور ہوں، لیکن میں نے کبھی ایسی باتیں نہیں سوچیں۔۔۔ میں تو ساری عمر میں بزنس کی ایک معمولی ریجنر شاپ سے چل کر امپورٹ ایکسپورٹ کے کام تک پہنچا ہوں۔ فرق، ایئر کنڈیشنر، الیکٹرک سامان امپورٹ کیا کرتا تھا میں۔۔۔ جب سے میرے

دونوں بچے امریکہ آ گئے، اس کام کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی۔۔۔۔۔“
 وہ عام ڈیپریشن کے مریض کی طرح میری بات نہیں سن رہا تھا۔ یقیناً وہ اپنے ہی
 اندر کہیں گھسن گھیریاں کھا رہا تھا۔

”جب انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے، امید مرجھانے لگتی ہے تو چا چا جی
 انسان کے اندر پہلے تو کھلبلی مچتی ہے، پھر وہ حدیث نفس کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے میں
 وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ اس کا نفس اور وہ خود مکالمہ کرتے رہتے
 ہیں۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کے خلاف باتیں دل میں ابلنے لگتی ہیں۔ جن سے وہ محبت کا
 اعتراف کیا کرتا ہے، ہولے ہولے جب حدیث نفس پختہ ہو جاتی ہے، تلاوت الوجود
 کی عادت پڑ جاتی ہے تو اللہ کے برگزیدہ لوگوں کے خلاف بھی نعوذ باللہ منفی باتیں
 سوچنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ وقت گزر جائے تو اندر سے طعنے، گالیاں،
 منفی سوچ کی بوچھاڑ اللہ پر ہونے لگتی ہے۔ جس نے اس کی خواہش پوری نہ کی اور
 اسے مایوسی کے حوالے کر دیا۔ عام انسان کے دل میں بھی محبت اور نفرت کا جذبہ بیک
 وقت کسی شخص کے لئے موجزن ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ وہ نارمل ہونے کی وجہ سے
 نفرت پر قابو پالیتا ہے، لیکن ڈیپریشن والے کی مایوسی اسے محبت کرنے ہی نہیں دیتی۔
 میرے باپ نے میرے لئے اتنا کیا۔۔۔ اتنا کیا میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ وہ چاہتا تھا
 کہ میں انجینئر بنوں۔ پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں ذہین تھا، لیکن میں نے باپ سے
 نفرت کی وجہ سے پڑھائی کی طرف توجہ نہ دی۔ میرا نفس مجھے اس بات پر آمادہ رکھتا کہ
 میں بغیر پڑھے فسط ڈویژن حاصل کر سکتا ہوں۔ میں معجزے کا منتظر تھا۔۔۔۔۔ دوبار
 جب میری انگریزی میں کپارٹ آئی تو میں نے اس شکست کا سارا بوجھ الزام کی شکل
 میں اپنے باپ پر ڈال دیا۔۔۔ مجھے جو احساس جرم ستاتا، میں اس کی وجہ اپنے باپ کو
 سمجھتا۔ میں اسے طعنے اور کچھ کے لگاتا کہ اس نے ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی مدد کی
 اور میری جانب سے بے توجہی برتی۔۔۔۔۔ اہاں تو خیر بہت پہلے فوت ہو گئی تھیں، ورنہ

میں انہیں خود اپنے ہاتھوں قتل کر ڈالتا۔ میں ناکامی، منفی سوچ، احساس جرم اور محرومی کو اپنے والدین کیسر تھو پتا رہتا۔۔۔ میرا خیال تھا کہ ان دونوں نے گھر کو ہوٹل میں تبدیل کر کے اپنی ذمہ داری نہ نبھائی تھی۔ ان پر سارا الزام ڈالنے کی وجہ سے Catharsis تو ہو جاتا لیکن حدیث نفس کم نہ ہوتی۔“

”ہو جاتا ہے۔۔۔ ہو جاتا ہے انسان کی زندگی ہو جائیگی ہی تو منتظر رہتی ہے۔۔۔“

”چاچا جی۔۔۔ پھر ایک واقعہ ہو گیا۔ میرا ایک دوست امریکہ چلا آیا۔ اس کا نام لاٹری میں نکل آیا تھا۔ جونہی وحید امریکہ پہنچا، اس نے مجھے اکسٹنا شروع کر دیا کہ یہ مواقع کا ملک ہے۔ کسی ایجنسی سے امیگریشن کا چکر چلا کر فوراً پہنچو۔۔۔ میں نے بڑی تگ و دو کی۔ میرے باپ نے چار پانچ لاکھ روپیہ مجھے دیا۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا شکر گزار نہ ہوا۔۔۔ امریکہ پہنچا تو کچھ دیر تو وحید نے امانت کی، لیکن یہاں کسی کی بیساکھی بننے کا رواج نہیں۔ میں نے لاوہر میں کبھی غریبی کا مزہ نہ چکھا تھا، آرام وہ زندگی کا عادی تھا۔۔۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ جو میری Face Value ہے وہی چلے گی، دس کانٹ ہزار کی کرنسی شمار نہیں ہوتا۔۔۔ یہاں آکر حدیث نفس پہلے سے زیادہ ہو گئی۔۔۔ سٹوروں پر کام کیا، پٹرول پمپ پر گاڑیوں میں پٹرول بھرے۔۔۔ دو تین ہوٹلوں میں بیرا گیری کی۔۔۔ ٹیکسی چلائی، لیکن کبھی باپ سے رابطہ نہ کیا۔۔۔ میں نے اپنے متعلق جس احساس کمتری کو اندر پل رکھا تھا۔ ہر پرانے کام کو چھوٹے وقت نئے کام کو حاصل کرتے ہوئے اس کی تصدیق ہوتی رہی۔ میں اپنے آپ سے کہتا یہی تیری اوقات ہے۔ وحید اس دوران سو فٹ ویئر کی دکان بنا چکا ہے، میں اس کے دائرہ احباب میں نہیں ہوں۔ اس بات کا بھی دل کورنج رہتا ہے، کیونکہ لاہور میں وہ ہمارے کوٹھپیر مجھ سے مانگ مانگ کر پینٹیں اڑایا کرتا تھا۔ اب میری بس ہو گئی ہے۔

چاچا جی اب میں اور زیادہ نہیں لے سکتا۔۔۔ وطن کی مٹی مجھے راس نہیں آئی اور امریکہ کی ہواؤں میں اڑنا میرے لئے ممکن نہیں۔۔۔ آپ نے پوچھا تو بتا دیا ورنہ۔۔۔ اب تو

مجھے کسی سے بات کئے بھی ہفتے گزر جاتے ہیں۔“

”پیارے بیٹے جہاں تک تمہاری باتوں سے میں اندازہ لگا سکا ہوں ... یہ تمہاری بیماری نہیں، صرف قلب کی حالت کا بیان ہے اور قلب کچھ بیماریوں کا شکار ہوا کرتا ہے۔ شرک، ناشکر گزاری اور تکبر، بلکہ یوں سمجھو تکبر ہی ناشکر گزاری کو جنم دیتا ہے۔ اگر ترقی والوں کی مدد سے اس کا علاج کرو گیتو گولیاں پھانکو گے۔ کبھی سائیکو Psychoanalysis کراؤ گے، کبھی سائیکو تھریسٹ کے پاس جاؤ گے۔“

”جاتا رہتا ہوں جی ...“

”ایک علاج فلاح والوں کا بھی آزما دیکھو ... اپنے قلب کو ذکر اللہ کے حوالے کرو ... اللہ کے ذکر کے علاوہ [یہ] بات قلب ممکن نہیں ...“

”حدیث نفس ختم ہو جائے گی۔ میرے اندر کی منفی سوچیں جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا، ہے کیا کیا کیا۔ یہ میرا پیچھا چھوڑ دیں گی؟“ مسٹر جنک نے سوال کیا۔

یہاں اسلامک سنٹر میں مانیجر یا کے ایک صوفی جمعرات کی شام کو ذکر کی محفل گرم کراتے ہیں۔ پاس انفاس سکھاتے ... وہاں پہنچ جانا ...

”آپ وہاں جاتے ہیں چا چا جی۔“

”ہاں کبھی کبھار ... لیکن تم ضرور جانا ... تمہیں فلاحی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا ... میں نیاس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا اور آہستہ سے پوچھا ”اپنے چا چا جی کو نام نہیں بتاؤ گے اپنا ...“

اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے امید کی چمک آئی۔

”احمد ... پتہ نہیں یہ نام میرے گدھے باپ نے کیوں رکھ دیا؟“

گزیو کی جانب چلتے ہوئے مجھے اس آدمی کی کہانی یاد آئی جو ہمیشہ نفع کا دی رہا اور کبھی نقصان کے راستے پر نہ چلا۔ ایک دنیا دار ہمہ وقت پریشان رہا کرتا تھا۔ طمانیت قلب اس سے کوسوں دور تھی۔ راحت اور عافیت کو ترستہ رہتا۔ ایک روز صبح دم اٹھا تو

دل میں خیال گزرا کہ اگر میرے مسائل طے ہو جائیں اور میں اطمینان قلب کو پہنچوں تو میں اپنا محل نما گھر بیچ دوں گا اور اس سے جو حاصل ہو گا وہ راہ مولیٰ خیرات کر دوں گا۔۔۔ کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس کے مسائل ختم ہو گئے اور وہ جین سے سونے لگا۔ اب قسم یا د آئی، لیکن دل میں معاصر ص جاگی۔ اس نے سوچا محل بیچ کر جو خطیر رقم حاصل ہوگی، وہ تو غربا میں تقسیم کرنا حماقت ہوگی۔ معاً اس نے اپنے بچاؤ کے لئے ترکیب سوچی۔ گھر کے آگے میل کا جو بورڈ لگایا۔ اس پر رقم کیا کہ یہ گھر ایک روپے میں قابل فروخت ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک بلی بھی خریدنا ہوگی جو اس گھر کی مکین ہے۔ بلی کی قیمت علیحدہ بتائی جائے گی۔

ایک گا ہک نے مکان اور بلی کو اس طرح خریدا کہ جو بلی کا دام تو ایک روپیہ تھا، لیکن اس میں بسنے والی بلی کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی۔ مکان سے حاصل ہونے والا روپیہ تو مالک مکان نے خیرات کر دیا اور بلی سے حاصل شدہ رقم چونکہ وعدے میں شامل نہ تھی، اس لئے اسے اپنے لئے مختص کر لیا۔۔۔ سنا ہے کچھ دیر بعد وہ پھر راتوں کو جا گئے گا اور راحت، عافیت، اطمینان اس سے کوسوں دور ہو گئے۔۔۔ ہم یہ اپنے فائدے کے متعلق سوچتے رہنے والوں کا انجام ان کے فیصلوں میں چھپا رہتا ہے۔۔۔ وہ نفع کے عادی ہونے کے باعث فلاح کو پا نہیں سکتے۔

میں پھر اپن پرانی سوچ کی طرف لوٹا ہوں۔

اگر آپ غور سے امریکی معاشرے کا جائزہ لیں تو آپ بھی غالباً اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ امریکی معاشرہ اینٹی کرائسٹ نہیں ہے۔ جہاں تک مذہبی رسوم پرستی کا تعلق ہے، وہ ابھی بھی پورے زور و شور سے کرسمس اور ایسٹر مناتے ہیں۔ اربوں ڈالروں کی تجارت کرسمس کے تہوار سے وابستہ ہے، لیکن وہ اندر سے حضرت عیسیٰ کو نہیں ان کی تعلیم کو رد کر چکے ہیں۔ ان کے لئے محبت کا مفہوم ڈالر کی آندھی میں خس و خاشاک کی طرح کھو ہو گیا ہے۔ اب امریکی معاشرہ اینٹی کرائسٹ نہیں، اینٹی لومعاشرہ ہے۔ جس

طرح مسلمانوں نیا اپنے معاشروں سے اسلام کے بنیادی تصور عدل کو نکال پھینکا ہے۔ کسی بھی اسلامی ملک میں کہیں بھی مساوات پر یکٹنس نہیں کی جاتی۔ ایسے ہی امریکی اب پرسنل محبت کی جگہ یونیورسل ہمدردی کے گاہک ہے۔ عیسائیت کی یہ روح تھی کہ کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو اسے دوسری گال پیش کر دو۔ اپنے ہمسائے سے ایسی محبت کرو جیسی تم اپنے آپ سے کرتے ہو اپنے نیگرو ہمسائے پر Peoples Court میں یہ مقدمہ دائر نہ کرو کہ وہ گھاس نہیں کاٹتا اور آپ کے گھر کی قیمت نہیں بڑھ سکتی۔ بس وہ آپ کا ہمسایہ ہے اور ہمسائے سے محبت عیسائیت کا جوہر ہے۔

یہاں ایک مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید امریکی معاشرہ کسی چالاکی سے براؤن، سیاہ، چھٹی ناک والے اور دوسرے نسلی اختلافات رکھنے والوں سے فاصلہ قائم رکھتا ہے۔ اس مغالطے سے بھی نکلنے کی ضرورت ہے۔ یہاں آپ کو اللہ ترس، ہمدرد لوگوں کی بھی ایسی کھیپ ملے گی جو بے شمار فانی کاموں میں مشغول ہیں اور اپنی آمنی کا معتد بہ حصہ خیراتی کاموں میں لگاتے ہیں، لیکن یہ ہمدردی کا جذبہ محبت نوع کی چیز سے ذرا مختلف ہے۔ سفید فام لوگوں کا امریکی معاشرہ Impersonal ہمدردی کرتا ہے۔ وہ جذباتی طور پر ایسے کاموں میں مبتلا نہیں ہوتا جو اس کے دل پر دستک دیں اور اسے غم آشنا زندگی کے حوالے کر دیں۔ سفید فام لوگ فیصلہ کر چکے ہیں کہ غیر شخصی ہمدردی تو مصروف زندگی کے ساتھ، متعصب خیالات کے ساتھ ساتھ ممکن ہے، لیکن پڑوسی سے ویسی ہی محبت کرنا جیسی اپنی ذات سے ہوتی کے راستے پر ممکن نہیں، کیونکہ ترقی کام کی پجار نہیں، انسان کی متلاشی نہیں۔

کام کے لئے سب سے بڑی اہمیت وقت کی ہے۔ کام کر آدمی وقت ضائع نہیں کر سکتا اور انسان کی کھوج کسی نئے برصغیر کو تلاش کرنے کے برابر ہے۔ تلاش میں وقت ضائع ہوا ہی کرتا ہے، چونکہ کوئی انسان بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے اپنے سے کم

تر لوگوں کو Human Rights تو دیئے جاسکتے ہیں، ان سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ اپنے سے احقر محبت کے قابل نہیں ٹھہرتا۔۔۔ اسی مشکل نے امریکی معاشرے میں ایک خاص قسم کی ٹیڑھ پیدا کر دی ہے۔ پرائیویسی، فاصلے اور رشتوں کی زیوں حالی کو جنم دیا ہے۔

سندھ سے نکل کر ہم نے ٹمپل روڈ پر ایک مکان ڈرا ساندرا کی جانب الاٹ کرالیا تھا۔ یہاں ہی پہنچ کر دادی کو شوگر کا عارضہ ہوا اور اباجی ہم سے رخصت ہو گئے۔ شاہد بھائی نے ہال روڈ پر بہت پہلے ایک دکان میں ریپینر کا کام شروع کر دیا۔ شاہد بھائی جزوقتی شاعر تو تھے، لیکن شادی کے بعد ہمہ وقت سیدھے سادے مستری بن گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی پتہ نہیں کیسے اور کیوں میں بھی شاعری کرنے لگا۔ شاہد بھائی کا اصرار تھا کہ میں بی اے کرنے کے بعد ان کے ساتھ دوکان پر بیٹھوں اور ٹانگے لگانے اور مرمت کرنے کا علم سیکھوں۔

ان دنوں آپا کی شادی تھی اور اس کی تیاریوں میں ان کی من چاہی سہیلی اقبال ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ اقبال جیل روڈ پر رہتی تھی اور اس کی سفید موریں کا ہم پر بہت رعب تھا۔

اقبال کا رنگ بھی ایسا تھا کہ کبھی امریکن لگتی کبھی ہسپانوی۔۔۔ کبھی اس کے گال سرخ سرخ ہوتے، کبھی زرد خوبانی جیسے۔ اس کے جسم میں لہروں والے ہلکورے پنہاں تھے جب بھی چلتی یوں لگتا انسان نہیں پانی کی لہر ہے۔۔۔ میں اپنے ساحل کو اس لہر کے ٹکراؤ سے بچانا چاہتا تھا، لیکن آپا کی شادی ایک مرحلہ وار عمل تھا۔ اقبال اور آپا قریباً روز سفید مارس پر انا کلی جاتیں۔ پھر کسیرے بازار سے برتن آتے۔ زیورات کی جانچ پڑتال کے لئے ڈبی بازار بھی جانا پڑتا۔ اقبال عمر میں آپا سے بہت چھوٹی تھی۔ پھر بھی دوستی جاری تھی اور اس کی لپیٹ میں شاہد بھائی اور میں دونوں آئے ہوئے تھے۔ اس روز وہ کھڑکی میں بیٹھی ٹانگیں جھلا رہی تھیں۔ آپا غسل خانے میں تھیں۔ باہر

التماس کے درخت پر کونل کوک رہی تھی۔ میں اپنی غزل سنانے کے لئے آپا کے پاس پہنچا۔ ان دنوں میں شاہد بھائی کا نقل چوتھا۔ جو کچھ میرے اس رورل ماڈل کو کرنا ہوتا مجھ پر حکم ہو جاتا تھا۔

آپا کہاں ہیں۔ میں نے سوال کیا۔

ابھی نہانے گئی ہیں۔ اقبال نے جواب دیا۔

اچھا ... میں چلتا ہوں۔

بیٹھ جائیے۔ نکلنے والی ہیں۔

میں انہیں اپنی غزل سنانے آیا تھا۔

وہ کھڑکی کی سیل سے اتر آئی۔ بی کی سی سبک پانی کے ساتھ

مجھے سنانا پسند کریں گے اپنی غزل۔۔۔

اس زمانے میں ایکٹرس راگنی کی آنکھوں کا بڑا چرچا تھا۔ اقبال کی بڑی بڑی غزالی

آنکھوں کے پورے بھی ویسے ہی بھاری تھے اور ان میں جھلکنے والی روح ہزار پردے میں رہتی تھی۔

وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب مجھے غزل سنانا مشکل ہو گیا۔ قافیے سامنے

لکھ کر غزل بنانے کا عمل آوردی تھا۔ ایسی جوڑ توڑ والی غزل اس غزال کو سناتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی۔

سنائیے ناں۔

کیا سناؤں جی معمولی سی کوشش ہے۔

کیوں کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں؟ مجھے آپا نے پہلے آپ کی نظم سنائی تھی۔

کون سی نظم۔

جلترنگ ... اقبال نے مسکرا کر کہا۔ اچھی نظم تھی۔ غزل سنائیے ناں۔

میں نے مطلع پڑھا تو غسل خانے کا دروازہ کھلا۔ آپا باؤں کو تو سنے میں لپیٹے ننھی

بوندوں کو چہرے پر سجائے برآمد ہوئی۔

ہاں ہمایوں؟

رفعت آپ یہ آپ کو اپنی غزل سنانے آئے ہیں۔

ہاں تو سناؤ ناں ہمایوں۔

میں نے پھر مطلع پڑھا تو دونوں نے بڑی دادی دی۔ میں اقبال کو فاصلے سے دیکھتا رہا۔ وہ مالی طور پر ہم سے بہتر تھی اور اس کا چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا ظاہر کرتا تھا کہ وہ افسر کلاس میں بڑھی پٹی تھی۔ دوکانداروں، چھوٹے تاجروں، کلرکوں، کارندوں سے اسے دور کا بھی واسطہ تھا۔ وہ سرکاری افسروں کے کلچر کی آئینہ دار تھی۔

میں نے ساری غزل لہک کر ترنم کے ساتھ سنائی اور بعد میں اس بات پر خود حیران رہ گیا کہ اتنی بڑی شہزادی کے حضور میں نے اتنی جرات کیسے کی؟

جتنی دیر میں غزل سناتا رہا، وہ دونوں چپ چاپ بیٹھی سنتی رہیں۔ پھر اپنی باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ کچھ دیر میں سمجھ نہ پایا کہ مجھے بیٹھے رہنا چاہئے کہ چلے جانے میں بہتری ہے۔ کپڑے لٹے گوٹے کناری میک اپ کے سامان میں وہ اس قدر کھوپچی تھیں کہ انہیں بھول گیا، کوئی ان کی تعریفی بارش کا منتظر ہے۔

گرمیاں کچھ تیزی دکھا رہی تھیں۔ رات کے قوت ہم بہن بھائی گھر کے دالان میں چارپائیاں بچھا کر پیڈ مثل فین کی ہوا میں سوتے تھے۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ اس کی چارپائی عین پنکھے کے سامنے ہو۔ امی ابو اندر ہی سوتے تھے۔ اندر والے پنکھے کے بیرنگ خراب تھے۔ ساری رات اس سیلنگ فین کی گھر گھر رگھپ... گھر گھر رگھپ سنائی دیتی، چونکہ آپا کی شادی قریب تھی۔ اس لئے اس نے ہر معاملے میں اپنے خصوصی حقوق کو منوانا شروع کر دیا تھا۔ ایسے ہی جگے ٹیکس میں اس کی چارپائی پڈ مثل فین کے سامنے پہلی ہوتی۔ دن بھر یہ چارپائیاں اور فین آنگن میں پڑے رہتے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔

میں چار پائیوں کی لمبی قطار میں آپا کی چار پائی پر بیٹھا تھا۔ نہ جانے باقی سب کہاں تھے کہ اپنی سفید موڑس میں اقبال آگئی۔ اس کے آنے سے پہلے میں نے اس کی اونچی ایڑی کی ٹک ٹک سن لی تھی۔ اس آواز نے میرے دل میں خلل امن پیدا کر دیا۔ شاید اسی لئے ایڑیوں کو یوں ٹھونک ٹھونک کر چلنا منع تھا۔

و میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے خوفزدہ کبوتر کی طرح آنکھیں چرانے میں عافیت سمجھی اور پیڈ مثل فین پر نظریں جمادیں۔

السلام علیکم جی

اس جی میں پورے سات مرتبے۔

وعلیکم السلام

میں نے جواب دیتے وقت اس کی جانب دیکھا۔ اس نے فٹ مٹی پہن رکھی تھی، جس کے بازو جالی سے بنے تھے اور سڈول بازو سفید سنگ مرمر سے تراشیدہ نظر آتے تھے۔ کندھوں پر چنت کیا ہوا دوپٹے موٹے رے کی طرح لاپرواہی سے پڑا تھا۔ سینڈل سفید پلاسٹک کی تھی جو شیشے کی طرح شفاف تھی۔ کبوتری کے پاؤں اس موتی جڑے سینڈل میں اور بھی سڈول ہو گئے تھے۔

تمہیں پتہ ہے بغیر لائسنس کے اسلیمیلے کرشہر میں پھرنا ممنوع ہے۔

موتی موتی آنکھوں پر ہار ہار پوٹے پھڑکا کر اس نے پوچھا۔

جی..... میں سمجھی نہیں۔

تھری ناٹ تھری کا لائسنس لینا پڑتا ہے، ورنہ خلل امن کے تحت گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

آپ اتنی مشکل مشکل باتیں اور ایسے ثقیل الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں۔

اس لئے مس اقبال میرا دادا مدرس تھا۔ وہاں گاؤں میں ہمارے گھر میں دادا جی کی پوری لائبریری تھی۔ ہم سارے بہن بھائی ان کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے

تھے۔ کچھ حصہ کتابوں کا تو ابا ساتھ بھی لے آئے تھے۔

شاید وہ میرا اشارہ سمجھ چکی تھی، پر تجاہل عارفانہ کی کٹاری استعمال کرتے ہوئے
اقبول بولی۔ وہ ابھی آپ ہتھیاروں کی بات کر رہے تھے۔ میں سمجھی نہیں۔

آپ کو اپنی تواریخ نام میں رکھنی چاہئے۔ کچھ پبلک نہتی اور خوفزدہ ہوتی ہے۔ ایویں
فساد پھیلتا ہے۔

میں کیا کروں؟

یا تو آپ کھدر کا کھلا چولا پہنیں۔ پھر برقعے سلوائیں اور کچھ نہیں تو چادر میں لپیٹی
لپٹائی آیا کریں ورنہ تو معصوم لوگوں کا بہت نقصان ہوگا۔۔۔ ویسے تو آپ کو ہاتھوں پر
بھی دستانے اور پیروں میں بھی جرابیں پہننی چاہیں۔ میں نے شرارت سے کہا۔

میں آپ کو ہتاؤں۔۔۔ کہ معصوم لوگوں کو چاہئے کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں اور ایک نظر
غلط کے بعد گھورنیر مائل نہ ہوں۔

واہ واہ۔۔۔ اب تو آپ بھی اردو میڈیم کی پڑھی ہوئی لگتی ہیں۔ ذرا بھی مشنری سکول
کی پڑھی ہوئی معلوم نہیں پڑتیں۔

صحبت کا اثر ہے۔

کس کی؟

وہ مسکرائی اور خوش دی سے بولی آپا کی اور کس کی۔

جب آپا کی شادی ہوگی تو پھر آپ آیا کریں گی۔ ادھر ٹمپل روڈ۔

لیں خواہ مخواہ..... پھر یہاں آکر کیا کرنا ہے۔

کرنا تو کچھ نہیں پر آتے جاتے رہنا ہے۔

وہ ہنس دی۔

اس کی ہنسی میں کچھ چھوت کے جراثیم تھے۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ ہماری ہنسی کے

جلترنگ کو سن کر میرے دونوں چھوٹے بہن بھائی آگئے۔ نہ جانے وہ اس سے پہلے کہاں

تھے۔ فرید ہاؤز ظفر کی آمد مجھے ناگوار گزری، لیکن ان کا آنا ہی اقبال کے قیام کا باعث بنا۔

آپ کیا کہاں ہے۔

آپ اتو امی کے ساتھ ڈبی بازار گئی ہیں۔

اقبال نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے کو چھوا۔ آپ سے کہا بھی تھا کہ مجھے ذرا دیر ہو جائے گی ذرا رک جاتیں تو کار پر چلے جاتے۔ اس کی آواز میں عجیب سا تاسف تھا۔

ان دنوں ہمارے پاس کار نہیں تھی اور سفید موٹر ہم سب کے نزدیک امیری کی انتہا تھی۔ ڈرائیور والی کار تو ویسے بھی لاہور کی سڑکوں پر کم کم دکھائی دیتی تھیں۔

الھر فریدہ کو ان دنوں لوڈو کھیلنے کا خطبہ تھا۔ وہ دو چوٹیاں کر کے اپنے آپ کو مرلین منرو سمجھتی تھی۔

آپ لوڈو کھیلیں گی باجی اقبال۔

کیمر کھیلیں باجی؟ دسویں کے نوجوان ظفر نے سوال کیا۔

تب کلچر ڈ ظاہر کرنے کے لئے ان ڈور گیمز بھی وصف شمار ہوتی تھیں۔ ابھی نیلی ویشن اور انٹرنیٹ نے ٹیک اوور نہیں کیا تھا۔ وقت کو گزارنے کے تفریحی مشاغل سادہ تھے۔

نہیں بھی مجھے دیر ہوتی ہے۔

میں یکدم جھلس گیا۔

اور وہ جو آپ ڈبی بازار میں آپ کے ساتھ گھنٹوں صرف کرتیں ہیں تب دیر نہیں ہوتی۔ میں چڑ کر بول۔

چلو لوڈو سہی۔

فریدہ اور مجھے پارٹنر بنا کر ظفر کے ساتھ اقبال لوڈو کی بازی پر بازی جیتی چلی گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بہنوں کی سہیلیوں کے ساتھ کیرم، لوڈو یا تاش کھیلنے پر اعتراض تو

تھا، لیکن والدین چپ رہا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ایک عجیب رنگ سوسائٹی تشکیل پا رہی تھی۔ لوگ باگ اپنے خاندانوں سے کٹ کر اجنبی لوگوں سے ملنے پر مجبور تھے۔ اکا دکا ن شادیاں خاندان سے باہر ہونے لگیں تھیں۔ اونچی جاتی کے لوگ جیسے خطرہ محسوس کر رہے تھے اور ان کی ٹولیاں آپس میں بیٹھ کر شیخیاں بگھارنے، ماضی کو یاد کرنے اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے میں وقت گزارا کرتے تھے۔ شیخی اور پدرم سلطان بود در اصل خوف کے باعث پیدا ہوا تھا۔ کمبیس اندر ہی اندر یہ اونچی ذات والے اپنی سلیت کو Threatened سمجھنے لگے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ مختلف النوع قسم کی آبادی ان کی قلعے بند روایات کو توڑنے کی طاقت رکھتی ہے۔ ایسے لوگوں کی اولاد تعلیم کی خاطر نئے میل جول اختیار کرنے پر مجبور تھی۔ لمبا ٹوپی والا برقعہ دلخست ہو چکا تھا اور کوئی کوئی گھرانہ صرف چادر کے سہارے چلنے لگا تھا۔ ہمارے ٹپل روڈ پر Nuns والے کالے برقعے عام طور پر نظر آتے تھے۔ محلے میں عورتوں کا میل جول کم کم تھا، چونکہ عورت ہی عموماً رشتے نامطے مستحکم کیا کرتی تھی۔ اس لئے جہاں تک میل ملاقات کا تعلق تھا یہ عہد بڑوں کے لئے نئے خوف اور سوچ لیکر آیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہمارے والدین اور دادی دادی ہمیں زیادہ منع کرنے کے عادی نہ تھے۔ ان کی محبت میں چشم پوشی کی روایت گہری تھی۔ وہ مثال سے سکھانے کے عادی تھے۔ بچوں کو مذہبی درس اور اخلاقیات زبانی کلامی سکھانے کا رواج تھا۔ نوجوان عموماً گھروں کو دیر سے اٹھتے، لیکن ان کے لئے کنڈیاں کھول دی جاتیں۔ کھانا رکھ دیا جاتا اور ان کی آوارہ گردی پر نہ تو تبصرہ ہوتا نہ ہی پوچھ گچھ۔ بس لڑکا خود بخود ہی کہیں پہنچ کر سمجھ جاتا، سارے میں خبر ہو جاتی، اگر اس کی بے راہی روی کی داستان پھیل جاتی تو شادی کا ٹوکا آزمایا جاتا۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ لڑکیاں میٹنی شور دیکھنے تک آوارہ تھیں۔ کبھی کبھی انہیں عشقیہ خط بھی مل جاتے، گھرانے کا لڑکا ہوتا تو چوری چھپے کی ملاقاتیں بھی چل نکلتیں، لیکن یہاں بھی بڑے بزرگ جان بوجھ کر انجان بنے رہتے۔ نہ

تو ہم عمروں میں زیادہ مباحث ہوتے، نہ ہی بڑے اونچی آواز میں نوجوانوں کو گفتگو میں گھسیٹتے۔ یہ چشم پوشی کا عہد تھا صابرین اور شا کرین کا زمانہ تھا۔ خوف میں اندر اندر پکتے رہنے کا عہد تھا۔ خوف میں تو ہر زمانے کے والدین لرزتے ہی ہیں، لیکن اب خوف ترقی کا ہے۔ اب والدین، بڑے بزرگ اولاد کی مالی حیثیت اس کے سٹیٹس کے لئے متکفر ہوتے ہیں، کردار کے لئے نہیں۔

اسی لئے جب ہم چاروں گھر پر بڑوں کو نہ پا کر لوڈو کھیلنے لگے تو ہمیں چوری کی سی لذت محسوس ہوئی۔ ہمیں لگا جیسے ہم بڑوں کا منہ چڑا رہے ہوں۔ اقبال گو میری پارٹنر نہ تھی، لیکن مجھ سے اتنی قریب تھی کہ جب کبھی میں اپنا پاؤں یا گھٹنا ہلاتا، اس کی ریشمی ٹانگ سے ضرور ٹکرا جاتا۔ ہم دونوں سوری کہہ کر گوئی پر چھ لانے میں مصروف ہو جاتے۔ اقبال کے چہرے پر ہلکی سرخی دوڑ جاتی اور مجھے بھی احساس ہوتا کہ لمحوں میں کچھ ہونے والا ہے۔ ظفر نے اٹھ کر گراموفون لگا دیا۔ کندن حل سہگل کی آواز سے کمرہ لہک اٹھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے میں ہی دیو داس ہوں اور میں ہی لگا رہا ہوں۔ دکھ کے اب دن بیتنا ہیں۔

شہد بھائی دو تین بار اندرائے۔ انہوں نے ہمیں کھیلتے دیکھ۔ کوئی کنٹری نہ کی۔ وال کلاک کا وقت ٹھیک کیا۔ سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی باہر جھانکا اور گپ چپ باہر چلے گئے۔ وقت سست رفتار تھا۔ تب دو بھائیوں کے درمیان ایک لڑکی بہت بڑا رخنے پیدا نہ کر سکتی تھی۔ بھائیوں کی محبت اپنی جگہ قائم رہا کرتی۔

بوڑھا آدمی ہمیشہ دائرے کا سفر کیا کرتے ہیں۔ انہیں بار بار ایک ہی بات دہراتے رہنے کی عادت بھی اسی لئے پڑ جاتی ہے اور وہ ماضی کی سوچوں کا سفر اسی لئے چھوڑ نہیں پاتا۔

ایجابات ہمیشہ سے ماحول پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ ان کو مشہور کرنے والے سلوگن بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں لندن کی نیشنل گیلری میں

ٹرافالگر سکویئر گیا تو مجھے ہنر ماسٹر زوائس کی اصلی تصویر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ گواستے برس گزر جانے کے بعد جب گراموفون ہی ایک عجوبہ روزگار بن چکا ہے۔ اس پر چھپی ہوئی کتے کی تصویر کس کو یاد ہوگی؟

لیکن ایڈیسن کا نام ابھی لوگوں کو بھولا نہیں۔ جو تصویر گراموفون پر بنی ہے، اس کی ایک لمبی ہسٹری ہے۔ فرانس براڈ کے پاس ایڈیسن کی اولین ساختہ مشین تھی۔ اصل میں براڈ کا کتا Nipper جب بھی فونوگراف پر براڈ کی اصلی آواز سنتا۔ حیران سا رہ جاتا کہ مشین سے کیسے اس کی مالک کی آواز آرہی ہے۔ اسی کتے کی وجہ سے ہنر ماسٹر زوائس کا مشہور عالم ٹریڈ مارک وجود میں آیا۔

براڈ اپنی تصویر بنا کر مختلف پبلشروں کے پاس گیا، لیکن کسی نے بھی اسے گھاس نہ ڈاں۔ دل شکستہ آرٹسٹ نے یہ ایڈورٹائزنگ پوسٹر اپنے سٹوڈیو کے کسی کونے میں ڈھیر کر دیا۔ کچھ سال گزر گئے۔ اب ایک گراموفون کمپنی نے ایڈیسن کے گراموفون کا تازہ ماڈل بنایا جس پر ڈسک ریکارڈ بچتے تھے۔ جس وقت براڈ نے پیتل کا ہارن دیکھا، اسے اپنی تصویر کو دوبارہ بنانے کا خیال آیا۔ وہ گراموفون کمپنی میں پہنچا اور آرزو ظاہر کی کہ ایک دو دن کے لئے اسے ہارن مستعد رہے دیا جائے، تاکہ وہ تصویر میں کچھ تبدیلیاں لاسکے۔ کمپنی مینجر کو اس وقت خیال سوچھا۔ اس نے براڈ کی تصویر دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اگر فونوگراف کی جگہ ڈسک مشین بنا دی جائے تو پھر وہ اسے اپنے ٹریڈ مارک کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ 1899ء میں اس ہنر ماسٹر زوائس کو گراموفون کمپنی نے سو پونڈ معاوضے کے عوض خرید لیا۔ جب گراموفون کمپنی امیر ہو گئی تو انہوں نے براڈ کو سالانہ ڈھائی سو پونڈ ادا کرنا شروع کر دیا اور اس طرح بڑھا پے میں براڈ جیسا آرٹسٹ غریبی، بیماری اور بے روزگاری سے بچا رہا۔

حالیہ ترقی کے دور میں ایسے سلوگن اور ٹریڈ مارک کم ہوتے جاتے ہیں، جن میں کتا اپنے مالک کی آواز سن رہا ہو۔ اب اشتہار کے نئے موماء عورت کی جنسی کشش کا سہارا

لیا جاتا ہے۔ بکاؤ مال بندوق ہو یا برگر، عورت کا ماڈل عام طور پر استعمال میں آتا ہے۔ جس قدر ماڈل جنسی کشش کی مالک ہوگی، اسی قدر اشتہار سرجع الاثر بھی ہوگا۔ ... مارڈن، ترقی یافتہ معاشرے میں عورت چھپانے، سر دھڑ کی بازی لگانے، حیران کرنے کے کام کی نہیں آتی۔ وہ رجھانے، لبھانے اور ستانے کا سمل بن گئی ہے۔ ... مرداب اس کی نو یافت حیثیت کو سمجھنے کی کوشش میں سرگرداں ہے، لیکن خود عورت کو معلوم نہیں کہ وہ برف کی چٹان پر کھڑی ہے یا گرم پانی کے نیچے ڈبکیاں لگا رہی ہے۔ ترقی کی دوڑ میں حاصل آزادی اور ذاتی شناخت کی تلاش اس کی شخصیت کو سیراب بھی کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ بخر بھی کئے جاتی ہے، کیونکہ یہاں پھر عورت کو اقتصاد کا سفر درپیش ہے۔

ارجمند کے گھر میں میری زندگی اس کے ان ڈور پودوں کی طرح میرے لئے مصنوعی اور جدید ہے، اسی لئے میں سڑک سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور ہوں۔ میرے دماغ درزی میں دردی کی ان گنت رنگ برنگی کترنیں پھلی ہیں۔ میں ان رنگین چھوٹ چھوٹے ثقاہلی فلسفے سوچنے پر مجبور ہوں۔ گرک بڈھے کے گھر سے چار گھر چھوڑ کر ایک ہندو گھرانہ رہتا ہے۔ ان کے گیراج میں بچوں کا چھوٹا سا پلاسٹکی سوئمنگ پول، سڑکوں پر شور مچانے والے Skates بچوں کی سائیکلیں، پیش چیزز، باربیکیو کی انگیٹھی، ان گنت جوتیاں، کئی وافر ٹرنک، کوڑے کا بڑا ڈرم اور فالتو سامان جمع ہے۔ ہم مشرقی لوگ جوڑنے جمع کرنے کے عادی ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس پرانا سامان، جائیداد، استعمال میں نہ آنے والا پیسہ، پرانے خط، خالی ڈبے، بوتلیں، تصویریں سب کچھ پشت در پشت جڑتا چلا جاتا ہے۔ پھر خاندان میں کوئی شرابی، زانی، تماش بین اس جاں بد یا دیوانہ کوٹھکانے لگا دیتا ہے۔ کوڑے کباڑ کو کباڑیا لے جاتا ہے۔ اس طرح صفائی کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور Scvanger بن کر نیچر کی مدد کرتا ہے۔

ہندو خاتون نے، تھے کی بندی، مانگ کا سیندور، اپنا ساڑھی بلاؤز چھوڑ دیا ہے۔ وہ

اپنے بچوں کے ساتھ اور کبھی کبھی اکیلی نہایت بوسیدہ سی چیز، جو گریز اور بغیر آستینوں کی بلاوز میں گیراج کی صفایاں کرتی، گروسریز اٹھاتی، چھوٹے بچے کو پیش چیز میں لاتی لے جاتی نظر آتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی تھکن ہے جو حالات سے سمجھوتہ کرنے والے چہروں کا محاصرہ کر لیا کرتی ہے۔ وہ سڑک پر آنے جانے والوں کو شوش کرنے میں پہلی کرتی ہے اور گند مارنگ یا گڈ ایونگ کہتے ہوئے نمستہ کے انداز میں ہاتھ جوڑتی ہے۔ اس کے چہرے کی تھکاوٹ پر ایک مصنوعی مسکراہٹ کی بدلی چھا جاتی ہے۔ وہ پردیس میں اپنا میج درست رکھنا چاہتی ہے۔ لاطینی امریکہ، گوئیٹ مالا اور کیوبا سے آنے والے، چینی، جاپانی، پاکستانی، مشرق وسطیٰ کے باشندے، بلیک امریکنوں کی طرح بھی وہ زیادہ شائستہ، مددگار، اچھے آداب ظاہر کرنے والی خاتون ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ لوگ اس کی جلد، مذہب اور وطنیت کے فرق کو بھلا کر اسے اکثریت میں ضم کر لیں۔

نہ جانے کیوں میں سیکنڈ کلاس سٹیزن بن کر اتنا تلملتا ہوں۔ انہی سوچ کے چکروں نے مجھے اندر سے بے حال کر دیا ہے۔ امریکہ میں آکر مجھے اقلیت اکثریت کا مسئلہ شدت سے ستاتا ہے۔

اگر کبھی آپ کو سائنس پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور آپ کو چینی کا Salurated Solution بنانے کا موقع ملا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ محلول ایک حد تک چینی جذب کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ اس کے بعد محلول میں مزید چینی ملائی نہیں جاسکتی۔ اگر اس محلول کو چھوڑ دیا جائے تو یہ سوکھ کر ایک بار پھر دانے دار Crystals کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کوزہ مصری اسی طریق سے بنائی جاتی ہے۔ محلول سوکھ کر ڈنڈی اور دھاگوں سے چمٹ جاتا ہے اور چینی کے محلول کی ایک نئی شکل تشکیل پا جاتی ہے۔

بعینہ وہ ممالک جہاں بہت سی قومیں، مذاہب، رنگ و نسل کی رنگی موجود ہو،

جب یہی قومیں ایک جگہ بس جائیں تو محلول تیار ہونے لگتا ہے۔ اکثریت کی مثال مچھلی جیسی ہے وہ فطرتاً، وراثتاً، عادتاً، روایتاً اپنے ماحول کے پانیوں سے بے نیاز تیرتی پھرتی ہے۔ اسے کوئی شعوری کوشش نہیں کرنا پڑتی اور وہ ماحول کا حصہ رہتی ہے۔ یوں سمجھئے اکثریت بھرے پانیوں والا دریا ہے۔ اس کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ کوئی چیز اس کی رفتار کے آگے ٹھہر نہیں سکتی۔

جمہوریت میں اکثریت من حیث القوم جو کچھ بھی کرتی ہے، اصول ٹھہرتا ہے۔ لباس اتار دے، برہنہ بن اصول۔ لباس پہن لے، یہی پہناؤ دل پسند۔ ایک شادی رائج کر دے مونوگیامی اصول شادیوں کو رائج کر دے یہی معیار۔ سب کی رائے سے حکومت چلائے درست۔ اکثریت کسی کی نہ سنے اور آمریت کا ہی سونٹا کھڑکائے تو آمریت ہی من چاہا طریقہ۔ اکثریت کے رسم و رواج، کلچر حکومت، سیاست ہی سب کو پسند آئے۔ معیشت کی بانٹ میں منطبق ہو یا نہ ہو اکثریت کا بہاؤ ضرور شامل ہوتا ہے۔ اکثریت اپنے دیس میں لوہا منوالینے کی حیثیت میں ہوتی ہے اور دھڑلے کی زندگی بسر کرتی ہے۔ رائے عامہ کا بل ڈوز سب کچھ ہموار کئے جاتا ہے۔

اکثریت کے مقابلے میں اقلیت کا رول چور کا ہوا کرتا ہے۔ اقلیت ٹکڑ کے ستون کے پیچھے چھپ کر سڑک کو دیکھتی ہے اور موقع پا کر سڑک پر نکلتی ہے۔ پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی محتاط انداز میں سڑک کراس کر جاتی ہے۔ کچھتا رکین اللہ کا فضل تلاش کرنے نئے ملک میں وارد ہوتے ہیں۔ امیروں کو اپنا وطن چھوڑنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی، لیکن اپنی دولت چھپانے، ضائع کرنے اور وطن کے جاہلوں پر رعب گانٹھنے کے لئے نئے ملک کی بود و باش اختیار کرنا پڑتی ہے۔ کھج اپنے وطن کی رسد گیریوں سے پریشان ہو کر سیاسی پناہ گزین بنتے ہیں۔ اپنے ملک میں عزت نفس کی کمی کے باعث انہیں پر دیس کی مشقتوں کو اپنا پڑتا ہے۔ کچھ اپنے وطن میں اپنے کو مجبوس جان کر آزادی کے شوق میں اڑ جاتے ہیں۔ کچھ آزادی کی بے آسرا زندگی کے ہاتھوں بے زار ہو کر نئے

نظاموں میں بندھنا چاہتے ہیں۔ کچھ پرفینچ سکوریٹی کے پنجرے کو قبول کر لیتے ہیں۔ بعض رہائش، آسائش، زیبائش کی خاطر نئے دیس کو اختیار کرتے ہیں۔ کچھ رائج کان پھڑوا، کانوں میں مندریاں ڈال پردیس کے جنگلوں میں بسرام کر لیتے ہیں۔ کچھ تبدیلی کو انسانی زندگی کی روح سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو نئے Exposure کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کچھ ہجرت سے ناواقف وطن سے خوفزدہ ہو کر صرف بھیڑ چال کے نرغے میں آ کر امریکہ میں منہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ بعض خود رانی کے شوقین روک ٹوک سے گھبرا کر امریکی جنت میں پناہ لیتے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ تعلیم ہی فلاح کا واحد راستہ ہے اور اس کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ وہ یونیورسٹیوں میں برتن مانجھنے، جھاڑو پھیرنے، گھاس کاٹنے کی مشقتوں کو اپنانے میں اپنا ضرر نہیں سمجھتے۔ تعلیم کے پیچھے سرگردان لوگوں کی تعداد امریکہ میں زیادہ ہے۔ انہیں علم کی تلاش کم اور اس سے حاصل ہونے والے تفخر اور ذات کو مورچہ بکھوں سے جانے کی ضرورت زیادہ ہے۔ وہ علم کے حصول کے لئے چین کا سفر اختیار کرتے، لیکن ترقی کی دیوی کو زیر دام لانے کے لئے امریکہ ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ ای نبی ﷺ کو مانتے ہوئے تعلیم کو خدا سمجھتے ہیں۔ یہ تضاد کا ایک اور سفر ہے۔

کوئی کس وجہ سے ہجرت اختیار کرتا ہے۔ میں اس کی تفصیل میں جا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کرتا۔ اس امریکہ نگری میں بھانت بھانت کے پنچھی اڑ کر آئے ہیں اور دانتوں میں انگلیاں داب دریا کنارے کھڑے اکثریت کے دریا کا بہاؤ دیکھتے ہیں، لیکن اکثریت کے دریا کا بہاؤ کسی کے لئے نہیں بہتا۔ اس کی طغیانی، روانی، سیلابی، سب قدرتی، فطرتی حقیقی ہوا کرتی ہے۔ ہولے ہولے حوصلہ پا کر خوف کا لبادہ اتار کر اپنی پیٹھ ٹھونک بلا شری دے کر اقلیت اکثریت کے بہاؤ میں غوطہ زن ہو جاتی ہے۔ جو کچھ بھی داؤ پر لگ سکتا ہے لگا دیا جاتا ہے، لیکن یہ بات میں تو بار بار آپ سے کرتا رہا ہوں اور پھر بھی کروں گا۔ ابھی گھنٹی بجی ہے اور گھر پر کوئی نہیں۔ مجھے ہی نیچے جا کر دیکھنا

پڑے گا کہ باہر کون ہے۔

دروازے کے سامنے بڑھا پھونس ایک امریکی جوڑا کھڑا ہے۔ پتہ نہیں چیمپے سے یہ اطالوی ہیں کہ نیدرلینڈ سے آئے ہیں۔ پتہ نہیں ان کے باپ دادا اس وقت یہاں آئے جب انگریزوں اور آئرش لوگوں میں کشیدگی نے جنم لیا۔۔۔ یہ بھی تارکین ہیں۔ ایک وقت تھا جب ان کے آباء غیر قانونی طور پر بغیر تحفظ کے یہاں بنہ گزریں ہوئے، لیکن اب ان دونوں کے پاس نیلا پاسپورٹ ہے۔ عجب ہیکہ ایسے سٹیزن کی ہمدردی غیر قانونی طور پر یہاں آ بسنے والے تارکین کے ساتھ نہیں ہے۔ بڈاں ہے امریکن کی صحت اچھی ہے، لیکن بڑھیا کومہ وسال نے ہنڈا دیا ہے۔ اس کے کان شاید زیادہ نہیں سنتے، کیونکہ وہ گلے میں ہیرنگ ایڈلٹکائے پھرتی ہے۔ ان دونوں کا گھر ہماری گلی سے دس منٹ کے پیدل راستے پر ہے۔ یہ اپنے مکان کا کچھ حصہ بھوتوں سے بچانے کے لئے کرائے پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ کبھی چینی، کبھی میکسیکو، کبھی کیوبا کے اڈاری پاس رکھ کر وہ محفوظ محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ایسے تارکین خوفزدہ پرندوں کی طرح جلدی سوتے اور صبح جلد اٹھ کر کاموں پر نکل جاتے ہیں۔

مسٹر اینڈ مسز ہارٹ عموماً مجھے Gizbo میں بیٹھے ملتے ہیں۔ دونوں اتنی لمبی مدت ساتھ رہنے کے باعث ہم شکل، ہم عمر اور ہم لباس لگتے ہیں۔ لیکن کہیں ان میں بھی ایک دوری ہے۔ وہ اس بات سے خوفزدہ نظر آتے ہیں کہ دونوں میں سے ایک کو اس سرائے عالمگیر سے پہلے اڑ جانا ہے اور ساتھی کو اکیلے اس گزبو میں بیٹھے بیٹھے لے جانے والی ہواؤں کا انتظار کرنا ہے۔۔۔ مسز ہارٹ سوچتی رہتی ہے کہ اگر میرے بعد ہارٹ اس کی بیٹی کے پاس فلوریڈا چلائے تو شاید اسے قبر میں آرام مل سکے گا۔

لیکن پھر وہ سوچتی ہے، کیا میری ماں میرے پاس آ کر کر رہی تھی؟ وہ تو مرتے وقت لاس اینجلس میں تھی۔۔۔ اور اکیلے ہی مرنے کے مراحل سے سبکدوش ہو گئی تھی۔ اسے خیال آتا ہے کہ کیا تنہائی سفید فام کلچر کا حصہ ہے کہ اس کی ضرورت؟ کیا تنہائی آزادی کی

آرزو سے پیدا ہوتی ہے کہ Privacy کی خواہش نے فیملی یونٹ کو مالے کی پھانکوں
مان علیحدہ پیک کر کے ایک پھل کا حصہ بنا دیا ہے۔

میں یہ خیال آرائی کرتا ہوں کہ امریکی جوڑا اپنے متعلق یوں سوچتا ہوگا۔ ہوسنا ہے
کہ ان دونوں نے کبھی بھی ان باتوں کے متعلق کچھ نہ سوچا ہو۔

معاف کیجئے ہم نے آپ کو زحمت دی بڑھیا کہتی ہے۔

نہیں آپ ویکم ہیں میں دروازہ کھولتا ہوں۔

نہیں نہیں ہم اندر نہیں آنا چاہتے، کھڑے کھڑے بات ہو جائے گی۔

فرمائیے؟

بات یہ ہے کہ کچھ Racist اس علاقے میں رہتے ہیں۔ ہم نے ان کے خلاف
ایک تحریک چلائی ہے۔ انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مضامین لکھنے
پڑتے ہیں۔ پمفلٹ چھاپنے پڑتے ہیں۔ سیمینار کرنے ہوتے ہیں۔ جس کے لئے
چندہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ کیا آپ کچھ پیسے Contribute کرنا چاہتے ہیں۔
عورتیں مقاصد کی تشریح کی۔

ضرور ضرور ... میں نے ہاتھ آپس میں ملتے ہوئے کہا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ
آپ لوگ پرانے تاریکین میں سے ہیں؟ عجیب بات ہے کہ آپ دو ایک نسلیں گزر
جانے کے بعد امریکی ہو گئے، لیکن وہ مسلمان جو پین سے اس وقت آئے جب یہاں
Mexican سارے امریکہ کے مالک تھے اور وہ نیگرو جو اس وقت یہاں پہنچے
جب یہاں کوئی سڑک، بازار نہ تھے ... وہ ابھی تک بلیک نیگرو ہیں، مسلمان ہیں اور
احساس کمتری کا شکار ہیں اور امریکی نہیں ہو سکے۔

اسی کخلاف، اسی تعصب کے خلاف ہم جنگ کرتے ہیں۔

آپ پیسے لے لیجئے لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کامیاب نہیں ہوں گے ... آپ ان
کو شاید حقوق تو دے پائیں، لیکن آپ انہیں محبت اور انصاف نہیں دے سکیں گے ...

وہ اپنی شکل اور رنگ کا تاوان اندر کے احساس کمتری سے ادا کرتے رہیں گے۔۔۔ یہی آپ کی اور ان کی سانبھی سزا ہے۔ آپ احساس جرم سے اور وہ احساس کمتری سے گھٹتے بڑھتے رہیں گے۔

انہوں نے خاموشی سے دس ڈالر کا نوٹ پکڑ لیا اور رسید بنا کر مجھے دے دی۔ شاید وہ بھی اندر سے Racist تھے اور اپنا احساس جرم مٹانے کے لے، پرخت سفر باندھنے سے پہلے اللہ کو قرض حسد دینا چاہتے تھے۔

چالیس پچاس سال پہلے مشرق کا Extended فیملی ایک بہت بڑا Support سسٹم تھا۔ اب یہ سسٹم کمزور پڑ رہا ہے۔ مشرق میں زندگی خاندان کے تابع چلتی رہی ہے۔ اگر خاندان طاقتور، امیر اور عزت والا ہو تو کبھی کبھی یہ مافیہ کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ فرد معاشرے کے تابع، خاندان سے وابستہ، روایت کا پابند، اپنی شخصی آزادی کو بھینٹ چڑھا کر عافیت کی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔

سفید فام لوگ اور خاص کر امریکی معاشرہ خاندان کی زنجیریں توڑ چکا۔ یہاں فرد نظام کا تابع ہے۔ ہر شہری پابند ہے۔ حکومت چاہے ڈیموکریٹ کی ہو چاہے Republican کی، ہر شہری نظام کا پابند رہے گا۔ وہ حکومتی Infrastructure کو توڑ کر اپنی آزادی کا اعلان نہیں کر سکتا۔ اسے لال بقی پر آدھی رات کے وقت بھی رکنا پڑتا ہے۔ وہ ٹول ٹیکس پر بڑی رضا و رغبت سے رکے گا۔ ٹیکس ادا کرنے پر مجبور ہوگا۔ ہر شہری اپنی Free Will سے اس پابندی کو قبول کرتا ہے جو امریکی Countitution نے اس کی بہتری کے لئے بنائی۔ کسی نظام کو توڑنا اور اپنی آزادانہ روش یا آزاد خیال کے پیش نظر کوئی خصوصی رعایت طلب کرنا امریکی نظام زندگی کے منافی ہے۔ یہاں سفارش، کنبہ پروری، اس سے نہیں ہوتی کہ یہاں خاندان کا تصور ہی ڈھیلا پڑ چکا ہے۔ اتر با پروری کہاں سے آئے گی؟

امریکہ میں نبیوں کا بنایا ہوا نظام نہیں چلتا، کیونکہ یہاں بہت سی قومیں، مذاہب

نسلیں مستقلاً ایک دوسرے سے بھڑتی رہتی ہیں۔ جھڑے اور تصادم سے بچنے کے لئے اور اکثریت کی خواہش کو مد نظر رکھ کر امریکی شہریت مذہب کو ذاتی لا کر میں بند کر کے ہیومن رائٹرز کا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتا ہے۔

جو انہی امریکی شہری نظام کا پابند ہو جاتا ہے۔ حکومت ماں باپ بن کر تمام رعایا کی آزادی سلب کر کے اسے نظاموں میں جکڑ بند کر لیتی ہے۔ پھر حکومت شخصی آزادی پر پہرہ نہیں بٹھاتی۔ جب قانون اکثریت پر لاگو ہو چکتا ہے، قسطوں پر مکان، بیکار لوگوں کو وظیفے ملنے لگتے ہیں اور حکومت ویلفیئر سٹیٹ میں بدل جاتی ہے تو پھر وہ شخصی آزادی کے دروازے کھول دیتی ہے۔ وہ نیک دل امریکی جو سارا دن غلاموں کی طرح نظام کو پوجتے اور حکومتی حکم کو بجالانے کو ایمان سمجھتے ہیں، جو محنت کی اخلاقیات کو انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ شخصی زندگی میں سب زنجیریں توڑ کر من مانی کرنے کو بھی اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور تصادم کا پنڈولم نظاموں کی پابندی کے بعد شخصی آزادی کی طرف رواں ہو جاتا ہے۔ فرد ذاتی عمل میں اس وقت تک پورا آزاد ہے جب تک اس کا عمل کسی دوسرے کی آزادی میں خارج نہ ہو۔ فرد کی آزادی وہیں تک ہے جہاں سے کسی دوسرے شہری کی ناک شروع ہو جاتی ہے جب امریکی شہری کا مفاد حکومت کے نافذ قوانین سے ٹکراتا ہے تو لامحالہ حکومت شہری کے پر قینچ کر لیتی ہے۔ آپ شخصی زندگی میں رکھیل رکھیں یا سرے سے شادی نہ کریں اور فلرٹ کر کے ڈنگ ٹپائیں۔ شراب میں ہت رز ہیں یا بال رنگ کرپنک بن جائیں۔ بچے خود پالیں یا کسی اور کے سپرد کر کے کام پر چلے جائیں۔ والدین کی خدمت خود کریں یا انہیں کسی بڑھا ہاؤس میں چھوڑ آئیں، حکومت دخل انداز نہیں ہوگی۔ آپ ہم جنسیت میں مبتلا ہوں اور حریت و ط کی قوم کے مافرانوں میں سے ہو جائیں، حکومت آپ سے معذرت طلب نہ کرے گی۔ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ سمجھا جائے گا۔ کوئی خاندان پوچھ گچھ کے لئے حاضر نہ ہوگا۔ حقہ پانی بند کرنے کا تصور امریکی معاشرے میں موجود نہیں۔ کوئی آپ کی شخصی

زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔ لیکن ازلی تضاد یہاں بھی در آئے گا۔
 نظاموں کے پابند معاشرے میں ذاتی زندگی آزاد ہوگی اور معاشرہ اسی شخصی آزادی
 کے باعث مشکلات سے دو چار ہوگا۔ طمانیت، سکون شافقی کی کمی ہوگی۔ ذہنی نفسیاتی
 بیماریاں بڑھیں گی۔ طلاق کی شرح میں اضافہ ہوگا۔ شلٹر ہومز بڑھیں گے۔ فرد کا
 سپورٹ سسٹم نہ ہونے کی وجہ سے تنہائی کا روک عام ہوگا، لیکن اگر آپ شراب پی کر
 ڈرائیو کریں گے، چالان ضرور ہوگا۔ بچے کو ماریں پیٹیں آپ کا بچہ پولیس کو فون کر کے
 آپ کی شکایت کر دے گا۔ آپ پنک بن کروں گا، فساد کریں یا کوئی عورت آپ پر یہ
 ثابت کر دے کہ آپ اس سے شادی کا وعدہ کر کے وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے تو پھر
 شخصی آزادی ختم ہو جائے گی۔ آپ کو حدود و کراس کرنے کی سزا ملے گی۔

مشرق کا حساب اس سے برعکس ہے۔ ہمارے معاشرے میں فرد پابند اور شہری
 آزاد ہے۔ یہاں ابھی ہخامنڈان سے منفی اور مثبت دونوں طریق سے وابطہ ہیں۔
 ہمارے رسم و رواج، لین دین، محبت اور نفرت کے سارے سرچشمے خاندان سے نکل کر
 بہتے ہیں۔ خاندان حقہ پانی بند کرتا ہے۔ شخصی آزادی پر کڑے پہرے ہیں۔ ہم
 حکومت، قانون، نظام کی پابندی سے آزاد ہیں۔ لال بتی کراس کر جائیں پرواہ نہیں،
 ٹیکس نہ ادا کریں، قانون شکنی پر دل میں ملال نہ لائیں۔ قانون کا گلا قدم قدم پر
 گھونٹیں، کوئی عیب نہیں۔ سرکاری زمین پر تجاویزات کر کے جنگلے چڑھالیں، درخت
 گائیں، باغیچے بنائیں۔ غیر قانونی مکان تعمیر کر کے کچی آبادی بسالیں، سب جائز۔
 حکومت سرچلتی رہے، قانون کے دکھائے، سب چلتا ہے۔ جن گھروں پر احتساب کی
 ہر لگتی ہے، ان سے میل ملاقات فخریہ جاری رہتا ہے۔ یاں پابندی ہے تو صرف فرد کی
 ذاتی زندگی پر۔ مشرقی لوگ شخصی زندگی میں رسم و رواج، کلچر، مذہب کے پابند ہیں۔
 ذات پات کی بندش کو فروغ دیتا ہے۔ والدین ابھی ادب کے درجے پر ہیں۔ بچے
 کی وجہ سے ناکام شادی کو نبھایا جاسکتا ہے۔ رشتہ داروں کی رائے آپ کے شخصا

کا تعین کرتی ہے۔ آپ اپنے متعلق جو بھی خیال رکھیں، لیکن رائے آپ کے متعلق وہی چھے گی جو آپ کا خاندان طے کرتا ہے۔ آپ بھاری تاوان، قیمت یا مشکلات کا سامنا کئے بغیر خاندان کا پھندا گلے سے اتار نہیں سکتے۔ آپ اچھا شہری بن کر معاشرے میں عزت حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ اچھا شوہر، بھائی، بیٹا بن کر عزت کا مقام مل جایا کرتا ہے۔ مشرقی معاشرے میں رشوت، سفارش، دولت کی ہوس دراصل خاندان کی آبیاری کے باعث پھلتی پھولتی ہے۔ تعلقات آپ کو ایسے خود غرض کاموں کی طرف مجبور کرتے رہتے ہیں اور نظام چلنے نہیں دیتے۔ جب معاشرے میں محبت، مروت اور یگانگت کے رشتے ہوں تو پھر سپورٹ سسٹم کے باعث نفسیاتی مسائل کم، اسی سپورٹ سسٹم کے باعث تنہائی کم تر اور سکون، طمہ نیت قلب و افراد از میں ملتی ہے، لیکن نظام نہیں چھتے اور نظام نہ چلنے کی صورت میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہو پاتی۔

میں آپ سے یہ بات نہیں کر رہا کہ مغرب بہتر ہے یا مشرق کی حالت قابل رشک۔ میں اپنی سوچ میں بس یہاں تک سوچ پایا ہوں کہ ازلی تضاد دونوں جگہ موجود ہے۔ مغرب میں یہ تضاد فرد کی ٹوٹ پھوٹ پر منتج ہوا ہے اور مشرق میں اسی تضاد نے حکومتوں کے استحکام کی نفی کی ہے۔ مغلیہ بادشاہت کے زوال کی داستان بھی دراصل خاندان کے فتح کی کہانی ہے۔ مشرقی ممالک میں جمہوریت کے ٹیل ہو جانے کا راز بھی خاندان کی مضبوطی میں پنہاں ہے۔

مغرب اور مشرق اسی لئے کبھی مل نہیں سکتے کہ مشرق میں ابھی فلاح کی تلاش جاری ہے۔ فلاں کا سفر فرد سے شروع ہو کر بالآخر معاشرے میں ضم ہوتا ہے۔ ترقی کی منزل معاشرے کی فراوانی، آسائش و زیبائش کے بغیر ممکن نہیں۔۔۔ اور تنہائی پر منتج وہتی ہے۔ دونوں طریقے مختلف ہیں۔ ایک شمال سے جنوب کا سفر ہے، دوسرا مشرق سے مغرب کی جانب بڑھنے کی مسافت ہے۔ کیا جانے نقطہ اتصال کہاں ہے؟ کیا فلاح اور ترقی بیک وقت ممکن بھی ہے اور کس قدر اور کہاں تک اور کیونکر؟

میں ایک جھکی بوڑھے کی طرح یہ تقابلی سوچیں پیش کرتا رہتا ہوں۔ بوڑھا آدمی عموماً ماضی میں پناہ لیتا ہے اور اسی طرح دائرے کے سفر میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ خوفزدہ رہتا ہے۔ جانتا ہے کہ سیدھی لائن کا سفر تو بالکل فنا میں ضم ہوتا ہے۔ ناکارہ تکلیف دہ زندگی کے باوجود بوڑھا فنا کو قبول نہیں کرتا۔

شام پڑ چکی ہے۔

بانی لین پر اکا دکا کارگزر جاتی ہے۔ لوگ کبھی کے گھروں کو وٹ چکے۔ میں ارجمند کے لئے ہاف اینڈ ہاف کا دودھ اٹھائے گھر جا رہا ہوں۔ یہ پلاسٹک کی بوتل ویسی زمزمی سے مشابہ ہے۔ جس میں عمرے یا حج کے بعد لوگ آب زم زم لایا کرتے ہیں۔ اس نیم اندھیرے میں ابھی مجھے فٹ پاتھ پر کراس کر کے ایک آدمی گزرا تھا۔ اس کے پاؤں یوں پڑ رہے تھے جیسے وہ گھنٹوں چلا ہو۔ اس کی آنکھوں میں کسی مہربان چہرے کی تلاش تھی۔ تنہائی اسے اتنی جگہ سے ڈس چکی تھی کہ اب اس نے ہتھیرا ڈال دیئے تھے۔ زیادہ لوگ اپنے اپارٹمنٹس میں پہنچ چکے تھے۔ بتیاں جل چکی تھیں۔ ایک دکان میں دو نیگرو ایک ڈمی میناکن کو سبز رنگ کا لباس پہنانے میں مشغول تھے۔ دور کہیں کاروں کا شور بھی اس خاموشی کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔

شاید زندگی کے مسائل سلجھانے کے لئے ایک زندگی کافی نہیں۔

ساری ضروریات کا اندازہ لگائیں تو ایک نوکری بھی کافی نہیں۔

ایک محبوبہ بھی اطمینان کا باعث نہیں، کیونکہ وہ بھی تحفے میں آپ کو اپنی بے اطمینانی ہی دے سکتی ہے۔ جس طرح وہ ایک کندھے کو جھکائے من من کا پاؤں اٹھاتا رکھتا گزرا ہے لگتا ہے۔ اس کے پاس کوئی نوکری، عورت، گھریا شہر نہیں ہے۔ وہ خانہ بدوش ہے، لیکن اس کے پاس خانہ بدوشوں کا کنبہ نہیں۔ ان کے رسم و رواج بھی اس کے نہیں۔ وہ زندہ رہنے کی تقویت کہاں سے لے۔۔۔ ایسا فلنگ سٹیشن کہاں تلاش کرے، جہاں وہ اپنی ٹینگی میں کچھ عرصہ اور بچنے کے لئے گیس بھروالے۔ کیا وہ سرن

ڈیگو چلا جائے؟ کیا نیویارک بہتر ہوگا۔ کیا کیوبک کے لوگ زیادہ مہرباں ہوں گے
... وہ ہاؤن ریاستوں کے امکانات کے متعلق سوچتا ہے۔ کبھی امید اسے آنکھ مارتی
ہے، کبھی خوف اسے ڈسنے لگتا ہے۔

اس کے کانوں میں دادی کی آواز آتی ہے۔ ہمارے زمانے میں ایسے نہیں ہوتا تھا
بیٹا۔

باپ کہتا ہے جب میں نو جوان تھا۔
چچا اسے وہ کہانیاں سناتا ہے جن میں سکول کی شرارتیں تھیں۔
ماں اسے باہر جانے سے روکتی ہے۔
لیکن ان سب کو وہ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ وہ حفاظتیں روک ٹوک تو اس نے خود ختم کر
دی تھیں۔

وہ تو امریکہ میں ہے جس میں آزادی کا مجسمہ ساحل میں جکڑے سمندر کے تلاطم کو
صبح و شام دیکھتا ہے۔

یہ تو ایسا دلیس ہے جس کی وادیوں میں ندیاں جنگلوں میں دریا بہتے ہیں۔ سمندر سے
جڑے پہاڑ اور سیلوں لمبے ریتلے ساحل ہیں۔ یہ بڑے بڑے بزنس مین کا دلیس ہے
جن کے ایسے بنک اکاؤنٹ ہیں جیسے کسی چھوٹے غیر ترقی یافتہ ملک کا بجٹ ہو۔ یہ پنٹا
گون کا ملک ہے۔ انگلٹن کے قبرستان نہیں یونیفارم سمیت دفن کئے ہوئے لوگوں کا دلیس
ہے۔ ... وہ یہ ملک ہے جو آزادی دینے اور چھیننے کا داعی ہے۔

اپنی آزادی ثابت کرنے کے لئے وہ افغانوں کی آزادی سلب کر سکتا ہے۔
اپنی طاقت کا ثبوت پہنچانے کے لئے وہ عراق کو تباہ کر سکتا ہے۔
وہ ترقی پذیر ملکوں کو انگوٹھا دکھا کر، گلہ دبا کر، مکاٹھ کر اپنی شرائط پر قرض ٹھونس سکتا
ہے اور پھر تباہ کرنے کے بعد تباہی سے بچا بھی سکتا ہے۔

یہ وہ اکیلی سپر پاور ہے جو زبردستی صحت مند معاشروں پر اپنے ایجاد کردہ علاج

ٹھوس سکتی ہے۔

ابھی جو آدمی ایک کندھا گرا کر میرے پاس سے گزرا ہے، اس نے کبھی ایسی باتی نہیں سوچیں۔ وہ تو صرف جینے کا حق چاہتا ہے اور کچھ نہیں۔

ایک گھر ... ایک نوکری ... ایک گھر والی ... ایک بچہ وہ قناعت پسند، تھوڑی عزت پر راضی ایک نارٹل وسطی زندگی گزارنے کا آرزو مند ہے، لیکن شاید ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ بھی امریکہ میں دولت مانے زیب و زیبائش کی زندگی گزارنے کے لئے ملک بدر ہوا ہے۔ میں اس سے آگے گزر کر ہانپنے لگتا ہوں۔ اب کبھی کبھی مجھے خواہ مخواہ سانس چڑھ جاتا ہے۔ میں بلال سے اپنی صحت کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میری کینٹی میں جو جلت رنگ بچتا ہے۔ وہ یا تو انحد باجہ ہے یا ہائی بلڈ پریشر کی تمہید ہے۔ بلال سپہماری کا ذکر اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا دن پہلے ہی ضروری اور غیر ضروری مصروفیات سے اٹا پڑا ہے۔ ارجمند اور بلال نے ہر گھنٹے منٹ سیکنڈ کا پروگرام بنایا ہوتا ہے۔ اس نے انہیں جینے کے لئے وقت نہیں پروگرام ہی پروگرام ملتے ہیں۔ مشاہدے، تخیل، وجدان کی ان کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔

میں شام کے چھپٹے میں ایک خالی بیچ پر بیٹھ کر ہاف اینڈ ہاف کا بوتل پاس رکھتا ہوں، تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ بیچ پر پہلے سے کوئی بیٹھا ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر ایک طرف کھسک جاتا ہے۔ گویا میرے لئے جگہ بنا رہا ہو۔ یہ خوبصورت گورا چٹا نو جوان یا تو یورپی ہے یا امریکن، وہ انگریز اس لئے نہیں لگتا کہ اس کے چہرے پر پے پے نہیں لکھا اور میری آمد پر اس نے اپنے چہرے کا دریچہ بند نہیں کیا۔

ہائے۔

وہ بھی ہائے کہہ کر جوابی پیش رفت کرتا ہے۔

اگر آپ چاہیں تو میں کسی دوسری بیچ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ امریکن لہجے میں انگریزی بولتا ہے۔

”نہیں نہیں۔۔۔ میری خوش نصیبی ہے کہ تم جیسے خوبصورت نوجوان ہم بیچ ہے۔“

فاصلے سے ایک کار ہم پر روشنی کا تختہ ڈال کر آگے بڑھ جا رہی ہے۔ اس سرچ لائٹ میں اس کے براؤن بال، نیلی آنکھیں اور سفید رنگ کی جاذبیت مجھے کھینچتی ہے۔ میں ہمیشہ سے کالی قوموں کی طرح جمال پرست ہوں۔

کیا آپ مجھ سے باتیں کرنا چاہیں گے؟ وہ یکدم اردو میں کہتا ہے۔

ضرور ضرور۔۔۔ بسم اللہ۔۔۔

میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں پشتون افغانی ہوں اور میرا نام عبدالگل ہے۔ میرا باپ اپنا خاندان لے کر۔۔۔ پشاور میں پناہ گزیں ہوا۔۔۔ یہ تب کی بات ہے جب ہم امریکہ کی جنگ روس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ تب ہمیں ہتھیار بھی ملتے تھے اور روپے پیسے کی مدد بھی حاصل تھی۔۔۔ میرا باپ امیر آدمی تھا، اس لئے ہمیں پشاور میں کوئی وقت پیش نہ آئی۔ آپ جانتے ہیں امیر آدمی کو کہیں بھی وقت پیش نہیں آتی، وہ امریکہ میں ہو یا پاکستان میں، افغانستان ہو یا وہ زندگی کے وار دولت پر جھیل لیتا ہے۔ پھر میری ماں فوت ہو گئی۔ ماؤں کی بھی عجب مصیبت ہے۔ جب انکی بہت ضرورت ہو تو وہ قصد انوت ہو جاتی ہے۔

ہم دونوں چند ٹاپے خاموش رہے۔

”آپ پور تو نہیں ہو رہے بابا جان۔۔۔“

”نہیں یار۔ عبدالگل میں سمجھتا ہوں You have made my day میں

ایسی ہی سرا ہے گا ہے ملاقاتوں پر تو زندہ ہوں۔۔۔ اب تو ٹیلی فون اور خط بھی نہیں آتے کبھی۔

وہ میری بات سمجھ نہ پایا، کیونکہ ابھی وہ عمر کے ایسے حصے نہ تھا۔

”میرے باپ نے شادی کر لی۔ دوسری شادی۔۔۔ یہ نہیں کہ اسے عورت کی

ضرورت تھی، بلکہ وہ امیروں کی طرح کاہل تھا اور گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں پر وہ

درشت ہو جایا کرتا۔ میری نئی ماں بھی انغانی پشتون تھی، لیکن اس کا خاندان تین پشتوں سے لاہور میں مقیم تھا۔ اس میں پنجاب والوں کی طرح آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی۔ اس نے مجھے بھی ترقی کے راستے پر ڈال دیا اور ... میں بڑی چھوٹی عمر میں اے لیول کرنے کے بعد یہاں آپہنچا۔

عبدالگل ... لیکن خیر ... بتاؤ یہاں آکر تم نے کیا پڑھا؟

انجینئر کی ... نوکری کی، پیسہ ملایا، لنڈھایا، برباد کیا ... زندگی کو انجوائے کیا، کئی لوگوں کو عیش کرائی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا بابا جان کہ میں نے اس سرزمین پر قدم دھرتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس سوسائٹی میں اسی وقت پھل پھول سکتا ہوں، جب میں لبرل رہوں ... آپ جانتے ہیں لبرل کون ہوتا ہے؟

”مفراخ دل ...“

”ضروری نہیں ...“

”دوسروں کو قبول کرنے والا ...“

”یہ بھی ضروری نہیں ...“

”پھر میرا خیال ہے دوسروں کے کلچر اور مذہب کو بھی ایک حقیقت ماننے والا ...“

اختلاف پر پل تعمیر کرنے والا ...“

”ہاں۔۔۔۔۔“ دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھی۔۔۔۔۔ انسان کتنا مجبور ہے!

”آپ نہیں جانتے بابا جان۔۔۔ لبرل صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو کسی بھی کھونٹی سے نہ بندھا ہو۔۔۔ وہ کسی وطن پرستی کے جذبے سے سرشار نہ ہو۔۔۔ کسی خاص مذہب، مسلک، رسم و رواج کا پابند نہ ہو۔۔۔ وہ اس قدر خالی ہو کہ ہر وقت دوسروں کے سانچے میں اگر ڈھل نہ سکے تو کم از کم اپنی ذات میں دوسروں کا مذہب، کلچرل، رسم و رواج بھر سکے۔ نہ اس کا ضمیر اس تبدیلی پر اسے لعنت کر سکے، نہ ہی وہ کسی احساس جرم میں مبتلا ہو۔

کچھ لوگ بڑی آسانی سے نئی عورتوں کے ساتھ تصنع پیدا کر لیتے ہیں بابا جان کیونکہ ان کے اندر کسی عورت کا نہ بت ہوتا ہے نہ تصویر۔۔۔ وہ وفا کے جذبے سے آشنا نہیں ہوتے، اس لئے بدلتے رہنے میں انہیں مشکل پیش نہیں آتی۔۔۔ میں نے بھی یہاں گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدلے، کئی موڑ کاٹتے۔۔۔ پھر میرے والد واپس قندھار چھ گئے۔ پوپی سیڈ سے مائی ہوئی ساری دولت انہوں نے میری دوسری ماں کے نام کر دی اور اپنی دونوں بیٹیاں ساتھ لے کر اپنے ”ہائی وطن چلے گئے۔۔۔ میں دو ایک بار قندھار گیا، لیکن میں لبرل ”دی تھا۔ میرا قندھار میں دل نہ لگ سکا۔ وہاں طالبان کی حکومت تھی، جو احکامات خداوندی کے پابند تھے۔ سب سے بڑی تکلیف مجھے وہاں داڑھیاں دیکھ کر ہوتی تھی، پھر عورتوں کے برقعے مجھے وحشت میں مبتلا کر دیتے۔ میری دونوں بہنیں پشاور میں برقعہ نہیں پہنتی تھیں، لیکن قندھار میں انہوں نے بھی شٹل کاک برقعہ اختیار کر لیا تھا۔ میں لبرل تھا، ہر قسم کے کلچر اور مذہب سے سمجھوتہ کرنے میں پہل کیا کرتا۔ ہر قسم کے کھانے، لباس، رسم و رواج قبول کرنے میں مجھے دیر نہ لگتی، لیکن برقعہ اور داڑھی دیکھ کر نہ جانے کیوں میں غصے میں آ جاتا۔ لبرل ہونے کے ناطے مجھے یہ کلچر بھی قبول کرنا چاہئے تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں میرے اندر چڑ پیدا ہو گئی۔ آخری شام جب میں اپنے دادا سے رخصت ہونے مردانہ بیٹھک میں پہنچا تو میں سگریٹ پی

رہا تھا۔ میں چونکہ لبرل بھی تھا اور سچا بھی تھا، اس لئے میں نے سگریٹ بجھانے کی کوشش نہ کی۔ دادا مجھے منع نہ کیا۔ حسن اتفاق سے اس وقت ڈیرے پر کوئی نہ تھا اور دادا بڑے سے گاؤں تکے سے کمر لگا کر تسبیح پھیرنے میں مشغول تھا۔ مجھے یوں بے باکی سے گریٹ پیتا دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری بیدار ہوئی، لیکن دادا نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

میں واپس جا رہا ہوں دادا جان۔

کب؟

آج شام کی فلائٹ سے اسلام آباد۔۔۔ پھر وہاں سے ماں کو سلام کر کے امریکہ۔۔۔

میرے دادا نے ماں کے نام پر ہلکی سی تیوری چڑھائی۔ گاؤں تکے پر اس کا وزن بڑھ گیا۔

تمہاری دوسری ماں نے ہماری سر زمین کو قبول نہیں کیا، حالانکہ وہ بھی پشتون خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے ہماری زبان، کلچر کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔۔۔ پتہ نہیں کیوں؟

میں دادا کو بتا نہ سکا کہ وہ چوں کے بغیر تنگی بو جھپی ڈالی کو قبول نہیں کر سکتی۔۔۔ طالبان کی حکومت میں کوئی ایسی دلکشی نہیں دادا جو ماں کو یہاں آنے پر آمادہ کرے۔ عورت اور بچہ، دادا، کھیل تماشے، لہو و لعب، عیش و عشرت کے بغیر سو کچھنے لگتے ہیں، پتہ کے بغیر شاخ کس کام کی؟ اسے بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ بابا دم کا دل لگائے۔۔۔ وہ خوشی کے اصول پر پیدا کی گئی۔ اسے طالبان کی حکومت راس نہیں آ سکتی۔ جہاں ہر وقت ضبط نفس کا کوڑا چلے۔

میں بھی دوسری ماں کی طرح برقعے والی عورتیں۔۔۔ وارنٹی والے لے مرد چھوڑ کر یہاں آ گیا۔

ایک لمبے ٹرک نے ہم دونوں پر اپنی سرچ لائٹ پھینکی اور پھر آگے بڑھ گیا۔ میں نے عبدگل کی طرف چورنگا ہوں سے دیکھا۔ ایک مرتبہ اخبار میں اس کے ہم شکل آدمی کی تصویر چھپی تھی، وہ یوسنیا کا مجاہد تھا۔ اس کے ماتھے پر لمبے زخم کا نشان تھا اور اس پر جھکی ہوئی عورت نے سکارف سے اپنے بال ڈھانپے ہوئے تھے۔ اصغری جو گم سم سائے کی طرح سلپر کھسکاتی کمروں میں بند چڑیا کی طرح گھومتی رہتی۔ اخبار اٹھا کر اس تصویر کو دیکھنے کے بعد بولی تھی۔۔۔ کتنے خوبصورت لوگ ہیں یوسنیا کے۔۔۔ لوگ ان غریبوں کے کیسے پیری ہو گئے۔۔۔ ہائے ہائے بڑا ظلم ہے بڑا ظلم ہے۔۔۔

عبدگل کو دیکھ کر میرے دل میں بھی خواہ مخواہ کا غم موجزن ہو گیا۔ شاید انسان بنیادی طور پر جمال پرست ہے۔ وہ کسی کالے بھینگے بچے پر اس طرح نہیں پسجتا، جیسے وہ ایک نیلی آنکھوں والے گورے گول مٹول بچے کو دیکھ کر پوری طرح خوش آمدید بن جاتا ہے۔

اگر تم واپس جانا چاہو تو کہاں جاؤ گے افغانستان کہ پاکستان؟۔۔۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

میں گیارہ ستمبر سے پہلے بہت لبرل تھا بابا جان۔۔۔ کیونکہ میں کسی خیال، مسلک، مذہب، ملک، خاندان سے وابستہ نہیں تھا۔ نہ میری جڑیں کہیں تھیں، نہ میرا دماغ کہیں تھا۔ جو آدمی کم ہیں بندھا ہو، وہ آسانی سے لبرل نہیں ہو سکتا۔ میں سوچتا رہتا کہ کمیونزم نے فیل ہو کر فرد کے نئے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے۔ اب جمہوریت اور سرمایہ پرستی کے علاوہ اور کوئی مذہب قابل تقلید نہیں رہا۔

اتنا نہ سوچا کرو بر خوردار۔۔۔ جوانی عمل کا پریڈ ہے۔۔۔ تو ہمت کے پیچھے بھاگنا اور سوچ کا بیوپاری عمر کا مشغلہ ہے۔۔۔ کھاؤ پیو اور بے لوث۔

وہ میری بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ کہیں اور تھا، کھویا ہوا اور پریشان۔

گیارہ ستمبر کے بعد پتہ نہیں کیوں میں نے نوکری چھوڑ دی۔۔۔ اور تاریخ پڑھنا

شروع کر دی۔۔۔ میں بٹش کے ایکشن کا جواز ڈھونڈنا چاہتا تھا۔۔۔ میں نے ظلم کی تاریخ کو بہت مقامات پر سٹڈی کیا بابا جان۔۔۔ کشمیر۔۔۔ یوسنیا، چیچنیا، جلیانوالہ باغ، ہلاکو، نادر شاہ، چنگیز خان۔۔۔ کھال کھینچوانے کے واقعات، پنجروں میں بند قیدی۔۔۔ ہٹلر، ہیروشیما۔۔۔ اتنے سارے مظالم جو انسان پر ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے مجھے اور لبرل کر دیا ہے۔۔۔ میں اب اتنا لبرل ہو گیا ہوں بابا جان۔۔۔ کہ اب میں اللہ سے بھی آزاد ہو گیا ہوں۔ میں اس الہ کے تصور کو نہیں مانتا جو حدود و مقرّر کرتا ہے، تقدیر تو لکھتا ہے۔۔۔ لیکن پکارنے پر مدد کو نہیں آتا۔۔۔ اب میں اتنا لبرل ہوں کہ میں ہر انسان کے عمل کو اس کی ذاتی ذمہ داری تصور کرتا ہوں۔۔۔ اس طرح وہ ایسے ضبط نفس کو اپنے پر عائد کرتا ہے، جو کوڑوہ خود بنانا ہے، وہ ایسی حدود رکھتا ہے جو اس کی خود ساختہ ہیں۔

یعنی تم "واگون میں یقین رکھتے ہوں۔۔۔ جو عمل تم کرو گے اس کا دوسرے جنم میں عذاب یا ثواب بھگتو گے؟

وہ چند لمحوں کے لئے مسکرایا اور پھر بولا۔۔۔ میں لبرل آدمی ہوں۔ میں چکروں کا قائل نہیں۔ جب ایک ہی چکر میں اس قدر غم و غصہ بھگت لیا تو دوبارہ یہاں آنے کا فائدہ؟

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے کہاں پھاہارکھوں زخم کا دہانہ دکھتے، لیکن نظر آتا تھا۔ اس کی ٹیس کہیں نیچے تھی۔ میں اسے تسلی دینا چاہتا تھا۔

عبدالگل

جی سر

کیا تم سارتر کی طرح فرد کے لئے مکمل آزادی چاہتے ہو۔۔۔ عمل کی مکمل آزادی؟ عمل کی پوری ذمہ داری۔

نہیں بابا جان۔۔۔ انسان دور خا ہے۔۔۔ وہ ہر جگہ ہر لمحہ دوئی کا شکار ہے کوئی شخص

پابند ہوئے بغیر آزاد نہیں رہ سکتا۔۔۔ زندگی دن اور رات کا اکٹھا سفر ہے حق و باطل کی جنگ سدا بہار ہے۔ میں چاہوں نہ چاہوں، لیکن اتنا ضرور مان گیا ہوں، یہ زندگی پنڈولم کا سفر ہے۔۔۔ انسان زندگی اور موت کی دوئی کے درمیان۔۔۔ اگر کہیں وسط میں پنڈولم کو روک سکے۔۔۔ اگر جنگ اور امن کے درمیان کہیں رہ سکے تو وہ لبرل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ بندھا ہوا بھی ہو اور آزاد بھی رہے تو وہ خوشی محسوس کر سکتا ہے۔۔۔ میں قندھار جا رہا ہوں بابا جان۔۔۔ اس قندھار میں رہوں گا جہاں ڈیزی کٹر اور کلکسٹر بموں نے میرا بوڑھا دادا۔۔۔ میری برقعے والی بہنیں اور داڑھی والے باپ کو ختم کر دیا۔۔۔ جب تک میں کسی مذہب، کسی وطن، کسی خاندان کا درد سینے میں نہ بسا سکا، میں یہ نہیں جان سکوں گا کہ دوسرے لوگ بھی میری طرح اپنے وطن، اپنے کچھر، اپنے خاندان سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ جیتک میں اپنوں سے محبت نہ کر سکا تو میں کیسے سمجھ پاؤں گا کہ دوسرے لوگ بھی اسی طرح محبت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔۔۔ میں لبرل ہونا چاہتا ہوں۔۔۔ انسان دوست اور۔۔۔ بابا جان کسی مسلک کا پابند ہوئے بغیر انسان آزاد کیونکر ہو سکتا ہے؟ بیچارہ دوئی کا مارا جب تک پابندی کو ساتھ لے کر نہ چلے آزاد کیونکر ہو؟ میں قندھار جا رہا ہوں، جہاں اب میرا کوئی نہیں۔ صرف ملہ ہے میرے آبائی گھر کا۔

”تم بہت سیانے ہو عبدل گل۔ لیکن ایک بات مجھ بڑھے کی بھی یاد رکھنا۔ تم ابھی عمل تک پہنچے ہو۔۔۔ ایک چیز بے عملی بھی ہوتی ہے۔ جب تک عمل کے ساتھ بے عملی کو نہ سمجھو گے دور تک نہ جاسکو گے۔ تم بیک وقت حدود اور آزادی کو ٹوٹل رہے ہو، ان دونوں کی Interpretation اگر مذہب سے کشیدگی تو نلاح پاؤ گے اور اگر ان دونوں کی سمجھ بوجھ ہیومن رائٹس سے اخذ کی تو آگے پھر دوئی کا سفر ہے، تضاد کا جال ہے۔ ہیومن رائٹس پنڈولم کا سفر تیز کر دیتے ہیں۔ اسے وسط میں لانے کا کرشمہ نہیں کر سکتے۔“

مذہب تو میں کبھی کا چھوڑ چکا۔ بابا جان، مجھے اس اللہ سے کوئی واسطہ نہیں جو ظلم ہوتے دیکھتا ہے اور چپ رہتا ہے۔۔۔ میں اس کی منطق سمجھ نہیں سکتا۔

ابھی گیارہ ستمبر کا زخم تازہ ہے۔ ابھی پنڈولم غم و غصہ کی طرف سفر کر رہا ہے، لیکن وہ وقت آئے گا جب سکون و راحت کی طرف بھی پنڈولم جائے گا۔۔۔ پھر یاد رکھنا کہ سکون اور راحت سوائے اوپر والے کے کسی کے پاس نہیں۔“

یہ بھی آپ کا خیال ہے دنیا کی ہر شے کا پیانا انسان ہے اور اس کے پاس غم و غصے کے علاوہ کچھ نہیں۔

بالکل بالکل انسان ہی پیانا ہے جس سے دنیا کی ہر شے ناپی تولی جاسکتی ہے، لیکن معیار ہمیشہ مسلم ہوتا ہے عزیز می۔۔۔ جانتے ہو جب میٹر ہاتھ میں لیں اور کپڑا ناپیں تو سارے ملک میں میٹر کی لمبائی ایک ہوتی ہے۔ کلو، پونڈ، گرام ہر مقام پر وزن میں ایک ہوتے ہیں۔۔۔ ہر انسان پیانا نہیں ہو سکتا۔۔۔ پیانا بھی ایسا ہونا چاہئے جو ہر عہد میں ہر مقام پر پورا ہو۔۔۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں بابا جان۔۔۔“

یہی تو سوچنے والی بات ہے جان من۔۔۔ انسان پیانا نہیں، نبی پیانا ہے۔۔۔ اسی پر عمل تو لا جاسکتا ہے، اسی پر لبرل ازم کو جانچا جاسکتا ہے۔ وہی سوچ کی درستگی کا ضامن ہے۔ بغیر نبی کے تو انسان کو پرکھنے، جانچنے، ناپنے کے لئے اپنی اپنی عقل درکار ہوگی اور تم جانتے ہو ہر انسان کی عقل پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ہر معمولی انسان کی عقل یونیورسل پیانا نہیں بن سکتی اور تم یہ بھی سمجھ لو، اسی لئے نبی کا امی ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے پاس انسانی علم نہ ہو کوئی ڈگری، کوئی تعلیم نہ ہو، وہ کسی علم کی طرف پہلے سے راغب نہ ہو، اس کی ہوٹ لائین رب سے ڈائریکٹ ہو اور وہ اسی علم کے مطابق تعلیم دے اور اسی قدر اور وہی تعلیم دے جس کا امر ہو۔

وہ ایک لمبی سانس لے کر اٹھا۔۔۔ بس بابا جان بابا جان بس۔۔۔ میں اب کسی اللہ

کسی نجی کو ماننے کے لئے تیار نہیں ... میں جانتا ہوں ... ہم افغانیوں سے کہیں کوئی غلط عمل ہوا ہے یا پھر ... ہم ضرورت سے زیادہ مذہب پرست تھے۔ اس کی بھی تو سزا ہوتی ہے ناں اور شوں کے لئے مرنا پڑتا ہے ناں ... اپنے مسلک کے لئے جان سے ہاتھ دھونا کبھی کبھی ضروری ہو جاتا ہے۔

اے نفس کے چیلے! بیٹھ جاؤ اپنے لئے امید رکھو ... بغیر امید کے انسان شیطان کا چیلہ بن جاتا ہے۔ ہم اس قدر لبرل نہیں ہو سکتے کہ ہمارے لئے کوئی امید ہی باقی نہ رہے۔

وہ کسی اور دنیا میں گم تھا۔

میں اس کے ساتھ اٹھا، لیکن اس نے میرے ساتھ چلنا گوارا نہ کیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ بانی لین کر اس کر کے اس مڑتی گلی میں غائب ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا، لیکن میرے ہاتھ میں ہاف اینڈ ہاف Container تھا اور راجہ دودھ کا انتظار کر رہی تھی۔

فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

میں چونکا اٹھا کر کندھے اور کان میں فٹ کر لیتا ہوں اور وہ واشنگ مشین میں برتن بھی فٹ کرتا جاتا ہوں اور ساتھ ساتھ ہاتھیں بھی کئے جاتا ہوں۔

ابو آپ پلیمز کچھ دن کے لئے ہمارے پاس آجائیں بہوشادہ کہتی ہے۔

”ہاں وہ ... آنا تو تھا، لیکن یہ بچے اب مجھ پر پوری طرح قابض ہو چکے ہیں“

میرا بچہ بھی تو آپ پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ چاہے چند دنوں کے لئے ہی سہی اس کی آواز میں روٹھنے کی ٹون تھی۔

کیوں نہیں کیوں نہیں ... ضرور، ضرور ... میں خوفزدہ بڑھے کی طرح بولا۔

ابھی آجائیں ناں پھر اگلے ہفتے ہمیں آنٹی اقبال کی طرف لانگ آئی لینڈ جانا ہے۔ پتہ نہیں کیوں میرے سارے پروگرام امریکہ پہنچنے کے بعد آنٹی اقبال کے تابع

ہو گئے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا، آنٹی اقبال چھلا وہ تھی اور میں اس کے پیچھے بھاگنے والا۔

یہ تمہاری آنٹی اقبال نہیں چھوٹیں شاہدہ؟ کہاں جاؤ گی اتنی دور ...

یہاں کوئی جگہ دور نہیں۔ ہم امریکی لوگ ہوائی جہاز سے زیادہ کار کے سفر کو پسند کرتے ہیں ابو ... بچے کو انفرمیشن ملتی ہے۔ سرے راستے میں اتنے اچھے Motels ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا سفر کا ...

اچھا ابھی اچھا جاؤ اپنی آنٹی اقبال کے ... ہم سے تو ہی اچھی ...
شاہدہ پاکستان واپس بہونہ تھی۔ یہاں فیملی نہیں تھی، اس لئے اسے میری بھی کچی پکی ضرورت تھی۔

آپ نہیں جانتے ابو ... جب میں پہلے پہل یہاں آئی ہوں تو آنٹی اقبال نے میری کیسے مدد کی ... بالکل ماں کی طرح ... ہارون تو ان سے اتنا مل گیا تھا ... اتنا بل گیا تھا ...

ماں کی طرح ...

ماں کی طرح ...

میں دیر تک فون پر جھانگیر سے باتیں کرتا رہا، لیکن کہیں دماغ میں ایک جھینگڑ گھس کر کہتا رہا ماں کی طرح ... ماں کی طرح۔ اقبال کے متعلق میں عجیب سے مغالطے میں مبتلا ہوں۔ مجھے ایک کہانی یاد آرہی ہے۔

ہرات کے بادشاہ کی بیٹی چاند کا کلڑا تھی۔ جدھر سے گزر جاتی، دیکھنے والے سششدر رہ جاتے۔ ایک روز اپنی پاکلی میں سوار بازار سے گزری۔ پاکلی بردار حبشی زنجے ایک عطار کے سامنے رکے۔ شہزادی نے پاکلی کا پردہ اٹھا کر دکاندار سے بات کی۔

اس وقت میٹریہیوں پر ایک درویش بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے روٹی کا کلڑا زمین پر آ رہا اور سانس بند ہونے کو آئی۔ شہزادی نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ اب تو درویش پرانہ طاری ہو گیا اور وہ نیم دیوانہ جذب کی کیفیت میں چلا گیا۔ اسی طرح وہ

سات سال ان ہی میڑھیوں پر بیٹھا شہزادی کے لوٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ رات کے وقت آوارہ کتے اس کے ساتھ آکھر لیٹ جاتے، دن میں بلیاں اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتیں۔ لوگ اسے مجذوب سمجھ کر روٹی ڈال دیتے۔ کچھ دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے، لیکن درویش وہیں بیٹھا رہتا۔ عطار بالآخر اس سے اس قدر بیزار ہو کر مارنے کی ٹھانی۔

اتفاق ان ہی دنوں ایک بار پھر شہزادی کا ادھر رخ ہوا۔ جونہی اس نے شہزادی کو دیکھا، سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ اس نے شہزادی سے کہا: ... ایک سال بے اگر اس کا جواب دے ڈالے تو میں ہرات چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔
پوچھ کیا پوچھتا ہے۔

اے چودھویں کے چاند! اس روز تو مجھے دیکھ کر مسکرائی کیوں؟
شہزادی دوبارہ مسکرا کر بولی: ... ”تیری ہونق حاست دیکھ کر مخطوط ہوئی، تجھ پر ترس آیا اور مسکرا دی۔ ... اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔“

سر جھکا کر درویش بولا: ... ٹھیک ہے آپ کی ادا ٹھہری۔
شہزادی عطر میں مشغول ہو گئی، درویش نے اپنا آپ سنبھالا اور ہرات سے رخصت ہو گیا۔

کہتے ہیں اس ملاقات کے بعد درویش کو ہوش آ گیا اور وہ بغداد شہر میں مدہنے لگا۔ وہ شہر کا مشہور ترین مصور تھا، لیکن تعجب ہے کہ وہ ہر تصویر میں ایک ہی شہزادی پیش کیا کرتا۔ اس نے ہزار تصویریں بنائیں۔ گو شہزادی وہی رہتی، لیکن اس کی ایک تصویر دوسری سے نہ ملتی تھی۔ اس نے سات سال دیوانہ رہ کر زندگی کی نیرنگی کو یک رنگ کر لیا تھا۔

جمشید اور قیصر بڑے خود مختار بچے ہیں۔ وہ ہرگز مجھ پر قابض ہو کر اپنے آپ کو پابند نہیں کرنا چاہتے۔ میں سینک کٹا کر کبھی کبھی پچھڑوں میں شامل ہو جاتا ہوں۔ اس

وقت ہم تینوں بیکن آئس کریم کھانے میں مشغول تھے۔

”دادا! ہو رہیں بیکن آئس کریم ہوتی ہے۔“

ہوتی ہے، لیکن وہاں کافی ہوتی ہے زیادہ۔۔۔ کھلنا ہوتا ہے۔

کافی۔۔۔ کھلنا وہ دونوں یہ لفظ سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ وہ عام طور پر ایسے لفظوں کا گانا بنا کر ایک دوسرے کو چڑایا کرتے۔ جمشید نے امریکی ریپ ڈھن میں کہا کھلنا
Sat in a Saucer Crying for the old man To

come for a Boxer.

کھلنا۔۔۔ کافی۔۔۔ یو۔۔۔ یو۔۔۔ یو۔۔۔

کھلنا۔۔۔ کافی۔۔۔ ہو۔۔۔ ہو۔۔۔ ہو۔۔۔

اب دونوں نے مل کر اسے گانا شروع کیا۔ ان کے جو گزرنے لکڑی کے فرش پر ایک خاص قسم کا ردھم قائم کر لیا، جوان کے لئے بھی مسحور کن تھا اور میرے لئے بھی۔۔۔ اس وقت ارجمند پہلی منزل پر وارد ہوئی۔ اس کے ہاتھوں پر کندھے کے ساتھ گرومیرز کے تھیلے پیکٹ شاپر تھے۔ وہ فرانسیسی بیکری سے ڈبل روٹی، چینی دکان سے چاول، ہندوستانی شاپ سے اچار چٹنیاں، بننی نان بانی سے روٹیاں اور اطالوی شاپ سے پیزا لائی تھی۔ سوائے باسستی کے اس کے سامان میں کچھ پاکستانی نہ تھا۔

”ہائے تو بہ پھر پھر کے دیکھ دیکھ کے بھر کس نکل گیا ابو“

اسی شاپنگ کے باعث اس کا بہت سارے نسلی گروپوں کے ساتھ تال میل رہتا تھا۔

ایک ہی مارکیٹ سے سب کچھ خرید لیا کرو۔

ناں ابو۔۔۔ ایک ہی مارکیٹ میں چوائس نہیں ملتی۔۔۔

چوائس بھی آج کے عہد کا اور ترقی کا بہت بڑا شاخصاں ہے۔ اسی چوائس نے Consumers Society میں روح پھونک رکھی تھی۔ اشیاء تک تو خیر تھی، لیکن

اسی چوائس کی بدولت طلاق کی شرح بھی بڑھ گئی تھی۔ اسی کی بدولت بیروزگاری کا ہوا دمناتا پھرتا تھا اور اسی پسند ناپسند کے باعث انسان ہر شہر میں اکتایا رہتا تھا۔ نئی نسل نے اسی پسند ناپسند کے باعث خود سری سیکھ لی تھی۔ جس بچے سے ماں روز صبح پوچھتی ہو۔ ”انڈہ بائیل، سنی سائیڈ اپ یا اسملیت“ وہ بچہ صاحب رائے ہو جاتا ہے پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس رائے میں ایسی پختگی آ جاتی ہے کہ وہ کسی اور کی رائے برداشت نہیں کر سکتا۔

سماں کو جگہ رکھتے ہوئے ارجمند بولی میں نے کہا تھا آج آئس کریم کی اجازت نہیں۔ نو آئس کریم ٹوڈے

دادا نے کہا تھا جمشید نے انعام مجھ پر دھرا۔

سواٹ ماما وائی ناٹ آئس کریم۔ قیصر نے سوال کیا۔

وہائی؟ کیوں کس لئے؟ بچے ہر لمحہ سوال ہیں۔

کیوں کہ ہم لانگ آئی لینڈ جا رہے ہیں۔

کہاں ماما؟ کہاں

کہاں؟ کون سی سمت میں۔ کس قدر؟ سچ کی پوچھوال ہے، مکمل سوال۔

لانگ آئی لینڈ وہاں ہمیں انکل ٹار نے بلایا ہے؟ یاد ہیں انکل ٹار

”یاد ہے ماماں That tall guy“

وڈ براؤن Whiskers

وہ دونوں کسی پرانی یاد کو آپس میں شیئر کر کے مسکرانے لگے پھر جمشید نے ہستہ

گایا۔

Uncle Nisar was little baby

Sitting on his Mama,s Knee

Big bend tunnel on C + O

وہ دونوں شرارت سے ہنسنے لگے۔ ان کے لطیفے کا میرے اور ارجمند کے پاس کوئی سرائہ تھا۔ یہ ان کا کوئی ذاتی جوک تھا۔

بلال کی ایک یہ بھی ہابی ہے۔ وہ کمپیوٹر پر بیٹھ کر نئے راستے نکالتا رہتا ہے۔ اس کے جوکانداز ڈسٹ بن سے نکلتے ہیں۔ عموماً اس پر راستوں کے نقشے ہوتے ہیں۔ میں تو شاید یہ نقشے پڑھ کر سفر نہیں کر سکتا، لیکن اسے خوب مہارت ہے۔ ایسے ہی ایک نقشے کے سہارے ہم لانگ آئی لینڈ کی طرف رواں دواں تھے۔

US Route 1 South 18.3 miles

Benn turn Pike exit 24 miles

Pike Portions tolls

1 - 76 East (Exit 24, tolwards)

Philadelphia 1-476

Valley forge. (U.S 202)

Merger 1-76 E

وہ میامی سے نیویارک 1340 میل ساؤتھ کے راستے کا نقشہ بنا کر کئی دن فائل میں رکھ کر پھاڑ دیتا ہے۔ اسے اس انجیلز سے 2875 میل کا سفر اگر کار سے کرنا ہوتا تو اسے بخوبی راستہ آتا ہوتا ہوگا۔ شمال میں اگر وسکانسن سیٹ سے اسے نیویارک پہنچنا ہو تو وہ راستے نہیں بھولتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے مشرق، مغرب، شمال، جنوب کے حساب سے چنے والی مین U.S راؤٹ کو کہاں پکڑنا اور کہاں چھوڑنا ہے۔ ہر میجر سے بہت پہلے وہ تیار ہوتا ہے اور Exit کا اسے بخوبی علم ہوتا ہے۔ وہ کہیں جائے نہ جائے، پلان اس نہابی کی طور پر بنا رکھا ہوتا ہے۔ اسے بھی شاید اصلی شاہراہ کی تلاش ہے۔ جسے وہ دنیاوی راستوں میں ڈھونڈتا ہے۔

ہم مسز نثار سے ملنے لانگ آئی کہ طرف روانہ ہیں۔ راستے میں ہم بار بار Hov

والی سڑک پکڑتے ہیں، جو چار روپیہ سڑکوں پر بالکل بائیں ہاتھ اور آخری ہوا کرتی ہے۔ اس پر وہ کاریں چلتی ہیں، جن میں وہ سے زیادہ سواریاں ہوں۔ عموماً پولیس کی کاریں کہیں نہ کہیں جھاڑیوں میں چھپی، کسی نشیب میں نقاب لگائے تیز رفتار گاڑیوں کو اچانک اوور ٹیک کر کے روک لیتی ہیں۔ پولیس بہت منظم اور مددگار ثابت ہوتی ہے، لیکن تیز رفتاری کے معاملے میں ٹکٹ بھی ضرور دیتی ہے۔ بلال بھی دو ایک بار یہ ٹکٹ حاصل کر کے جرمانہ بھر چکا ہے۔

ہم سٹیشن ویگن میں سوار ہیں۔ ارجمند اور بلال سامنے والی سیٹوں پر، بچے بالکل بیک پر ہیں اور میں درمیان میں دو والی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میری سیٹ کے سامنے چھوٹا سائیلی ویشن بھی لگا ہے، جسے جمشید اور قیصر کبھی کبھی آگے جھل کر دیکھتے ہیں۔

بلال ڈرائیو کرتے وہ بڑے جمشید اور قیصر سے کہتا ہے ایک ڈچ آدمی پیر مینیوٹ نے چوبیس ڈالر کے ٹنکس کے بدلے مین ہیشن جزیرے کو ریڈ انڈین لوگوں سے خریدا۔ اس کے بعد اس ڈچ جزیرے کو انگریزوں نے چھین لیا، لیکن دس پندرہ سال کے بعد پھر مین ہیشن آئی لین ڈچ ملکیت بن گئی۔ جب امریکی بغاوت ہوئی تو اس وقت نیویارک انگریزوں کے پاس تھا۔

ارجمند اس انفرمیشن سے نہ صرف بور ہوتی ہے، بلکہ نخ جاتی ہے۔ رام سے کار چلاؤ بلال۔ یہ امریکن ہسٹری بیان کرنے کا کون سا وقت ہے۔

بچوں کو انفرمیشن دینا ماں باپ کا فرض ہے بلال غراتا ہے۔

یہ کون سی جگہ یا وقت ہے۔۔۔ تم بار بار غلط اوور ٹیک کر رہے ہو۔ سڑکیں بدل رہے ہو اور پھر بچے اتنی پیچھے ہیں کہ تمہاری آواز بھی وہاں تک نہیں جا رہی۔

جو کچھ بھی ہے۔۔۔ میرے پاس صرف یہی وقت ہے۔ میں انہیں جاہل نہیں دیکھنا چاہتا۔۔۔ سکول میں بہت کوچہ سی ٹیشن ہے۔

گھر پر تو تمہیں سوائے فٹ بال دیکھنے کے کوئی وقت ہی نہیں ملتا۔۔۔ یہاں ساری

کسر نکال رہے ہو۔

اب وہی بحث چل نکلتی ہے جو آج کے ، ڈرن میاں بیوی کی زندگی میں زہر کھوتی رہتی ہے۔ دونوں اپنے آپ کو Over Worked, misunderstood اور Under-appreciated لیکن نیک دل سمجھتے ہیں۔

ہم سمندر کے نیچے سے گزرنے والی ایک ٹنل سے گزر رہے ہیں۔ میں ایک لمبی اونگھ سے جاگا ہوں۔ بلال اور ارجمند میں کسی موضوع پر خوش دلی سے اظہار ہوا ہے اور وہ دونوں ہنس رہے ہیں۔ جمشید اور قیصر چپس اور برگر کھا رہے ہیں۔

اما اس نے میرے گھٹنے پر کچپ لگا دی ہے۔ جمشید چیختا ہے۔

ڈونٹ فائٹ ورنہ تمہارے بابا کوئی ڈرائیونگ کی غلطی کریں گے اور پھر پولیس آجائے گی۔ ٹکٹ ملے گا بابا کو قریباً ساٹھ ڈالر کا۔۔۔

میں مضبوط کچی ٹنل میں سے گزر رہا ہوں جو غالباً بڈ سن دریا کے نیچے بنی ہوئی ہے یا سمندر کے کسی حصے سے نیچے بنائی گئی۔ یہ ٹنل مجھے آپا کی سہیلی اقبال تک لے گئی ہے۔ قریباً پینتالیس سال پہلے کے واقعات میرے ذہن میں گھومنے لگے ہیں۔ یہ پینتالیس سال سمندر کی طرف میرے وجود کے اوپر ہیں اور میں ایک ٹنل کے ذریعے اس وقت میں جا پہنچا ہوں، جب اقبال سے میری محبت اندر ہی اندر مجھے سرنگ کی طرح کھوکھلا کئے جا رہی تھی۔

اصغری کے ساتھ میں ٹمپل روڈ سے ٹکل کر سمن آباد میں جا بسا تھا۔ یہ آبادی بالکل نئی تھی اور اس میں صرف کچھ این ٹائپ گھر تعمیر ہوئے تھے۔ گبرگ اور ڈیفنس کی آبادیاں ابھی مستقبل کی کوکھ سے برآمد نہ ہوئی تھیں۔ ماڈل ٹاؤن ایک پوش علاقہ شمار ہوتا تھا جس میں اونچے چھتارے خوبصورت درخت تھے۔ بڑے بڑے Colonial بنگلے، آٹھ آٹھ دس دس کینال کے رقبوں میں جادوگر نظر آتے تھے۔ یہ ساری بستی ہماری سوچ اور پہنچ سے باہر تھی، کیونکہ نہر کے آگے ہماری کائنات ختم ہو

جاتی تھی۔

جب بھی آپا اپنے سرال سے آتی، اس کی کالج کی دوست اقبال ضرور ملنے آتی۔ اقبال کی وضع قطع، لباس انداز سب اونچے سرکاری انسروں کی طاقت کا غماز تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے اور شاہد بھائی کو احساس کمتری کا سامنا رہتا۔ ہم دونوں شاہد الیکٹرونک سٹور کی ایک معمولی سی دکان پر کام کرنے جایا کرتے تھے۔ آپا کی شادی کے بعد شاہد مستقل طور پر دکان کی دیکھ ریکھ میں مصروف رہتے۔ انہوں نے بے اے کا امتحان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں بھی کالج سے واپس چھوٹے شاہد الیکٹرونک سٹور پر گزرتا۔ شام کو کبھی اکٹھے اور کبھی علیحدہ علیحدہ ہم دونوں کافی ہاؤس جاتے۔ یہاں کی گرما گرمی، بحثا بحثی اور خیالات کے لئے دھینگا مشتی کی فضا ہم میں جینے کی امنگ پیدا کرتی۔ ہم دونوں چوری چوری شعر بننے کا عزم کئے بیٹھے تھے۔ میرا خیال تھا نا موری اور عزت کے لئے شاعری ایک شارٹ کٹ ہے۔ میں اپنے کھوکھلے پروفیشن کے لئے اسے بطور خوبصورت پیکنگ کے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں شاعری میں نام پیدا کر کے اقبال کے والد پر خاطر خواہ رعب گانٹھ سکتا ہوں۔ اقبال کی محبت میں کیا کچھ ہوا، کیسے ہوا۔ یہ تو میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا اور اس کی تفصیلات میں شاید آپ کو کچھ اتنی دلچسپی بھی نہ ہو، لیکن میری اس سے آخری ملاقات ان کے گھر پر ہوئی۔

اقبال کے والد ڈی پی آئی تھے۔ ان کا دفتر انا رکلی شروع ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر تھا، لیکن کوٹھی ان کی جیل روڈ پر تھی۔ ان کی یہ کوٹھی الاٹ شدہ تھی، حالانکہ وہ مہاجر نہ تھے۔ گھر سے کچھ ہی دور Observatory تھی۔ میں کبھی کبھی آپا کو اقبال سے ملانے جیل روڈ لے جایا کرتا۔ اس روز میں نیسا کہ اقبال کی منگنی ہوئی ہوئی ہے۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا، کیسے ہوا، لیکن میں اکیلا ہی جیل روڈ پر پہنچ گیا۔

کوٹھی کے کشادہ برآمدے میں کرسیاں میز لگا تھا۔ میں نے اسی برآمدے میں اس

ستون کے ساتھ اپنی سائیکل ٹیک میں رکھ دی جو سارا بوگن ویلا کی بیل سے ڈھکا تھا۔
 کچھ دیر میں باہر کی کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اندر طلب کر لیا گیا۔
 اونچی چھت والا ڈرائنگ روم منی کے گرم خشک موسم میں خنک تھا۔ ایک ملازم
 میرے لئے شربت لے آیا اور کوئی تیسری مرتبہ مودب طریقے سے گویا ہوا۔ سرگھر پر
 کوئی نہیں ہے۔ سوائے بی بی اقبال کے۔

اس سے پہلے میں نے کسی کا نام نہ لیا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ میں انتظار کر لوں گا۔
 اس بار میں نے بڑی جرات سے کہا۔ بی بی اقبال کو بتائیں میں انہیں آپ کا پیغام دینا
 چاہتا ہوں۔

کچھ دیر بعد اقبال آگئی۔ اس نے لٹھے کی سفید شلوار، چٹا ہوا دوپٹہ اور پھودار پرنٹ
 کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے دونوں شانوں پر لمبی لمبی دو چوٹیاں لٹک رہی تھیں۔
 جن میں گلابی ربڑوں کے پھول نمایاں تھے۔ چہرے پر کوئی میک اپ نہ تھا۔ لیکن
 کشمیری رنگت دغ دغ کر رہی تھی۔ ایوننگ ان پیرس کی خوشبو سے چھت تک کمرہ معطر
 ہو گیا۔

السلام علیکم جی۔

وعلیکم السلام

اقبال کھڑی رہی

میں بھی کچھ دیر بگڑ سا کھڑا رہا۔

آپ بیٹھے ناں۔

آپ بھی تو بیٹھیں۔

وہ صوبے پر گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گئی۔

جی آپا، وہ پیام آپ کا؟ جی۔

آپا آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ اسے جلد ہی ساہی وال جانا ہے۔ ان کے سسرال

والے بھند ہیں۔ اگر آپ آج کل میں کسی وقت آسکیں تو ...

جی میں آجاؤں گی جی ... آج کل میں ملے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، جیسے مجلس پر خاست کاہنٹ دے رہی ہو۔

ایک اور بھی بات تھی۔ ذاتی سی ... مجھے علم نہیں کہ وہ بات میں کربھی سنا ہوں یا

مجھے کرنی بھی چاہئے لیکن

وہ پھر گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گئی۔

مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ اقبال کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا؟ ہم دونوں محبت

کے کس مرحلے میں تھے۔ میرے گھر پر شاید بھائی میرے لئے ایک رکاوٹ کا

باعث تھے۔ مجھے ان کی نظروں سے اس تعلق کا پتہ چلتا جو میں بھی اپنے اندر محسوس کرتا

رہا۔ اسی روک کے باعث میں اقبال کی جانب پوری سپیڈ سے بڑھ نہ سکا۔ جیل روڈ

کی کوٹھی میرے لئے آؤٹ آف Bounds تھی جب بھی میں آپا کو لے کر اقبال

کے گھر جاتا۔ عموماً ہم ٹیکسی ان کے گیٹ پر ہی چھوڑ دیتے۔ پھر میں تو براہِ آدے

میں بیٹھا رہتا۔ کبھی چائے پیتا، کبھی اخبار پڑھتا، لیکن میری رسائی کم ہی ڈرائنگ روم

تک ہوتی۔ اگر آپا کو سارا دن گزارنا ہوتا تو پھر میں گھر چلا جاتا اور شام کو عموماً شاہد

بھائی آپا کو لے کر گھر آجاتے ... اقبال سے ملاقاتیں بہت رہیں۔ اس سے باتیں

بھی ہوا ہی کرتی تھیں۔ مجھے یہ بھی وہم ہو گیا تھا کہ وہ میری طرف جی جان سے مائل

ہے، لیکن اس کے باوجود ہم دونوں اظہارِ محبت میں گونگے تھے۔ اس روز میں سر سے

پاؤں تک ارادے کا زور لگا کر اس کے پاس پہنچا تھا۔

میں نے سنا ہے کہ آپ کی منگنی ہو رہی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی گلابی سی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

جی۔

کون خوش قسمت ہے وہ۔

خوش قسمت نہیں بد قسمت ... اقبال نے جملہ مکمل نہ کیا۔

میرے ارادے میں جرات کا اضافہ ہوا۔

ایک نثار صاحب ہیں۔

بہت امیر کبیر؟ میں نے پوچھا۔

جی ... آکس فیکٹری ہے باپ کی، خود مول سروس میں ہیں۔

بہت بینڈ سم۔

ہاں جی ... ٹینس کھیلتے ہوئے اچھے لگتے ہیں اقبال بولی۔

پھر تو مجھے کوئی بات نہیں کرنا چاہئے۔ اتنی خوبیوں والے کے سامنے ... پٹرو میکس

کے آگے دیا کیا جلے ... مجھے رونا سا آ گیا۔ ہال روڈ پر وہ دکان جس میں پرانے

ٹائپ رائٹر ریل والے ٹیپ ریکارڈ چھوٹے چھوٹے ریڈیو، استریاں بیٹری پڑے تھے،

نظروں میں وہ سارے شیلف الماریاں گھوم گئیں۔ اپنا وہ میز بھی یاد آیا جس پر کاویا،

چھوٹے اوزارت، کرنٹ دیکھنے والا سچ کس، پلاس، ہتھڑی، برے پڑے تھے۔ وہ

ایک مستری کی بات کیا سنے گی۔ مستری بھی ایسا جس نے کسی انجینئرنگ کالج سے تعلیم

حاصل نہ کی تھی۔ بس پرانے الیکٹرک گڈز کھول بند کر کے تجربوں سے کچھ شہدہ بدھ

حاصل کر لی تھی۔

میری تعلیم بھی ابھی مکمل نہیں۔

مجھے معلوم ہے۔

اگر مکمل بھی ہو جائے تو ایم اے پولیٹیکل سائنس کو کون پوچھتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ

لیکچرار لگ جاؤں گا، کسی قصبہ کی کالج میں۔ اوپر سے مہاجر بھی ہوں۔

میں نے تو ابھی بی اے کا امتحان دینا ہے۔ جی کون جانے دیا بھی جاتا ہے کہ نہیں؟

پتہ نہیں کیوں یہ جملہ مجھے گلوکوز کی ڈرپ بن کر گا۔

ابھی شہر میں کوئی ایم بی اے، ایم پی اے، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن ڈش کیبل نہ

تھا۔ ابھی تھرڈ ورلڈ کے لئے یہ سب کچھ ایجاد نہ ہوئے تھے۔ ہم لوگ تو ابھی چھرے والی بوتل پی کر ہی خوش ہوتے تھے۔ کون، آئس کریم کوکا کولا، کے ایف سی، میکڈونلڈ، چینی تھائی کھانے سب ابھی وقت کی روا میں چھپے ہوئے تھے۔ ابھی موسم آتے تو محسوس ہوتے۔ محبت ہو جاتی تو اس کی خوشبو سوتے جاگتے ساتھ رہتی۔ سارے نظام رب العزت چھاتا اور والدین کی حکومت زندگی اور گھر پر نافذ رہتی۔ بہن بھائی سے رشتہ جڑا رہتا۔ دوستی آسانی سے ٹوٹنے والی چیز نہ تھی۔۔۔۔۔ زندگی کی آبیاری کے لئے بازار، اشتہار، مادی سہولتیں درکار نہ تھیں۔ پھر اونچ نیچ کا احساس شدید تھا۔ بھانت بھانت کے لوگ مختلف علاقوں سے اکٹھے ہو گئے تھے اور نئے چہرے خوفزدہ کرنے کو کافی تھے۔ لوگ گھرانوں میں ذاتوں میں، طبقاتی نشیب و فراز میں بٹے ہوئے تھے۔ لوگ مختلف مقامات سے اٹھ کر پاکستان میں اس امید پر آئے تھے کہ سارے اختلافات مٹا کر ایک قومی تشخص کا حصہ بن جائیں گے۔ میں بھی اسی امید کو لے کر آیا تھا کہ اقبال کی محبت دہل ہے جو ہال روڈ کی دوکان اور جیل روڈ کی کوٹھی کو ملا سکتا ہے۔ لیکن!

اگر اقبال۔۔۔۔۔ آپ شاعری کو کچھ اہمیت دیتی ہوں۔۔۔۔۔ تو میں۔۔۔۔۔ ایک کوالٹی ایسی پیش کر سکتا ہوں جو نثار صاحب میں نہیں ہے۔

میرے نزدیک تو شاعری الہام کے قریب ہے، لیکن ڈیڈی شاعری کو تصنیع اوقات سمجھتے ہیں۔

اچھا تو میں چلتا ہوں پھر۔

بیٹھے ناں۔

اتنی دیر میں باوردی بیرا ایک گلاس وٹو کا اور لے کر آ گیا۔ کمرے میں پہلے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو پھیلی تھی اب اس میں وٹو کا اضافہ ہوا۔۔۔۔۔ وہ گلاس پکڑا کر رخصت ہو گیا۔

کیا میں آپ کے ابا جی سے بات کر سکتا ہوں۔

آپ؟ کیسی بات وہ گھبرا گئی۔

میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اقبال ... میں نے یہ جرات اپنے ان

خوابوں سے مستعاری ہے جو میں کئی سالوں سے دیکھ رہا ہوں ...

لیکن اب اس کا فائدہ ... وہ فیصلہ کر چکے ہیں اور وہ فیصلے بدلہ نہیں کرتے۔

میں نے محسوس کیا یا شاید میری خواہش نے اسے یوں دیکھنے پر مجبور کیا۔ ایک موٹا

سا آنسو اس کی گال پر موتی سالک گیا۔

اسی آنسو نے میرے حوصلے بلند کر دیئے۔ میں اپنے اندر فرہاد کی روح کو کلباڑے

سے نہر کھودتے دیکھ رہا تھا۔

مجھے ایک بار ... صرف ایک بار اپنے ابا جی سے ملا وہ ... میں ان کے منہ سے انکار

سننا چاہتا ہوں۔

اقبال نے منہ پرے کر لیا اور پھر اٹھتے ہوئے بولی ... ایکسوزمی ... پھر میں کبھی

ڈیڈی سے محبت نہ کر سکوں گی ... اسی لئے آپ ڈیڈی سے نہیں مل سکتے۔

وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس زمانے میں لڑکیاں غسل خانے میں چھپ کر رویا کرتی

تھیں۔

وٹو کا گلاس ختم کرنے کے بعد میں ہال روڈ کی دکان پر چھا گیا۔ متذبذب تھا کہ

میں اقبال کے ڈیڈی کو کیا پیش کروں۔ شاید میرے ساتھ ایوننگ ان پیرس کی خوشبو

چلی آئی، کیونکہ گھر پہنچ کر شاید بھائی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

سٹیشن ویگن لانگ آئی لینڈ کے بہت قریب تھی۔

میں بوڑھوں کی لمبی اونٹھ سے جاگ کر گر دو پیش کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ نہ جانے

پاس سمندر کا ساحل تھا کہ ہڈ سن دریا بہہ رہا تھا۔ ہم مین ہیٹن جزیرے سے گزر چکے

تھے کہ نہیں۔ میں لانگ آئی لینڈ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن

ارجمند اور بلال میں زور شور کی بحث ہو رہی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ ان کی اس گرم گرمی کے باعث کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ مجھے مختار شیخانوف کی رزمیہ نظم یاد آگئی۔ اس قاذق شاعر نے روحانیت اور اخلاقیات کے بنیادی اصولوں کے انحراف کو انسانی تشخص کی بربادی کا ضامن ٹھہرایا ہے۔ میں آپ کو بیاض قدیم کی ایک کہانی سناتا ہوں۔ اس نثری نظم کا عنوان شاید یہ تھا۔ ایک نظر آدمیوں پر یا شاید ایک موقع جو ہمیشہ عورت کو ملتا ہے۔

سنا ہے کہ اوترا کر کے قدیم شہر میں ایک غریب کریم نامی آدمی رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک شاہانہ نسل در نسل صحیح نسب کا ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑے کی صفت تھی کہ وہ کبھی کسی بد رو سے پانی نہ پیتا، بلکہ پیسا رہ کر کسی شفاف ندی کے انتظار میں رہتا۔ کریم کی بیٹی نے ایک دن باپ سے کہا۔ ”تمہارا گھوڑا بہت بد خو ہے، کیوں نہ ہم اسے بیچ ڈالیں یا کسی اور گھوڑے سے اس کو بدل ڈالیں ایسے درشت گھوڑے کا فائدہ؟“

کریم دکھی ہو کر بولا۔ ”دیکھ بیٹی! اس کی نازک مزاجی اس میں رواں اعلیٰ خون کے باعث ہے۔ یاد رکھ ایسا حساس گھوڑا ہی پلک جھپکنے میں سب سے آگے نکل سکتا ہے۔ اپنی نسل کا افتخار ہی اس ارادے کا مضبوط اور وفادار بناتا ہے۔ مجھے ڈر ہے بیٹی تم ایسا صاحب افتخار شجاع شوہر نہیں چن سکو گی جو مضبوط کردار کا مالک بھی ہو۔ تم ایک بوڑھا ٹٹو شوہر تلاش کرو گی جو اطاعت شعار مسکین ہو۔ جدھر تمہاری رضا ہو، اسے ادھر کو ہانگ سکو۔ تم اس پر پیٹھ کر سواری کرو گی۔ یاد رکھو کہ راکب اور مرکب ایک سے ہوا کرتے ہیں۔ میں تمہیں انتباہ کرتا ہوں کہ مرد کو احساس عزت و افتخار ہی مرد بناتا ہے۔ جو مانگے کے سائے میں چلتا ہو، اپنی رائے نہ رکھتا ہو، اسے مرد کیسے کہیں گے؟ ہر جنس کی اپنی کشش ہے، دانش بھری عورت وہ ہوتی ہے جو گردش کے راستوں پر چلتی ہے اور اپنے دکھڑے کسی کو نہیں سناتی، نہ ہی کسی کے سامنے روتی ہے۔ یاد رکھو جو عورت یہ موقع کھودیتی ہے وہ عمر بھر رقص زیست کو روتی ہے۔“

میں دیکھ رہا تھا کہ ارجمند نے روشن پیشانی، حساس نتھنے اور اکی گرون والے بلال کو چماتا تھا۔۔۔ وہ شاہی کھوڑے سے بیاہی گئی تھی، لیکن اطاعت شعار، مسکین ٹٹو کی خواہش نے اس کے قص زیت کو جنگی ورزش میں دل رکھا تھا۔

ہم لانگ آئی لینڈ کے ایسے گھر میں بیٹھے تھے جو ہر جانب سے درختوں میں گھرا جنت کا ٹکڑا لگ رہا تھا۔

سارے نثار صاحب بیٹھے تھے۔ ان کی بارہ سالہ بیٹی میرے ساتھ صوفے پر تھی۔

پتہ نہیں ڈیزی کدھر چلی گئی ہے۔۔۔ خیر ابھی آجائے گی۔

انکل آپ پہلی بار لانگ آئی لینڈ آئے ہیں؟ نثار کی بیٹی سارا نے مجھ سے سوال کیا۔

ہاں بیٹی پہلی بار آئے ہیں۔ آپ تو بڑے خوبصورت علاقے میں رہتی ہیں۔

یہاں بڑے ٹوپ نوچ لوگ رہتے ہیں۔ ہلری کلنٹن نے بھی یہاں گھر خریدا ہے۔

میں آپ کو دکھا کر لاؤں گی انکل۔

جمشید اور قیصر دباوب چپس کھانے میں مشغول ہیں۔ بلال اور ارجمند تھوڑی

دیر پہلے ہونیوالی بحث بھول چکے ہیں۔ اس وقت لگتا ہے کہ ارجمند چھوٹی سی لڑکی

ہے اور اس کے تسمے باندھنے والا بلال حقیقت میں اس کا بڑا بھائی ہے۔

میں انہیں سیونگ پر لے جاؤں انکل بلال؟ سارا بولی۔

ضرور۔

لیکن۔۔۔ ارجمند کچھ گھبرا جاتی ہے۔

بالکل سیف ہے ارجمند سامنے ہی ہے۔ وہاں ایک گارڈ بھی ہر وقت

موجود رہتا ہے۔

تینوں بچے باہر نکل جاتے ہیں۔

اقبال کا کہیں اتا بتا نہیں۔ صرف پینتالیس برس پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔ نہ

جانے اب کیسی متی ہوگی۔ کیا دانتوں کا Denture اسے سوٹ کیا ہوگا؟ کیا جسم

فرہ ہو چکا ہے؟ آواز میں وہ حلاوت رہی بھی کہ مردانہ نام نے اس نرمی کا گلا گھونٹ دیا؟ اقبال کے ساتھ اپنے اندرونی تعلق کا میں کبھی تعین نہیں کر سکا۔ اس میں کہیں شدت نہ تھی اور اس کے باوجود گرم پانی کی بوتل کا وہ سینک تھا جو میں ابھی تک محسوس کرتا چلا آتا تھا۔ بوتل جو ابھی تک ٹھنڈی نہ پڑی تھی۔ وہ ہیٹر نہیں تھی ایک کانگری تھی ادھ جلی، جسے میں گود میں اٹھائے پھرتا۔ سمجھے اس سے کچھ لینا دینا تھا، نہ کوئی ایسی یادیں تھیں جنہیں ہم دونوں مل کر دوہرا سکتے بس۔۔۔ بس شعاعیں سی تھیں جو ڈوبتے سے دریا کی سطح پر پڑا کرتی ہیں۔

میں نے نثار کی جانب غور سے دیکھا۔ اس کی پشت پر ایک بوڑھے قازقستان کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ مجھے گل گایہ کریم قازقستان میرے بھید کو جانتا ہے اور مجھے کوئی نصیحت کرنا چاہتا ہے۔ قبر میں گڑے مردے سے متعلق کوئی ایسا مقولہ اس کے پاس ہے، جو میرے اندر پڑی گا نٹھ کو کھول سکتا ہے۔

سامنے نثار بیٹھا تھا۔

کیا یہی نثار تھا جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ وہ ٹینس کھیلتا بہت خوبصورت لگتا ہے۔ کیا وہ نثار کوئی اور تھا جس کے مرنے کی خبر اخبار میں پڑھ کر میں نے بڑی راحت محسوس کی تھی۔

نثار کا قد چھ فٹ سے کچھ کم تھا، لیکن اب اس خمیدہ قد میں شاہ بلوط کی خوبی نہ تھی۔ ماتھا فراخ ہو کر گنبے پن میں بدل گیا تھا۔ بال سارے سفید، لیکن چمک سے عاری تھے۔ میں اسے پوچھنا چاہا کہ وہ اپنی سروں میں کہاں رہے اور میں تب اسے کتنے فاصلوں پر رہا پھر سوچا یہ تفصیلات تو ارجمند سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ پھر ان تفصیلات سے ماننا بھی کیا تھا۔ ایک ہی شہر میں کیا پرانے دوست اجنبی نہیں ہوتے کیا۔ مجھے لگا نثار تنہائی زدہ تھا۔ بلال اور ارجمند ایسے پیش آرہے تھے جیسے بڑھے انکلوں سے ازراہ مروت پیش کیا کرتے ہیں۔ وہ امریکنوں کا مذاق اڑانے میں مشغول تھا۔

ساتھ ہی ساتھ یوں بھی لگتا تھا کہ اسے امریکن جی جان سے پسند آئے تھے۔ گھوم پھر کر وہ پاکستانیوں کے خلاف بے شمار الزامات بیان کرنے میں مشغول ہو جاتا۔ یہاں ہم لوگ کو نہیں، بھانت بھانت کے پنچھی اکٹھے دیکھے ہیں۔ جس قدر Ethnic ورائٹی امریکہ میں ہے اتنی تو کہیں اور نظر نہیں آتی۔ بلال نے کہا۔

نہیں جی یہ بات نہیں ہے۔ آدمی امریکہ کی سر زمین پر قدم رکھتے ہی امی گرنٹ نہیں رہتا۔ امریکن ہو جاتا ہے۔ اس کی آنول کٹ جاتی ہے اسی وقت ثار نے جواب دیا۔

ثار صاحب کے خیالات میں کہیں کوئی ٹیڑھ، ترچھا بن، کجی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ اقبال کے شوہر ہیں تو انہوں نے اس پیاری سی لڑکی کو کیسا ٹھٹھا دیا ہوگا۔ پاکستانی لوگوں کا ایک امیہ ہے۔ ثار صاحب، صرف ایک امیہ... میں نے کہا۔

بلال اور ارجمند ہم دونوں بڑھوں کی گفتگو سے تھوڑے تھوڑے اکھڑے گئے تھے۔ وہ اپنے انکل ثار کا حال چال پوچھنے آئے تھے اور اب باپ اور انکل سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ میں تو شاید انہیں نیچا دکھانے کے چکر میں تھا، لیکن ثار بھی طبعاً جھکی، جھمڑا، جنگ جو بڑھا تھا۔

وہ امیہ کیا ہے بیان کیجئے۔

”ساری دنیا کے باشندے پہلے وطن پرست ہوتے ہیں۔ بعد میں ان کی دوسری تعریفیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جرمنی کا باشندہ پہلے جرمن ہے پھر عیسائی ہے۔ اس کے بعد اس کی دوسری کوئی کوالیفیکیشن پیش کی جائے گی۔ امریکن اپنا تعارف پہلے امریکن کہہ کر کرتا ہے۔ اس کے بعد کوئی اور شناخت سامنے آتی ہے۔ مثلاً اٹالین، ڈسچ، جرمن کے اصلی اور یجن کا بعد میں پتہ چلتا ہے۔ وہ خدا پرست ہے کہ سیکولر خیالات کا مالک ہے۔ یہ بعد کی شناخت ہے ہندی پہلے اپنے آپ کو ہندوستانی ظاہر کرتا ہے، بعد میں آپکو پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کون سے

مذہب کا آدمی ہے۔ چینی، جاپانی ایرانی، عرب سب کی پہلی پہچان اور شان ان کا وطن ہے۔ ... ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم بھوک اور شیخی میں آکر سب سے پہلے اپنے آپ کو لبرل، انسان دوست ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دنیا میں یہ ظاہر کرنے کے درپے ہیں کہ ہم میں کوئی تعصب، گھٹیا پن اور کمینگی نہیں۔ ہم اس قدر اعلیٰ و ارفع ہیں کہ وطنیت ایک چھوٹی، گھٹیا اور معمولی شناخت ہے۔ ہم انسان دوست ایسی متعصب باتیں نہیں کیا کرتے۔ جرمن ہر قدم پر جرمن رہتا ہے، امریکن ہر لمحہ امریکہ ہوتا ہے، لیکن پاکستانی ہر وقت انسان دوست، لبرل اور بندیوں کا شاہین ہے، اسی لئے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی شناختیں پیش کرتا ہے وہ بھی لجاجت اور خفت کے ساتھ۔ زیادہ ضرورت پڑ جائے تو وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے گا۔ غریب شہر ہر اجنبی کو بتائے گا کہ وہ سندھی، بلوچی، سرحدی یا پنجابی ہے۔ وہ لوگ جو پاکستان کو بھی دنیا کے نقشے پر Place نہیں کر سکتے، وہ اس تعارف سے ایک دم پریشان ہو جاتے ہیں۔ وطن پرستی سے تو شناخت عامہ میں کچھ سہولت ہو سکتی تھی، لیکن اس تعارف سے جان بین میں دھند بڑھتی ہے۔ پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدلے کچھ پاکستانی اپنے آپ کو شامی، ترکی، ہسپانوی ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہم شیخی خوئے اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لئے جا بجا دوسروں کی معتبری کو اپنے شناختی کارڈ بنا لیتے ہیں۔ ثار سے مجھے بغض پیدا ہو چکا تھا۔ حالانکہ اس کی بنیادی وجہ کوئی نہ تھی“

ہم لوگ یہاں وطن کے ستائے ہوئے آئے ہیں۔ ہم کیا وطن پرست ہو کر دکھائیں گے؟ بات اتنی سی ہے ثار نو را بدل گیا۔

ہمیں وطن رحمت کے طور پر ملا، لیکن ہم اس کے شکر گزار نہ ہوئے۔ ہم لوگ دراصل نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا نہیں جانتے۔ ہم نقص بین لوگ ہیں۔ ہمیں من و سلوٹی راس نہیں آتا۔ ہر نعمت میں کوئی کمی دریافت کر کے ہم احسان اور شکر یے کے بوجھ سے ٹپٹنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم نے یہاں اپنے آپ کو پاکستانی اور مسلمان ظاہر کیا تو ہم اندر سے

دوہری مار کھائیں گے۔ ایک تو ہمیں ان دونوں شناختوں کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔ دوسری مصیبت پہلی سے بھی بڑی ہے۔ ہمیں پاکستان اور اسلام کی لاج نبھانے کے لئے ان شناختوں کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے بہتر کردار پیش کرنا ہوگا۔ اسی لئے ہم چھوٹی موٹی شناخت سے گزارہ چلاتے ہیں۔

نثار تنگ میں بولتا گیا۔

بات نثار بڑے پتے کی کہہ رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کا چہرہ گفتگو سب کچھ برا لگا۔

میں نے اپنی علمیت جتانے کے لئے اور نثار سے ون اپ ہونے کے انداز میں کہا۔ نثار صاحب ہم لوگ مغرب سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ ہمیں بھول چکا ہے کہ ہمارے پاس بھی کوئی علم ہے یا تھا، بالکل منفرد۔۔۔ اور جو کام اس علم کی حدود میں رہ کر یا اس کے ضابطے پر پورا نہیں اترتا، وہ بیکار ہے۔ ہم ترقی کی چکا چوند سے اس درجہ متاثر ہیں کہ اب ہمیں فلاح کے راستے پر چلتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہم اس خیال کو ترک کرنا چاہتے ہیں کہ فلاح کے بھی کچھ فائدے ہو سکتے ہیں اور فلاح کے ہمراہ بھی ترقی ممکن ہے۔۔۔ فلاح کا راستہ بالآخر انسان کو بد لئے اور انعام یافتہ لوگوں کے سیدھے راستے پر ڈالنے کا عمل ہے۔ اس راستے پر جو بھی تبدیلی آتی ہے، انسان کے لئے بہتر ہے۔ خیال ہی کی پیروی لگائی جاتی ہے اور جالی کا یہ کاڑھنا ایسے بیل بوٹوں سے مشابہ ہو جاتا ہے جن کا جمال حقیقی بیلوں سے بھی خوبصورت ہوا کرتا ہے، لیکن اب ہم خیال کو واہمہ سمجھتے ہیں اور فلاح کے خیال سے بھی بھاگتے ہیں۔

مغربی معاشرہ نے لوڈو کے کھیل میں اپنا چھکا ڈال کر ترقی کی گوئی چلا دی ہے۔ اس فیصلے کے پیچھے سائنس کی ایجادات ہی نہیں، بلکہ بھانت بھانت کیلوگوں کے ساتھ فاصلے قائم رکھتے ہوئے لپیٹا مدے کے لئے مفاہمت کے ساتھ رہنے کا نسخہ بھی ہے۔ نیگرو اور براؤن لوگوں کے ساتھ رگڑ کھائے بغیر اور ان کے مذاہب کے خلاف

تکوار نکالے بنا گزراں کرنے کے عمل نے مغربی معاشرے میں بڑی واضح تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ان لوگوں میں دوسرے Ethnic Groups کے ساتھ افہام و تفہیم پیدا کرنے کے سنے کچھ تبدیلی کی اشد ضرورت تھی۔ ان لوگوں نے جو اکثریت میں تھے اور ترقی کے خواہاں بھی تھے۔ اپنے فائدے کے لئے بھاری جنگلوں کو کاٹنے، ریل کی پٹریاں بچھانے، عمارتیں اسارنے، سڑکیں بچھانے، انڈسٹری کو چالنے کے لئے جن کالے براؤن لوگوں کو در آمد کر لیا۔ ان کے ساتھ سوشل جسٹس کی خاطر نہیں، بلکہ زیر و دام لانے کی پالیسی کے تحت بڑی فراخ دلی دکھائی۔ اپنے لوگوں کو Racist ہونے سے روکنے کے لئے ضروری تھا کہ مذہب سیوا بستگی کو Bulldozer سے ہموار کیا جائے۔ اب امریکن ہولے ہولے اپنے اعتقادات اور عیسائی Doctrine کے اصولوں کو نرم کرتے کرتے اور دوسرے مذاہب کے لئے گنجائش پیدا کرتے ہوئے اس قدر ترقی پسند ہو گیا ہے کہ اس کا ایمان ہی مذہب سے اٹھ گیا۔ دراصل لبرل انسان کے پاس ایمان جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ ہر راستے کا مسافر ہوتا ہے، جبکہ ایک راسخ خیال پر چنے والا اپنا راستہ چھوڑتا نہیں اور کسی راہ پر جاتا نہیں۔ وہ معاف کر سکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے اعتقادات کو غلط جانتے ہوئے بھی ان پر تنقید نہیں کرتا، لیکن وہ کسی قیمت پر اپنے خیال کو چھوڑنے پر رضا مند نہیں ہوتا۔ اپنے ایمان کی اتنی بھاری قیمت وہ ادا نہیں کر سکتا، یہی سارا بکھیرا ہے۔

نثار صاحب کا چہرہ لال بھبھوکا ہو چکا تھا۔ وہ قرولی لانے والا خوجی بن چکا تھا۔ اسی وقت اقبال آ گئیں۔

آؤ آؤ اقبال۔ بھئی کہاں رہ گئیں تھیں تم۔۔۔

کہیں نہیں نثار۔۔۔ ذرا گروہ ریز کرنے لگی تھی۔ ذرا مجھے ہلپ تو کرنا۔

کار میں سے سامان نکال لاؤ پلیز۔

کمال ہے، نہ سلام نہ دعا۔ اچھی بد تمیزی ہے ڈیزی۔

ارجمند اور بلال مجھے معاف کر دیں گے کوئی بات نہیں۔ یہ دونوں بڑے سویت ہیں۔

میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں آئی ... آئیے ...
ارجمند اور اقبال باہر چلی گئیں۔

میں نے سکھ کا سانس لیا۔ یہ اقبال وہ نہ تھی جس کو میں تلاش کر رہا تھا۔ یہ ایک موٹی آئی تھی جس کا جسم اس بات کا غماز تھا کہ وہ خوب کھانے پینے اور خوش رہنے کا فن جانتی ہے۔ ایک خیال کے بدلتے ہی خیالات کی سری قوس قزح بدل گئی۔ یکدم مجھے ٹار ایک بڑا ہی اچھا مہذب انسان نظر آنے لگا۔ نہ ہم میں کوئی نظریاتی اختلاف تھا۔ نہ ہی ہم دونوں جھکی بڑھے تھے۔ اس کے بعد گفتگو خود بخود درواں اور ملائم ہو گئی۔

واپسی پر ارجمند نے مجھے سوال کیا ... ”ابا جی آپ کو شروع میں کیا ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ انکل ٹار سے جھڑپ رہے تھے؟ وہ تو اتنے نائس آدمی ہیں۔ آپ انہیں Pinch کر رہے تھے بار بار ... بیچارے“
”وہ بیٹے ایک حجاب آگیا تھا ... ایک خیال کی وجہ سے۔ بڑھاپے میں انسان دوسرے کا شکار ہو جایا کرتا ہے۔ وجہ ہو نہ ہو جھڑپنا چاہتا ہے۔ خون گرم کرنے کا یہ ایک بہانہ ہے۔“

”کون سا حجاب، کونسا دوسرے؟“ بلال نے سوال کیا۔

”پلیز رام سے ڈرائیو کریں۔ کوئی ضرورت نہیں باتیں کر نیکی Hov والی سڑک لے لیں ...“

جمشید اور قیصر پچھلی سیٹ پر بحث کر رہے تھے۔ ایک بار پھر ارجمند نے بلال کو مشورہ دے کر اپنا آپ بہتر ثابت کرنے کی کوشش میں بلال کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی برتری ثابت کرنے میں جھڑپتے چلے گئے۔

میں سوچ رہا تھا اگر شارکی بیوی آپاواہی اقبال نکل آتی تو کیا پھر میں ایسا ٹھنڈا ٹھار بیٹھا ہوتا۔ کیا لانگ آئی لینڈ میرے اندر لانگ یادوں کو جنم دے دیتا۔۔۔؟ انسان بھی کیا احمق مخلوق ہے۔ حالات کو اپنے جذبات سے علیحدہ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ کسی رد عمل کو فروغ دینے سے پہلے کیا تفکر کی شرط ضروری ہے؟ کیا تفکر درست سمت کے لئے اہم ہے، ہو لے ہو لے اقبال کو نہ دیکھ سکنے پر میرے دل میں پہلے اطمینان ابھرا۔۔۔ پھر خوشی درستی اور آخر میں ایسی مایوسی چھائی جس کا کوئی نام نہ تھا۔۔۔

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

رات کافی چاچکی تھی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا۔ کوئی فون اٹھانے نہیں آرہا تھا۔

جی۔۔۔

دوسری جانب ایک لڑکی بولی۔۔۔ سنئے۔۔۔ آپ کو نیویارک میں اردو مرکز میں پہنچنا ہے۔ یہاں ایک مشاعرہ ہو رہا ہے۔۔۔ لڑکی نے مشاعرے کی ساری تفصیل تاریخ اور مقام مشاعرہ مجھ زبانی سمجھایا۔

اس توجہ کا شکریہ لیکن۔۔۔ میرا نام ہا یوں فرید ہے۔ کیا آپ کو ہا یوں فرید ہی درکار ہے؟

ہم آپ کو ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہیں دے سکتے، لیکن اگر آپ نیویارک اپنی کار پہنچ جائیں تو مہ آپ کو گیس کے پیسے دے دیں گے۔ دراصل یہ مشاعرہ آپ کے اعزاز میں ہی کیا جا رہا ہے۔

میرے اعزاز میں؟۔۔۔ لیکن میں تو اپنے ملک میں بھی مشہور نہیں۔

میں حیران رہ گیا۔ یہ کیسا اعجاز ہے کہ یہاں پہنچ کر مجھے اچانک شہرت مل گئی۔

بی بی پاکستان میں جب بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں تو مجھے مدعو نہیں کیا

جاتا۔۔۔

مجھے پتہ نہیں سر، لیکن مجھے صدیقی صاحب نے آرڈر دیا تھا۔ میں نے فون کر دیا۔

مڈل ایج آدمی سارے ہال میں نظر نہ آیا۔ مسٹر ریس نل مائیک تک پہنچا۔ اس دوران سارا ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ناظرین کا من چاہا ہے۔ بیٹھ کر اس نے نرت کے ساتھ مائیکروفون کو ٹسٹ کیا اور ریٹھی کھرج میں بولا۔

”اردو مرکز کی جانب سے یہ مشاعرہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ آج کی شام میں نثار احمد صدیقی آپ کا میزبان ہوں۔ صاحب صدر!، یوں فرید صاحب کی اجازت سے سب سے پہلے ہی اپنا کلام سنانے کی اجازت چاہتا ہوں۔۔۔ اجازت ہے۔“

ابھی جب وہ تعارف کرانے کے مرحلے میں تھا ہال کے بائیں دروازے سے ایک خواب برآمد ہوا۔ اقبال ہلکے گرے لباس میں چلی آرہی تھی۔ سامنے کی ساری قطار بھر چکی تھی۔ وہ سیدھی آئی اور Reserve اکلوتی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے اس نے کون سی خوشبو لگا رکھی ہوگی، لیکن مجھے لگا سارے میں ایوننگ انپرس کی مہک پھیل گئی۔

جس وقت نثار غزل کا چوتھا شعر پڑھنے کے عمل میں تھا۔ میں نے اسے بے تحاشہ داد دی۔ اقبال نے پہلی مرتبہ میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں ویسی ہی تھیں۔ اوپر والے ہونٹ پر تل بھی وہی تھا، لیکن رنگت اب میدہ و شہاب نہ تھی۔ باسی چنبیلی کے پھولوں کی طرح چہرہ سانولے پن کی طرف مائل تھا۔ بالوں کا رنگ کالا اور سفید مل کر سلیٹی سا نظر آتا تھا اور اس نے گرے لباس ان ہی بالوں کی مناسبت سے پہن رکھا تھا، لیکن وہ بوڑھی نہیں تھی۔ وہ پہلے سے بھی جاذب نظر تھی۔

انٹروال کے دوران ہم سب Refreshments کے لئے چلے گئے۔ اقبال ایک گول میز منتخب کر کے بیٹھ گئی۔۔۔ ارجمند اور بلال کچھ فاصلے پر بیٹھے کھانے پینے اور بحث کرنے میں مشغول تھے۔۔۔ بچے نہ جانے کہاں بیٹھے؟ میں کھسکتا ہوا اقبال کے پاس جا بیٹھا۔ ہم دونوں کو بات شروع کرنے میں چند لمحے وقت کا سامنا ہوا۔

السلام علیکم وہ میری طرف دیکھے بغیر یوں۔

وعلیکم السلام ... میں نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ جہانگیر ارجمند یہیں امریکہ میں

ہیں۔ میں نے تعارف کے طور پر لایعنی سی بات کی۔

آپ کیسی ہیں؟ اس نے پوچھا۔

ٹھیک ہیں۔ آپ کے بچے؟

اس نے لمبی آہ بھری ... وہ ... اللہ نے ایک بیٹی دی تھی، لیکن وہ نارمل نہیں ہے

... اسی کے علاج کے سلسلے میں ہم یہاں امریکہ آئے بیٹھے ہیں ... یہاں آکر اسے

بڑا فرق پڑ گیا ہے ... اب کچھ کچھ ذمہ دار بھی ہو رہی ہے ... پہلے تو ...

اس نے ایک گرے رنگ کا ٹیشو آستین سے نکال کر منسو پونچھے۔

”پتہ نہیں کیوں آپ کو دیکھ کر رونا آگیا ہمایوں صاحب ... ورنہ سب تو ... مونا

کی باتوں پر بھی رونا نہیں آتا ...“

مجھے اگا اندر ہی اندر کوئی میری عمارت منہدم کرنے میں مشغول تھا اور اس کے گرنے

کی آواز اقبال تک پہنچ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد گریس فل ٹار احمد صدیقی میزوں میں

راستہ بناتا ہماری طرف آیا۔ اس کے سارے بال قریباً سفید تھے، لیکن چہرہ بچوں کی

طرح معصوم اور کھلا کھلا تھا۔ صرف آنکھوں میں عمر نے شگستگی کا گرے رنگ بھر دیا تھا۔

چال میں ٹینس کے کھلاڑی کا چکیل پن تھا۔ وہ قریب آیا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

بیٹھے بیٹھے۔ السلام علیکم۔

ہم دونوں نے اکٹھے کہا۔

یہ ہمایوں صاحب ہیں۔ آپ کے بھائی۔

ٹار ایکٹروں کی طرح حسین، ڈزائیز کپڑے پہنے والے ماڈل کی طرح خوش پوش

ریڈیائی آواز میں بولا ... ”السلام علیکم ... اقبال آپ کی بہت باتیں کرتی ہے دراصل

ان کی Infatuation ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہ اسی عہد میں رہتی ہیں۔

ہم خوش دلی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے، لیکن میں نثار سے مات کھا گیا۔ اس میں کچھ ایسا تھا کہ میں اس سے بغض بھی پال نہ سکا۔ وہ جتنا باہر خوبصورت تھا، اس سے کہیں زیادہ اندر حسین تھا۔ میری طبیعت اس وقت پھر خباثت کی طرف مائل ہو گئی اور میں نے اس میں ایسی باتوں کی تلاش جاری کر دی جو میری نفرت کی بنیاد بن سکتیں۔

امریکہ میں مشاعرے کی روایت کو بڑی خوبی سے نیا جنم دیا گیا ہے۔ ... ادھر پاکستان سے ہر شاعر کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ مشاعرہ پڑھنے امریکہ پہنچ جائے۔ یہ آپ کے مشاعرے اchiائے اردو کے لئے بڑی خدمت کا کام دے رہے ہیں۔ میں نے بات کرنے کی خاطر کہا۔

”انسان جب وطن سے پھٹتا ہے تو کئی چیزیں اس کے ساتھ ایسی آ جاتی ہیں جن کا بادی النظر میں اسے احساس بھی نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں تو یہ رنگوں نے مجھے کمپیئر بنایا، پھر خود بخود شعر مجھ میں ایلنے لگے۔ ... ایک بات کا کریڈٹ میں اقبال کو بھی دیتا ہوں۔ اس نے شاعری سے محبت کر کے مجھے شاعر بنادیا۔ ... اسی نے آج آپ کو صاحب صدر بھی چنا ہے۔“ نثار بولا۔

”آپ نے ٹھیک کہا۔ مشاعروں نے امریکہ میں اردو کو نیا جنم دیا ہے۔ مجھ جیسے لوگ تن من دھن سے اس کی خدمت کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں ہمارا قومی مشن ہے۔“ میں کچھ ہارسی محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نے اپنی شہنی میں اسے نیچا دکھانے کا رخ پیدا کیا۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ نے ان مشاعروں کے حفیل اپنی طبیعت موزوں کر لی، لیکن پیدا اشی شاعر کو یہ مجاہدہ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے اندر ہمیشہ سے یہ جو ہر موجود ہوتا ہے ...

بالکل بالکل مجھے اقبال نے بتایا تھا کہ آپ پیدا اشی شاعر ہیں۔ آپ نے بھلے اس کی طرف توجہ نہ دی، لیکن آپ سے تو مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ...

مجھے پھر ہلکا سا احساس شکست ہوا۔

اقبال نے میری جانب دیکھا۔ اس کی نظر میں گئے دنوں کا سراغ موجود تھا۔

پتہ نہیں کیا بات ہے ہمایوں صاحب ... جب میں سرکاری افسر تھا تب مجھے لگتا تھا ہے کہ میں اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔ پھر امریکہ آگئے۔ مجبوری تھی۔ یہاں میں نے کئی سال بینک کی نوکری کی۔ مجھے لگا کہ میں ہمیشہ ٹینکر رہا ہوں۔ اب سب کاموں سے فارغ ہو کر لگتا ہے کہ میرے اندر تو ازل سے ایک شاعر رہتا تھا اور وہی ایک حقیقت تھی۔ باقی سب بھوٹ تھا ... میں شاعر کے علاوہ اور کچھ کبھی تھا ہی نہیں ...

میں نے کافی کا کھونٹ نگلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو یہ اصلی نثار تھا۔ اصلی اور وڈا نثار۔ وہ نثار جس کے مرنے کی خبر میں نے پڑھی تھی اور خوش ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کون تھا؟ اور لانگ آئی لینڈ والا نثار؟ اور واشنگٹن ڈی سی کا چھلاوہ؟ وہ سب! یہ خوش لباس، خوش اطوار گریک مجسمہ جسے میں آنکھ بھر کر نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ تو اقبال کی اچھی زری ہوگی ... خوش رہی ہوگی ہمیشہ۔ میں نے تاسف سے سوچا۔

ایک نوجوان نے آکر نثار کے کان میں کچھ کہا تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ معاف کیجئے دو تین شاعروں میں لڑائی ہوگئی ہے، مجھے ایکسوز کیجئے۔

چند قدم چلنے کے بعد وہ لوٹا اور شرارت سے مسکرا کر بولا ... ہمایوں صاحب یہ تو بتائیے یہ جتنے شاعر لوگ پاکستان سے آتے ہیں، اتنے جھگڑا لویوں ہوتے ہیں۔ ہم تو ان کے نخرے برداشت کرتے کرتے نڈھال ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کمرہ پسند نہیں آتا۔ کوئی کھانے کا رونا روتا ہے، کسی کو کافی سیر میسر نہیں آتی۔ کوئی سمجھتا ہے ہم نے انہیں داد سے محروم رکھا ... عجب مشکل ہے یہ کہہ کر وہ جلدی سے چلا گیا۔

اس دیوتا روپی کے سامنے میں احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ عجیب قسم کی محرومی اور غصہ میرے اندر ابلنے لگا۔

آپا کیسی ہے؟ اقبال نے کچھ دیر سے کہا۔ اسے اس سے بہتر تعارفی جملہ سوچھ نہ رہا

تھا۔

ٹھیک ہے۔

خاموشی کا لمبہ وقفہ

آپ اپنے متعلق بھی تو کچھ بتائیں ناں۔ اقبال نے سوال کیا۔ مردوں جیسا نام رکھنے والی میں بڑی نسوانیت تھی۔

پتہ نہیں یہ برسوں سے دہی ہوئی باتیں تھیں یا ایک طرح کا غصہ تھا جو اچانک لاؤن بن کر پھٹ پڑا۔

میں نے کہا۔۔۔ جب تم سے آخری بار مل کر آیا۔۔۔ تو دل میں ایک ہی خواہش گڑ گئی اقبال۔ مجھے ہر لمحے یہ خیال رہنے لگا کہ اگر میں کسی طرح امیر کبیر ہو جاؤں۔۔۔ تو پھر تمہارے ابا جی مجھ پر مہربانی کر سکتے ہیں۔ اس خیال کی آگ نے مجھے راکٹ بنا دیا۔ پہلے میں نے مال پر دکان کھولی پھر ڈیفنس میں کوٹھی بنائی۔ تم کسی نثار صاحب سے بیاہ کر اسلام آباد چلی گئیں، لیکن امیر ہونے کے خواب نے مجھے نہ چھوڑا۔۔۔ میں بلاوجہ امیر کبیر ہوتا بھی چلا گیا، لیکن امیر ہونے کے خواب نے مجھے نہ چھوڑا۔۔۔ میں بلاوجہ امیر کبیر ہوتا بھی چلا گیا، لیکن شاعر نہ رہ سکا۔ شاہد بھائی شاعر بن گئے، لیکن میں نے خیالوں کا، احساسات کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ میں صرف دولت اور اسی سے وابستہ ترقی کا گاہک تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی دن کوئی دیکھے اور افسوس کرے کہ اس نے میرے وجود میں کیا کھود دیا ہے۔

اور آپ کے بچے۔۔۔ بیوی۔۔۔ بھاری پونٹوں والی نے پوچھا۔

دونے ہیں، ایک بیٹا جہانگیر اور ایک بیٹی ارجمند۔ بتایا ناں بیٹی وہ سامنے بیٹھی ہے اور جہانگیر بھی یہیں ہے امریکہ میں۔

اور آپ کی بیوی؟ آپ کے حالات۔

عجیب سی بات ہے۔ شاید سبھی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے، لیکن میں نے اپنے ساتھ یہی

ہوتے دیکھا۔ دولت کے ساتھ مصروفیات بڑھ گئیں اور جب مصروفیات اشیاء سے وابستہ ہو جائیں ترقی منزل ہو تو پھر ... نہ روح کا مسئلہ رہتا ہے نہ محبت کا ... دولت کے دریا کا بہاؤ بہت تیز ہوتا ہے۔ اقبال! انسان اپنی مرضی سے پتوار چھوڑ نہیں سکتا ... بس ترقی ہی کرتا چلا جاتا ہے۔

آپ کو ... اپنی بیوی ...

وہ شاید پوچھنا چاہتی تھی کہ مجھے اپنی بیوی سے کتنا پیار تھا؟ عورتوں کو اس سوال میں بڑی دلچسپی ہوا کرتی ہے۔

بڑی اچھی تھی بیچاری۔ انتظار کا کشت کاٹتی کاٹتی چل بسی ... یہ عورت بھی بڑی بے بس ہے۔ کوئی اس پر انتظار ٹھونستا نہیں، لیکن اس کی روح میں انتظار ہے ... شاید وہ اس لئے راہ نکلتی ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس جنت میں لے جائے۔

وہ یکدم کرسی کی پشت سے سر لگا کر بیٹھ گئی۔ ایک چھوٹا سا آنسو اس کی بائیں آنکھ سے نکل کر گال پر آٹپکا۔

دیکھئے ہمایوں مونا کی ذہنی معذوری نے مجھے نڈھال کر دیا ہے ... میں اب اور کچھ برداشت نہیں کر سکتی ... میں ریزہ ریزہ ہو کر بے معنی ہو چکی ہوں۔

آپ کو تو وہ سب کچھ ملا جس کی کوئی عورت آرزو کر سکتی ہے۔

جی ملا ... یقیناً میں کسی قسم کا گلا نہیں کر سکتی لیکن پتہ نہیں اتنا سب کچھ بھی کیوں کافی نہ ہو سکا۔

نثار بہت امیر ہیں۔

بہت اور پھر بخیل نہیں۔ شاہ خرچ بھی ہیں۔ وہ آہستہ سے بولی۔

ایسا خوبصورت آدمی میری نظر سے نہیں گزرا ... میں نے شرم ساری سیکھا۔ گویا اس کی خوبصورتی میں میرا کوئی ہاتھ تھا یا میرا کوئی نقص نہ تھا۔

ہاں ... یہ بھی حقیقت ہے ... امریکن بھی انکے حسن کی تعریف کرتے ہیں۔

پھر آپ کو شاعری کا شوق تھا وہ بھی پورا ہو گیا۔ نثار کے اشعار سن کر لگتا ہے کہ فیض اور منیر دونوں کا رنگ اکٹھا ہو گیا ہے۔ میں نے حسد میں ڈوبی ہوئی تعریف کی۔

ہاں جی یہ بھی درست ہے لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے ہر آرزو پوری ہو چکنے کے بعد بھی دل کچھ اور مانگتا ہے.....

میں اللہ جانے کیوں آرزو کا لفظ اس کے منہ سن کر بے تاب ہو گیا۔

اور؟ اور کیا؟

آپ یہاں امریکہ ہی میں رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں ہمایوں صاحب۔

ارجمند کام کرتی ہے۔ اس کے بچوں کو میری ضرورت ہے جب وہ سکولوں سے واپس آتے ہیں تو گھر پر نہ بلال ہوتا ہے نہ ارجمند۔

اگر میں آپ سے ہوں کہ پاکستان لوٹ جائیے تو؟

لیکن کیوں اقبال! میرا تو وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اب تو اصغری بھی لوٹ گئی اپنے

خالق کے پاس

پھر بھی لوٹ جائیے۔

کیوں لیکن کیوں لوٹ جاؤں وہاں وطن میں اب کچھ باقی نہیں رہا۔ کچھ

آگے چلے گئے ہیں۔ کچھ بوریا بستر باندھے پلیٹ فارم پر تیار بیٹھے ہیں۔ فیملی سسٹم

ٹوٹ رہا ہے۔ اب وہاں وہی خاندان اکٹھے ہیں جو بھیڑیوں کی قبیل سے ہیں۔ فرد کو

جب مصیبت پڑتی ہے، وہ اپنے بھیڑیوں کے غول کو اکٹھا کر کے حملہ آور ہو جاتا ہے۔

ویسے کسی کے پاس دوسروں کے لئے وقت نہیں ہوتا تم مجھے واپس کیوں بھیجنا

چاہتی ہو کس کے پاس؟ کون ہے وہاں میرا؟ میں کیا کروں گا وطن جا کر؟۔

میں میں اب کسی امید کو اپنے اندر جنم دے کر جھسم نہیں ہونا چاہتی۔ اتنی مدت

میں نے ہر صبح مونا کے سنے امید کا دیا جلایا اور رات کو اسے بچھ کر سوئی۔ میں موت

سے پہلے مر چکی ہوں ہمایوں۔ اب جو بھی مجھے پھونک مار کر زندہ کرے گا۔۔۔ میرا دشمن ہوگا۔۔۔ میں سیلینگ بیوٹی نہیں ہوں۔ مجھے کوئی پرنس چارمنگ درکار نہیں۔
کیا ثار؟ ثار تمہیں زندگی کی طرف نہیں کھینچتے۔

جس شخص میں اتنی ساری خوبیاں ہوں جو سارا وقت اپنی پرستش میں لگا ہو۔۔۔ لوگ اس کی پوجا کرتے ہوں، اس کے پاس دوسروں کے نئے وقت کہاں؟ کامیاب انسان دوسروں کو بھی کامیاب ہی سمجھتا ہے۔ وہ ناکامی کو سمجھ نہیں سکتا۔ مایوسی کی زبان نہیں جانتا۔ میرا جھڑا ثار سے نہیں ہے۔ میں تو روز ازل سے بی بی حوا کی طرح آدم کی روح کی تلاشی ہوں۔۔۔ میرا تو حساب کتاب ہی الٹا ہے۔ میں تو وہی چیز مانگ رہی ہوں جو اللہ کی اپنی امانت ہے۔ پھر۔۔۔ ایسی صورت میں مجھے زندگی سے کیا مل سکتا ہے۔۔۔۔۔ نہ ثار سے نہ کسی اور سے۔

کیا ثار تم سے محبت نہیں کرتے؟

کرتے ہیں۔ کرتے ہیں۔ بہت کرتے ہیں لیکن۔۔۔

لیکن کیا اقبال۔۔۔ بتاؤ ناں لیکن کیا۔۔۔

میرے اندر ایک صحرا ہے ہمایوں مجھے محبت نہیں چاہئے۔ شاید میں کسی کا خدا بننا چاہتی ہوں۔ ایب نارمل مونا کے ساتھ رہ کر میں نارمل نہیں رہی۔۔۔ اللہ کے لئے چلے جاؤ۔ اگر تم نے امریکہ نہ چھوڑا تو میں کسی اور جگہ چلی جاؤں گی اور میرا یہاں ٹھہرنا مونا کی صحت کے لئے ضروری ہے، بہت ضروری۔ وہ کچھ کچھ نارمل ہو رہی ہے ہمایوں جی۔

ایک بار وجہ بتا دو صاف صاف الفاظ میں۔۔۔ میں جاننا چاہتا ہوں آپ کی خاطر۔
”میں آپ کو بتاؤں۔۔۔ یہاں آنے سے پہلے مونا کی ذہنی حالت کو دیکھ کر میں تلملایا کرتی تھی۔ میں نے مونا کے بڑے علاج کئے۔ ایلو پیتھک، ہائیو کیمیک، حکیمی علاج، ہومیو پیتھک۔ میں۔۔۔ مونا کو۔۔۔ اپنی Retarded پن کی کو لے کر میں کہاں

کہاں نہ گئی۔ پھر جب میں علاج سے مایوس ہونے لگی تو میں نے تعویذ، گنڈے، صدقات، بونٹیفے، پیر فقیر پکڑ لئے۔ درگاہوں پر حاضریاں دینے لگ۔ میں معجزے کے انتظار میں رہتی اور وہ ہونہ چکتا۔ میں پاؤں جلی ایک روز ایک درگاہ پر جاتی، دوسرے دن کسی اور ڈیرے پر۔۔۔ میرے آنسو نہ رکتے تھے۔۔۔ ایک بابا جی نے میری بے قراری دیکھ کر کہا۔“

بیٹا اب تلاش بند کر دے۔ علاج سے منہ موڑ لے۔ راضی برضا ہو جا۔۔۔ میں نے چیخ کر کہا۔ کیوں؟ کیوں بابا جی میں تو آخری سانس تک مونا کے لئے جدوجہد کروں گی۔ میں جو کہتا ہوں تجویز چھوڑ دے بی بی۔۔۔ آپ صحت ہو جائے گی اور اگر صحت نہ ہوئی تو قرار آ جائے گا۔ بس تجویز چھوڑ دے۔۔۔ بابا جی بولے۔

میں چلاتی رہی۔۔۔ کیوں تجویز نہ کروں، کیوں کیوں کیوں؟ ماننے کے لئے جتنا ضروری نہیں بیٹا۔۔۔ پہلے مان لو۔۔۔ پھر اللہ نے چاہا تو جان بھی جاؤ گی۔ بابا جی بولے۔

اقبال چپ ہو گئی۔

یہ چپ کا وقفہ ہم دونوں پر بھاری تھا۔

آپ پلیز جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں۔۔۔ میں اب کسی امید کے حوالے نہیں ہونا چاہتی۔ پلیز مان جائیے، مان جائیے پلیز۔

میں خاموشی سے اٹھ گیا۔ اقبال نے آہستہ سے اللہ حافظ کیا۔ میں ارجمند تک پہنچا اور اسے بتایا کہ میں باہر کار میں اس کا انتظار کروں گا۔ نثار صاحب سے معافی مانگ لیا۔

آپ کی طبیعت خراب ہے تو واپس چلتے ہیں انکل بدال نے کہا۔ وہ طبعاً بھی ڈاکٹر ہے کسی کو علیل دیکھ کر تلملا اٹھتا ہے۔

نہیں ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔۔۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔

مان لینے کے لئے بعد مجھے تھوڑی دیر تنہائی کی ضرورت تھی۔

ابا پرانے زمانے کا باپ تھا۔ وہ ٹمپل روڈ پر گھر والوں سے کٹ کر گھر کے برآمدے میں چارپائی ڈالے اپنی ریٹائرمنٹ کے دن گزارا کرتا۔ کبھی کبھ راس کے دفتر والے آجاتے تو کچھ دیر کے لئے برآمدے میں رونق ہو جاتی۔ ورنہ وہ اپنے خالی دن اور راتیں ان پرندوں کو دیکھنے میں بسر کرتا جو دیواروں پر آکر بیٹھتے اور اڑ جاتے۔ ابا ساری عمر نوکری کی چکی میں پستا رہا۔ اسے دوست بنانے کا وقت نہ ملا۔ رشتہ داریاں نبھانے کی نوبت نہ آئی۔ قیام پاکستان کے بعد اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ نئے لوگوں سے رابطے بنا کر نباہ سکتا۔ بس دوسروں کے ساتھ رٹ رکھنے کے بجائے اس نے اپنے آپ کو ساحل بنالیا۔ ہم پانی کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ضرورت تھے، لیکن ہم ساحل کی مجبوریوں سے ناواقف تھے۔

اس روز میں گھر میں داخل ہوا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ مجھے ابا نظر نہ آیا۔ میں اس روز طیش میں تھا۔ برآمدے میں گھستے ہی میں نے ستون کو مکا مارا تو ابا نے کھنگار کر اپنے وجود کی اطلاع دی۔

سنو ہالیوں۔

سنانے کے لئے ابا نے آج تک کبھی نہیں بلایا تھا۔ کان کھینچنے والے کام اماں کے سپرد تھے۔ وہ ہمیں ابا سے ایسے بچایا کرتی جیسے مرغی چوزے کو پیل کے جھپٹے سے بچاتی ہے۔

بیٹھ جاؤ۔

یہ میرے لئے نئی بات تھی۔ میں چپ چاپ پابندی کی جانب بیٹھ گیا۔

میں جانتا ہوں شاید اور تمہارے لئے یہ مشکل وقت ہے..... لیکن۔

وہ کچھ دیر چپ رہا، جیسے اپنے اندر بات کرنے کے لئے صحیح الفاظ اکھڑ رہا ہو۔

ایک راستہ وہ ہوتا ہے جو باپ بیٹے کے لئے چھتا ہے۔ ایک خواب وہ ہے جو بیٹا

اب باہر بھی صورت پذیر ہوگئی۔۔۔ اب شیطان کے لئے حضرت آدم کو اللہ سے مایوس کرنا آسان ہو گیا۔ انہوں نے حضرت آدم میں تخلیق کی خواہش جگائی، نفس کی چنگاری جلائی۔ اماں حوا کی دوئی سے مدد لے کر حضرت آدم کو شجر ممنوعہ سے کھانے پر مجبور کیا۔ حضرت آدم ماننے والوں سے نہ رہے۔ وہ بھی اسی نافرمانی کے مرتکب ہوئے جو ابلیس کر بیٹھا تھا۔ اب باری تعالیٰ نے حضرت آدم اور مائی حوا سے کہا۔ جاؤ نیچے اتر جاؤ۔ آج سے تم صاحب اختیار ہو۔ پہلے تم ماننے والے تھے۔ تمہارے لئے ایک ہی راستہ تھا۔ اب تمہارے اندر دو ہیں، باہر دو ہیں۔ تم زوج اور متضاد کا شکار ہوئے۔ اب تمہارے اندر ایک راستہ رب کی اطاعت ہے ہے دوسری راہ ابلیس کی ہے۔ وہ تم میں ایسی خواہشات جگائے گا جن کا پورا کرنا یا ہونا ناممکن ہوگا۔۔۔ تم انتظار کی صعوبت برداشت نہ کر سکو گے۔ صبر کی ڈھال لے کر نہ چل سکو گے۔۔۔ ایسے میں تم مجھ سے مایوس ہو جاؤ گے۔۔۔ پھر ابلیس تم کو اپنے گروہ میں شامل کرے گا۔۔۔ آج کے بعد تم صاحب اختیار ہو۔ تمہارے اندر دونوں راستے ہوں گے۔ جو لوگ اللہ کے ماننے والے ہوتے ہوئے نبی کے آگے جھکنے اور اسکی حدود کو پار نہ کرنے والے ہوں گے۔ وہ ابلیس کے اغواء سے محفوظ رہیں گے اور جو بار بار اپنے نفس کے آگے جھکے، اپنی خواہشات کی رسی سے بندھے، وہ ابلیس کے یاروں میں سے ہوں گے۔۔۔ تم آج کے بعد ابلیس کی طرح صاحب اختیار ہو۔ یا اللہ کا راستہ چن لو یا ابلیس کا تمہیں اختیار ہے۔۔۔

جی۔۔۔

مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔۔۔ یاد رکھنا صاحب اختیار کی ذمہ داری بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے فیصلے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

میں چپ چاپ اٹھ کر اندر گیا تو اماں نے مجھے بلا کر کہا۔۔۔ میں تیری منگنی اصغری سے کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ تیرا کیا خیال ہے۔

میں چپ رہا۔

تو نے اسے دیکھا ہے ناں.....

ایک نوکرانی صفت مسکین سی چھوٹا مندر میں نے کبھی کبھی گھر میں رہتی دیکھی تھی۔

آپا سعیدہ کی نواسی ہے۔ بڑے سکھ دینے والی ہے۔

جی ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں... میں ماننے والوں سے ہوں۔

اماں بھی ٹھیک تھیں۔ اصفیر نے مجھے بڑے سکھ دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے وہ

خوشی نہ دے سکی، جس کی میں خواہش رکھتا تھا۔ میں نے اقبال کی مان لی۔ یہ فیصلہ بھی

سکھ دینے والا تھا۔ ایک بار پھر مان کر میں شانتی بھون میں داخل ہو گیا۔

پاکستان واپسی کا پلان اچانک بنا۔ ارجمند اس تجویز پر بہت جربز ہوئی۔ اس

کا خیال تھا کہ میں انتہائی خود غرض والد ہوں۔ اس نے اگلے پچھلے ان گنت واقعات

اپنی لاگ بک میں میرے خلاف درج کر رکھے تھے۔ میں اس دعویٰ زاید المعیاد کو

خاموشی سے سنتا رہا۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ میں کتنا خود غرض، عیار، بد معاش، کیڑہ ور

بڑھا ہوں جو ساری عمر اپنی اولاد کے کام نہ آسکا۔ بلال اسے چپ کرانے کے انداز

میں چھوٹے چھوٹے تنبیہی جملے چھوڑتا رہا، لیکن ان امدادی حربوں کا ارجمند پر کوئی اثر

نہ ہوا۔ وہ باپ و دادا کے رول کو اپنے طور پر زندگی وقف الاولاد سمجھتی تھی۔ بچوں کے

بچے ہو جانے کے بعد ہر ناما، نانی، دادا، دادی کا منہ ہی فرض تھا کہ وہ بچوں کی اولاد

پالیں اور بچوں کو فراغت، آرام، تفریح اور آزادی کا تحفہ بہم پہنچائیں۔ وہ بار بار چچتی

رہی۔

سنا تھا کہ اصل سے سو دپا رہا ہوتا ہے، لیکن ابا کے سینے میں دل ہوتا ناں۔ ان کو تو

جمشید اور قیصر سے بھی پیار نہیں۔ پھر یہ کیسے ہمارے پاس رہ سکتے تھے۔

میں بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے عادی مجرم کی

طرح سر جھکا دیا۔

اپنا سامان پیک کرنے کے بعد آخری بار میں ہیلکونی میں جا بیٹھا۔ بلال اور ارجمند ابھی کاموں سے نہ لوٹے تھے۔ سامنے ہیلکونی پر گریک بڈھا سگریٹ پی رہا تھا۔ نچلے گھر میں ہندو عورت جینز اور بغیر آستیوں کی بنیان پہنے بچوں کے چھوٹے سے پلاسٹک سوئمنگ پول میں ٹیوب سے پانی بھر رہی تھی۔

سڑک صاف نہائی دھوئی لیٹی تھی۔ کوڑا اٹھانے والے گھروں کے آگے سے سارا گارج اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ دور گزے بو میں ایک بوڑھا امریکن پائپ لگائے نیچے نشیب کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جیسے کچھ سمجھنے سوچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عام طور پر جمشید اور قیصر اپنے روکرو پر ہم رنگ پیلی، سفید، نیلی اور لال چوکوروں کا مریع بنایا کرتے ہیں۔ امریکن بھی اپنے زندگی کے روکرو ترتیب میں لا رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ ترقی کرنے والے یہ لوگ ہمیشہ پہلے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر مانتے ہیں۔ جو باتیں ان کی سمجھ میں آنہیں پاتیں، وہ انہیں شیلف کر دیتے ہیں اور وہ ریگستانی لوگ، پہاڑوں کی گچھاؤں میں سا دھی لگانے والے..... وہ لوگ جنہیں فلاح درکار ہوتی ہے اور جو ترقی کے بجائے فلاح کا انتخاب کرتے ہیں وہ پہلے سر جھکا کر مضبوطی سے ایمان کی ڈوری تھام لیتے ہیں۔ پھر بیکار تحس سے ان کی وابستگی نہیں رہتی۔ راستہ طے کرنا ہی ان کی منزل بن جاتی ہے..... خوف و حزن ان کا ساتھی نہیں رہتا۔ وہ تبدیلی سے پہلے اپنے خیال میں تبدیلی سے خوفزدہ نہیں ہوتے..... بس صبر ہی ان کی ڈھال اور انتظار ہی ان کا واحد وسیلہ بن جاتا ہے۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

پھر لا حول پڑھی..... یہ گھڑی بھی کیا ایجاد تھی۔ ہمیشہ اس کی سوئیاں بھاگتی ہی رہتی تھیں۔ اس کا کام دوسروں کو بھی بھگانا ٹھہرا۔ اگر غلطی سے کبھی سوئیاں رک جاتیں تو چابی دی جاتی، بیٹری بدل جاتی۔ میں ہیلکونی سے سامان اٹھا کر باہر نکل آیا۔ اپنے دونوں بیگ میں نے پورچ کے سامنے رکھ دیئے۔ یہاں سے دور تک سڑک نظر آئی

تھی۔

بیگ رکھنے کے بعد میں ایک بار پھر اندر گیا..... کلائی سیگھڑی اتار کر میں نے ٹیلی ویژن پر رکھ دی۔ اتفاق سے یہاں ایک ڈی وی ڈی کا ویڈیو ٹیپ اور بچوں کا روبکس پڑا تھا۔ انسانی تخلیقات کا تعاقب کرنا میری عمر کے بس میں نہ تھا۔ اقبال نے مجھے ترقی کی دوڑ سے نکال کر ایک اور راستے پر ڈال دیا تھا۔ میں نے سوچا اگر صبر کے ساتھ ہی حکم ماننے کی شرط ہے تو پھر تو یہ گھڑی بالکل بیکار ہے۔ موت کے انتظار کے لئے موت کی جانکاری اس کے متعلق سارے استفسار بیکار ہیں۔ بھلا میرے بغیر انسان موت کی حقیقت کو جان بھی کیسے سکتا ہے..... گھڑی کو کلائی سے اتارنے کے بعد بعد میں جیسے رہا تیدی کی طرح باہر نکلا..... اور خالی سڑک پر دو رتک نظریں جمادیں۔

خیال آ رہا کہ انتظار فلاح کے راستے کا بڑا قیمتی ٹکٹ ہے۔ جو لوگ صحراؤں کا سفر کرتے ہیں، لیکن مان کر سر جھکا کر چلتے ہیں..... موت کی راہ تکتے ہیں، لیکن امید کے ساتھ..... جنہیں مسیح موعود کا انتظار ہوتا ہے، لیکن انتظار سے زیادہ وہ کچھ نہیں سوچتے..... جو موسموں کو بدلتے دیکھ کر اپنی پسند کی رت کے منتظر نہیں ہوتے۔ وہ جن کو علم ہوتا ہے کہ ان کا ہیرا من طوطا نہیں کبھی مل نہیں سکتا اور پھر بھی وہ آہٹ سن کر دروازے کی جانب دیکھتے ہیں اور شانت رہتے ہیں..... وہ منتظر کرم جو حکم ملنے کے بعد مانتے ہی چلے جاتے ہیں، نہ تشریحوں میں پڑتے ہیں نہ تاویلوں میں۔ جنہیں نہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ حکم ماننے کے لئے کسی قسم کا لالچ درکار ہوتا ہے۔ نہ جنت کی خواہش، نہ دوزخ کا عذاب..... ایسے راضی برضا ہمیشہ اندر باہر ثابت قدم رہتے ہیں۔ نہ انہیں پلٹ کر دیکھنے کی خواہش ستاتی ہے، نہ کہیں لمبے راستے پر منزل نہ پانے کی آرزو غمزہ کرتی ہے۔ ایسے لوگ..... فلاح کے راستے پر کتنی آسانی سے چلا کرتے ہیں۔ انتظار بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ نہ سخت دل بناتا ہے، نہ مایوس کر سکتا ہے فلاح کے بڑے پھانک کی چابی یہی مان لینا ہے۔

میں نے گھڑی ضرور اتار دی تھی، لیکن میں ابھی ماننے والوں میں پوری طرح شامل نہ تھا۔ میرے دل میں ان گنت ایسے سوال تھے جو اقبال سے جواب کے خواہش مند تھے..... مجھے اچانک امریکہ چھوڑتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔ وہاں پاکستان میں میرا کون تھا؟ وہاں تو میں اس خوشی سے بھی محروم ہو جاؤں گا جو جمشید اور قیصر مجھے دیا کرتے تھے..... مجھے تو اس ہیلکوپٹر کو چھوڑنے کا بھی دکھ تھا جہاں بیٹھ کر میں دائرے کا سفر کیا کرتا تھا۔ ماضی کی گلیوں میں گھومتا تھا۔ ادھر رے مسائل کو بار بار سلجھانے میں مصروف رہتا۔ بوڑھے آدمی کو اپنی ساری اہمیت خیال ہی سے تو ملتی ہے۔

مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں امریکہ پہلے روز اپنی ٹرولی میں دو بیگ دھرے آیا تھا۔ مجھے اتنے بڑے ایئر پورٹ پر درست Exit کی تلاش تھی۔ پھر لمبے برآمدے میں لوگوں کا ایک ریلا کسی نئی فلائٹ سے داخل ہوا اور Escalator پر سوار ہوگا۔ میں کافی دیر سے پریشان چلا آ رہا تھا۔ مجھے ارجمند اور بلال کہیں نظر نہ آئے۔ پھر مجھے ایک سردار جی نظر آ گئے۔ میں ان کے قریب گیا جیسے پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔ وہ ایک لفافے سے چپس کھا رہے تھے۔

سردار جی میں کچھ گڑبڑا گیا ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی۔ باہر جانے کا راستہ کون سا ہے؟

انہوں نے مسکرا کر میری جانب دیکھا
پہلی بار امریکہ آئے ہیں ویرجی؟

جی سر.....

”بس یہ ملک ہی ایسا ہے۔ یہاں آ کر آدمی گڑبڑا تا ضرورت ہے..... وہ سامنے گیٹ نمبر انیس سے چلی جائیں، لفٹ لگی ہے..... نیچے جا کر کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ سامنے سڑک نظر آتی ہے نہ سمجھ آئے تو ضرور کسی سے پوچھ لیں۔ یہ امریکی لوگ بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔“

”میری بیٹی اور داماد کو مجھے لینے آنا تھا۔ وہ تو کہیں نظر نہیں آئے..... میرا تو رونے کو جی چاہتا ہے۔“

سردار جی ذرا سا مسکرائے اور بولے ”واہگرو کی سونہہ..... امریکہ میں جب بھی کوئی آتا ہے تو اس کا رونے کو جی چاہتا ہے۔ ستی ویہاں سو۔ اس ملک سے جب کوئی جاتا ہے تو بھی وہ روتا ضرورت ہے۔ پتہ نہیں کیا بھید ہے۔ آنے پر بھی رونا جانے پر بھی رونا.....“

میرا سامان جاچکا تھا۔ صرف ایک ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکا تھا۔ بلال اور راجمند ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اللہ حافظ کہہ رہے تھے..... قیصر اور جمشید کے اب صرف چھوٹے چھوٹے ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ پاکستان والے گیٹ وے میں داخل ہو کر ٹنل نمارا ستے پر چلنے لگا۔

نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ سردار جی ٹھیک کہتے تھے۔ اس دیس میں آمد پر بھی مسافر روتا ہے اور رخصت کے وقت بھی اس کی آنکھیں نم رہتی ہیں۔

اقبال کے ساتھ کسی قسم کا مرئی رشتہ نہ تھا، لیکن اس کی بات مان لینے کے بعد یہاں وہاں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ میں کسی کو کیا بتاتا کہ بابا آدم جب اماں حوا کی بات مان چکے تو ان کے پاس جلا وطنی کے علاوہ کوئی چوائس نہ تھی!

☆☆☆☆

The End ----- ختم شد -----